NCPCR@gov.in پر POCSO e-box دستیاب ہے۔

کیوآر کوڈ سے متعلق ای-وسائل حاصل کرنے کے لیے ہدایت نامہ

ہر ایک باب کے اوپر کونے میں موجود کوڈ باکس کو Quick Response Code (QR Code) کہتے ہیں۔ یہ آپ کو باب میں دیے گئے موضوعات سے متعلق ای-وسائل مثلاً آڈیو، ویڈیو، ملٹی میڈیا، نصابی مواد وغیرہ حاصل کرنے میں مدد کرے گا۔ پہلا کیوآر کوڈ مکمل ای ۔کتاب حاصل کرنے کے لیے ہے۔ بعد کے کیوآر کوڈ ہر ایک باب سے متعلق ای-وسائل حاصل کرنے میں مدد کریں گے۔ یہ آپ کے پُر لطف طریقے سے آموزش میں مدد کریں گے۔

اپنے موبائل فون یا ٹیبلیٹ کے ذریعے مندرجہ ذیل مراحل پر عمل کریں اور ای-وسائل حاصل کریں۔
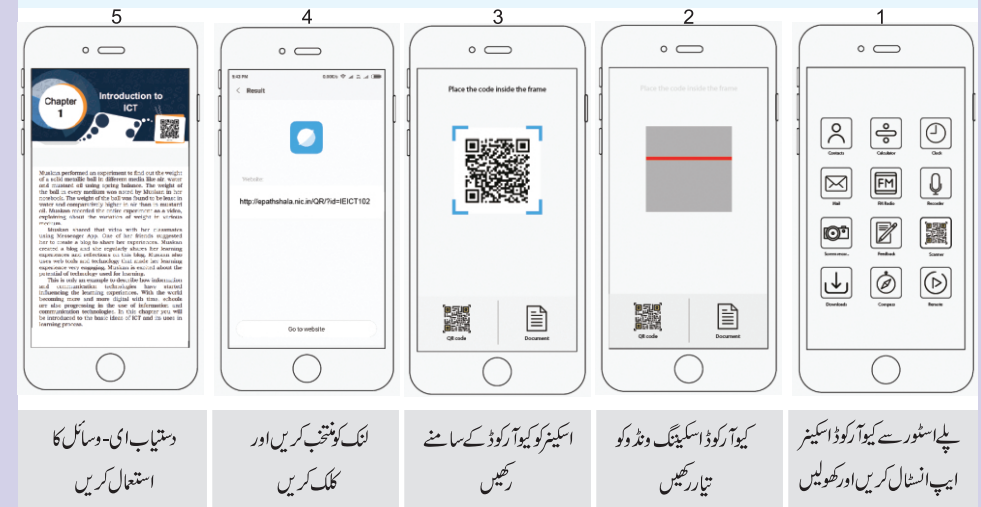
5	4	3	2	1
دستیاب ای-وسائل کا استعمال کریں	لنک کو منتخب کریں اور کلک کریں	اسکینر کو کیوآر کوڈ کے سامنے رکھیں	کیوآر کوڈ اسکیننگ ونڈو کو تیار رکھیں	پلے اسٹور سے کیوآر کوڈ اسکینر ایپ انسٹال کریں اور کھولیں

کسی کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ پر ای-وسائل حاصل کرنے کے لیے نیچے دیے گئے اقدامات پر عمل کریں:

1. فائرفوکس ( ) اور کروم ( ) وغیرہ ویب براؤزر کھولیں۔
2. ای۔پاٹھ شالا ویب سائٹ http//:epathshala.nic.in پر جائیں۔
3. 'ایکسیس (Access) ای-وسائل' والے باکس پر کلک کریں۔
4. ہر ایک کیوآر کوڈ (1055CH01) کے نیچے دیے گئے ابجد ہندسی (Alphanumeric) کوڈ کو ٹائپ کریں۔
5. اب جو لنک نمودار ہوئے ہیں، ان کے استعمال سے ای-وسائل تلاش کریں۔

تاریخِ ہند کے موضوعات

حصّہ III

بارھویں جماعت کے لیے تاریخ کی درسی کتاب

تاریخِ ہند کے موضوعات

حصّہ III

جامعہ ملیہ اسلامیہ

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

Tareekh-e-Hind Ke Mauzuat-III
(Themes in Indian History Part-III)
Textbook for Class-XII

ISBN 81-7450-794-9

پہلا اردو ایڈیشن

مئی 2008 جیشٹھ 1930

دیگر طباعت

فروری 2015 ماگھ 1936
جون 2017 اساڑھ 1939
اپریل 2019 ویشاکھ 1941

PD 5H AUS

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
شری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 فون 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بینگلورو - 560085 فون 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 فون 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکاتا - 700114 فون 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 فون 0361-2674869

قیمت: ₹ 000.00

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن	:	محمد سراج انور
چیف ایڈیٹر	:	شویتا اُپّل
چیف بزنس منیجر	:	ابیناس کُلّو
چیف پروڈکشن آفیسر	:	ارون چتکارا
ایڈیٹر	:	سید پرویز احمد
پروڈکشن آفیسر	:	عبد النعیم

سرورق اور آرٹ — تصاویر
آرٹ کری ایشن، نئی دہلی — کے۔ ورگیز

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

ہرش کمار، سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے

میں چھپوا کر

پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

پیش لفظ

’قومی درسیات کا خاکہ--2005‘ میں سفارش کی گئی ہے کہ بچوں کی اسکول کی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور ’تعلیم کے طفل مرکوز نظام‘ کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہو کر، نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا پابند نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچیلا پن اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلنڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی تاکہ مطلوبہ ایام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور اندازۂ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیل نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور محسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروپوں میں بحث و مباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ’’کمیٹی برائے درسی کتاب‘‘ کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل سماجی علوم کے مشاورتی گروپ کے چیئر پرسن پروفیسر ہری واسودیون اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر نیلادری بھٹا چاریہ، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل یونیورسٹی، نئی دہلی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سب ہی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا

کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے شعبہ برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ ہم اس نصابی کتاب کے اردو ترجمے کی ذمے داری بخوبی انجام دینے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شکرگزار ہیں، خاص طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن اور محترمہ رخشندہ جلیل کے ممنون اور شکرگزار ہیں جنھوں نے مرکز برائے جواہر لعل نہرو اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آؤٹ ریچ پروگرام کے ذریعے اس عمل میں رابطہ کار کے فرائض بخوبی انجام دیے۔ کونسل اس کتاب کے اردو ترجمے کے لیے محترم محمد تعظیم کی شکرگزار ہے۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور و فکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی
20 نومبر 2006

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

مطالعے کی وضاحت

اس کتاب کے مطالعہ کے مرکزی نقطہ کو کون سی چیز معین کرتی ہے؟ اس کتاب سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ جو کچھ اس سے پہلے کی جماعتوں میں پڑھا گیا اس سے یہ کس طرح مختلف ہے؟

ہم نے چھٹی کلاس سے آٹھویں کلاس تک ہندوستان کی تاریخ کے متعلق ابتدائی عہد سے جدید دور تک، ہر سال ایک مخصوص عہد کی تاریخ وار واقعات پر مرکوز جانکاری حاصل کی ہے۔ پھر نویں اور دسویں جماعت کے لیے کتابوں میں تحقیقات کی ساخت میں تبدیلی آ گئی۔ یہاں ہم نے وقت کے ایک مختصر دور پر مرکوز خاص طور پر ہم عصر دنیا کا عمیق مطالعہ کیا۔ علاقائی سرحدوں کو پھلانگتے ہوئے، قومی ریاستوں کی حدود سے پرے ہم نے یہ دیکھا کہ مختلف علاقوں کے مختلف لوگوں نے جدید دنیا بنانے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ وسیع طور پر باہم مربوط تاریخ کا حصہ بن گئی۔ اس کے بعد ہم نے گیارھویں جماعت میں تاریخ عالم کے موضوعات کا مطالعہ کیا۔ اس دوران ہم نے زمین پر انسانی زندگی کی ابتدا سے لے کر آج تک، برسوں کے طویل عرصہ پر مرکوز تاریخ اور ترتیب سے اپنے مطالعہ کو وسعت دی۔ لیکن ہم نے سنجیدہ تحقیق و تفتیش کے لیے کچھ خاص موضوعات کے مجموعے کو منتخب کیا۔ اس سال ہم تاریخ ہند کے موضوعات کا مطالعہ کریں گے۔

یہ کتاب ہڑپا تہذیب کے مطالعہ سے شروع ہوتی ہے اور ہندوستانی آئین کی تشکیل پر ختم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ہزار سال کا صرف ایک عام جائزہ پیش نہیں کرتی، بلکہ اس میں کچھ منتخب موضوعات کا عمیق مطالعہ کیا گیا ہے۔ پچھلے سالوں کی کتابوں نے آپ کو پہلے ہی ہندوستان کی تاریخ سے آگاہ کرا دیا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم بعض موضوعات پر تفصیلی تحقیق و تفتیش کریں۔ یہاں ہم نے معاشی، سماجی، سیاسی اور مذہبی موضوعات کو منتخب کر کے مختلف ماحول میں ارتقا کے متعلق جاننے کی یقینی کوشش کی ہے یہاں تک کہ ان کے درمیان موجود سرحدوں کو بھی توڑنے کی کوشش کی ہے اس کتاب کے کئی موضوعات آپ کو اس دور کی سیاسی اور اقتدار کی نوعیت سے متعارف کرائیں گے، وہیں دیگر موضوعات سے اس بات کی تحقیق و تفتیش کی ہے کہ سماج کیسے منظّم ہوتے ہیں اور ان کے کام کرنے کا طریقہ کیا ہے اور یہ کیسے تبدیل ہوتا ہے۔ باقی دیگر موضوعات ہمیں مذہبی زندگی اور رسوم و رواج کے معمولات، معیشت کے کام کاج کے طریقے اور شہری و دیہی سماجوں کے اندر تبدیلی کے متعلق بتاتے ہیں۔

اس میں ہر موضوع آپ کو مورخین کی ہنرمندی کو بھی قریب سے دیکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ ماضی کو دوبارہ تلاش کرنے کے لیے مورخین ماخذات کو تلاش کرتے ہیں تاکہ ماضی کو قابل دسترس بنا سکیں۔ لیکن ماخذ، ماضی کو خود ظاہر نہیں کرتے بلکہ مورخین کو ماخذوں کے ساتھ دست بہ ست ہونا پڑتا ہے۔ ان کی تشریح و توضیح کرنی پڑتی ہے اور ان کو بولنے کے لیے مجبور کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تاریخ پر جوش مضمون بن جاتی ہے۔ ایک جیسے (پرانے) ماخذ بھی ہمیں نئی چیزوں کے متعلق بتا سکتے ہیں اگر ہم ان سے نئے سوال پوچھیں اور ان کے ساتھ نئے طریقے سے متوجہ

ہوں۔اس لیے ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مورخین کس طرح ماخذوں کو پڑھتے ہیں اوران پرانے ماخذوں سے نئی چیزیں وباتیں تلاش کرلیتے ہیں۔

لیکن مورخین صرف پرانے ماخذوں کی ہی ازسرنو تحقیقات نہیں کرتے۔وہ نئے ماخذ بھی کھوج نکالتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ ماخذ اتفاق سے بھی دریافت ہوسکتے ہیں۔ماہرین آثارِقدیمہ کوکئی مرتبہ غیرمتوقع طور پراپنے اطراف میں مہریں یا ٹیلے مل جاتے ہیں جوکسی پرانی تہذیب کے مقام کے وجود کا سراغ مہیا کرادیتے ہیں۔کسی ضلع کلکٹریٹ کے دھول کھائے دستاویزات کی تلاش کے ذریعہ مؤرخین کوانجانے میں ریکارڈ کے پلندے سے کسی مقامی جھگڑے کے مقدمے کے کاغذات مل جاتے ہیں اوران سے صدیوں پرانی دیہی دنیا کی نئی زندگی سامنے آجاتی ہے۔تاہم یہ تحقیقات محض اتفاقات ہی ہیں؟کسی محافظ خانہ(Archive) میں آپ کو یکبارگی پرانے دستاویزات کاایک پلندہ مل جائے،آپ اسے کھولتے اوردیکھتے ہیں لیکن آپ کوتحقیق وتفتیش میں آخذ کی اہمیت نظر نہیں آتی۔اس ماخذ کے کوئی معنی نہیں جب تک آپ کے ذہن میں مناسب سوالات نہ ہوں۔آپ کو ماخذ سے واقعات کوکھوج نکالنے ہوتے ہیں،متن کو پڑھنا ہوتا ہے،سراغ کا تعاقب کرنا ہوتا ہے اور باہم رشتے بنانے ہوتے ہیں،تب آپ ماضی کی ازسرنوتعمیر کرسکتے ہیں،کسی دستاویز کی مادی تلاش سے ہی صرف ماضی طشت ازبام نہیں ہوتا۔جب الیگزینڈر کننگھم نے پہلی دفعہ ہڑپا تہذیب کی مہر دیکھی تو وہ اس کا کوئی ادراک نہیں کرپایا۔کافی وقت بعد ہی ان مہروں کی اہمیت کاانکشاف ہوپایا۔

حقیقتاًجب مؤرخین نئے سوالات کاحل تلاش کرناشروع کرتے ہیں یانئے موضوعات کی تحقیق وتفتیش کرتے ہیں تب انھیں اکثر نئے قسم کے آخذات تلاش کرنے پڑتے ہیں۔اگرہم انقلابیوں اور باغیوں کے متعلق جاننے کے خواہش مند ہیں تو سرکاری آخذ صرف ایک جانبدارانہ تصویرہی پیش کرسکتے ہیں۔ایسی تصویر جوسرکاری الزام اورتعصب سے بنائی گئی ہوگی۔ہمیں باغیوں کی ڈائریوں،ان کے ذاتی خطوط،ان کی تحریریں اور بیانات جیسے دیگر آخذوں کودیکھنے کی ضرورت پڑے گی۔یہ سب ہمیشہ آسانی سے نہیں ملتے ہیں۔اگرہم ان لوگوں کے تجربات کو جنھوں نے تقسیم کے زخم کو برداشت کیا ہے،کوسمجھنا چاہتے ہیں توتحریری آخذوں کے بجائے زبانی آخذ زیادہ معلومات فراہم کرپائیں گے۔

جیسے جیسے تاریخ کی نظروسیع ہوتی ہے۔ویسے ویسے ماضی کے لیے مؤرخین نئے سراغوں کی تلاش میں نئے آخذوں کی تلاش شروع کردیتے ہیں اور جب ایسا ہوجاتا ہے تب آخذ کی تشکیل کیا ہو۔اس کا تصور بدل جائے گا۔ایک وقت تھاجب صرف تحریری دستاویزات کوہی قابل اعتبار تسلیم کیا جاتا تھا۔کیاتحریروں کی تصدیق،حوالہ اور مقابلہ وموازنہ کیاجاسکتا تھا۔زبانی شہادت کوکبھی بھی معقول وصحیح آخذ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔کون اس کی صداقت اور ثبوت پذیری کی ضمانت لیتا؟زبانی آخذوں کی بے یقینی کی یہ حالت ابھی تک مفقود نہیں ہوئی ہے۔لیکن زبانی شہادت کواختراعی طور پراستعمال کرکے ایسے کھلے تجربات کوظاہر کیا گیا ہے۔جن کوکسی دیگر دستاویز سے ظاہر نہیں کیاجاسکتا۔

مجوزہ سال کی اس کتاب کے ذریعہ آپ مؤرخین کی دنیا میں داخل ہوں گے۔ان کے ساتھ نئے سراغ

مجوزہ سال کی اس کتاب کے ذریعہ آپ مؤرخین کی دنیا میں داخل ہوں گے۔ان کے ساتھ نئے سراغ تلاش کریں گےاور دیکھیں گے کہ کس طرح ماضی کے ساتھ ان کے مکالمے ساتھ چلتے ہیں۔آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ وہ کس طرح دستاویزات سے معنی ومفاہیم نکالتے ہیں، کتبات کو پڑھتے ہیں، آثارقدیمہ کے مقامات کی کھدائی کرتے ہیں،مورتیوں اور ہڈیوں کے مفہوم پیدا کرتے ہیں، رزمیہ نظموں کی تشریح کرتے ہیں، استوپوں اورعمارات کودیکھتے ہیں،تصاویراورفوٹوگراف کی تحقیقات کرتے ہیں، پولیس کی رپورٹوں اور مال گذاری کے دستاویزات کی تعبیروتشریح کرتے ہیں اور ماضی کی آوازوں کو سنتے ہیں۔ ہرموضوع ایک خاص قسم کے مآخذ کی ندرت وخاصیت اور امکانات کی تحقیق وتفتیش کرے گا اوراس بات پر بحث کرے گا کہ ایک مآخذ کیا بتاسکتا ہےاور کیا نہیں۔

نیلادری بھٹاچاریہ
خصوصی صلاح کار

بھارت کا آئین

تمہید

ہَم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک مقتدر، سماج وادی، غیر مذہبی عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں۔

انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی

آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت

مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں

اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر 1949ء کو یہ آئین ذریعہ ہذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

1۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''مقتدر عوامی جمہوریہ'' کی جگہ (3-1-1977 سے)
2۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''قوم کے اتحاد'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

کمیٹی برائے درسی کتب

چیئر پرسن، مشاورتی کمیٹی

ہری واسودیون، پروفیسر، شعبۂ تاریخ کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا

خصوصی صلاح کار

نیلا دری بھٹا چاریہ، پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

صلاح کار

کُم کُم رائے، ایسو سی ایٹ، پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مونیکا جونیجا، وزیٹنگ پروفیسر، انسٹی ٹیوٹ فرجش آئٹ (Institute Furgeschichte)، ویانا، آسٹریا

اراکین

جیا مینن، ریڈر، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یوپی (موضوع 1)

کُم کُم رائے، پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی (موضوع 2)

کنال چکرورتی، پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی (موضوع 3)

اُوما چکرورتی، ریٹائرڈ پروفیسر، مرانڈا ہاؤس، دہلی یونیورسٹی، دہلی (موضوع 4)

میناکشی کھنّہ، ریڈر، اندر پرستھ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی (موضوع 6)

وجے راماسوامی، پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیوسٹی، نئی دہلی (موضوع 7)

رجت دتّا، پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی (موضوع 8)

نجف حیدر، ایسو سی ایٹ پروفیسر، سینٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی (موضوع 9)

نیلا دری بھٹا چاریہ (موضوع 10)

رُدرانگشو مکھرجی، ایگزیکیٹیو ایڈیٹر، دی ٹیلیگراف، کولکاتا (موضوع 11)

پارتھو دتا، ریڈر، شعبۂ تاریخ، ذاکر حسین کالج (ایوننگ کلاسیز)، دہلی یونیورسٹی، دہلی (موضوع 12)

رام چندر گوہا، آزاد ادیب، ماہر علم البشر و تاریخ داں، بنگلور (موضوع 13)

انل سیٹھی (موضوع 14)

سُمیت سرکار، ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ تاریخ، دہلی یونیوسٹی، دہلی (موضوع 15)

مظفر عالم، پروفیسر، ساؤتھ ایشین ہسٹری، شکاگو یونیورسٹی، شکاگو، (یو۔ ایس۔ اے)

سی۔این۔سُبرامنّیم، ایکلَویّہ، کوٹھی بازار، ہوشنگ آباد
رشمی پالیوال، ایکلویّہ، کوٹھی بازار، ہوشنگ آباد
پربھا سنگھ، پی جی ٹی (تاریخ)، کیندریہ ودیالیہ، اولڈ کینٹ، تیلیر گنج، الہ آباد، یوپی
سمیتا سہائے بھٹاچاریہ، پی جی ٹی (تاریخ)، بلیو بیلس اسکول، کیلاش کالونی، نئی دہلی
بیپا سوبتی، پی جی ٹی (تاریخ) ماڈرن اسکول، بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی
فرحت حسن، ریڈر، شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (موضوع 5)

ممبر کوارڈی نیٹرز

انل سیٹھی، پروفیسر، ڈی ای ایس ایس، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی
سیما شکلا اوجھا، لیکچرر، ڈی ای ایس ایس، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اظہارِ تشکر

'تاریخ ہند کے موضوعات، حصہ III' ماہرین تعلیم، اساتذہ کرام، مؤرخین، مدیران اور ڈیزائن کاروں کی کاوشات کا حاصل ہے۔ کتاب کے ہر باب کو کئی ماہ کے بحث ومباحثے کے بعد قطعی شکل دی گئی ہے۔ ہم ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس پورے عمل میں شرکت کی۔

کتاب کے مسودہ پر جامع اور قیمتی آرا کے لیے، ہم جوہن فرٹز، سنیل کمار اور سپر یہ ورما کے بے حد مشکور ہیں۔ بعض وضاحت طلب امور میں بروقت تعاون کے لیے، ہم بینا بھارگو، رنبیر چکرورتی، رنجیتا دتا، بھارتی جگناتھن اور نندیتا پرساد سہائے کے بھی شکر گزار ہیں۔ مانیٹرنگ کمیٹی کے ممبران پروفیسر جے۔ ایس۔ گریوال اور شوبھا باجپئی کی تجاویز ہمارے لیے کافی کارآمد ثابت ہوئیں۔

مختلف افراد اور اداروں نے کتاب کے لیے بصری مواد مہیا کرایا۔ ہم سب سے پہلے جارج مائیکل اور جوہن فرٹز کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنی کریم النفسی کی وجہ سے وجے نگر سے متعلق ماخذات کے اپنے وافر ذخیرے سے ہمیں استفادہ کرنے کی اجازت دی۔

کاپی ایڈیٹنگ اور مسودے کا پروف پڑھنے کے لیے ہم شیام وارنر کی کوششوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ آرٹ کری ایشن (Art Creations)، نئی دہلی کے ریتوٹوپا اور انیمیشن رائے بھی شکریے کے مستحق ہیں، جنھوں نے بڑے تحمل اور مہارت کے ساتھ کتاب کا ڈیزائن تیار کیا۔ ان کے علاوہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے کے۔ ورگیز نے ہمیں نقشہ جات مہیا کرائے۔ البینس ٹرکی اور منوج ہلدار نے تکنیکی تعاون پیش کیا۔ سمیرا ورما نے کئی طرح سے اپنا قیمتی تعاون دیا، اس پورے عمل کے دوران ان کی خوش مزاجی کئی معنوں میں ہماری مددگار بنی رہی۔

آخر میں اس کتاب کے استعمال کرنے والوں کی طرف سے ہم بازرسی کے منتظر رہیں گے جو بعد میں آنے والے ایڈیشن میں اصلاح کرنے میں ہماری مددگار ہوگی۔

اس کتاب کی تیاری کے لیے کونسل کاپی ایڈیٹر حسن البنّا، پروف ریڈر شبنم ناز، ڈی ٹی پی آپریٹرز شمائلہ فاطمہ، فلاح الدین فلاحی اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک کی تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

بھارت کا آئین

حصہ III (دفعہ 12 سے 35)
(بعض شرائط، چند مستثنات اور واجب پابندیوں کے ساتھ)

بنیادی حقوق

کے ذریعہ منظور شدہ

حق مساوات

- قانون کی نظر میں اور قوانین کا مساویانہ تحفظ
- مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر عوامی جگہوں پر مملکت کے زیرانتظام
- سرکاری ملازمت کے لیے مساوی موقع
- چھوت چھات اور خطابات کا خاتمہ

حق آزادی

- اظہار خیال، مجلس، انجمن، تحریک، بود و باش اور پیشے کا
- سزا کے جرم سے متعلق بعض تحفظات کا
- زندگی اور شخصی آزادی کے تحفظ کا
- 6 سے 14 سال کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا
- گرفتاری اور نظر بندی سے متعلق بعض معاملات کے خلاف تحفظ کا

استحصال کے خلاف حق

- انسانوں کی تجارت اور جبری خدمت کی ممانعت کے لیے
- بچوں کو خطرناک کام پر مامور کرنے کی ممانعت کے لیے

مذہب کی آزادی کا حق

- آزادیٔ ضمیر اور قبولِ مذہب اور اس کی پیروی اور تبلیغ
- مذہبی امور کے انتظام کی آزادی
- کسی خاص مذہب کے فروغ کے لیے ٹیکس ادا کرنے کی آزادی
- کلی طور سے مملکت کے زیرانتظام تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم یا مذہبی عبادت کی آزادی

ثقافتی اور تعلیمی حقوق

- اقلیتوں کی اپنی زبان، رسم خط یا ثقافت کے مفادات کا تحفظ
- اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کے قیام اور ان کے انتظام کا حق

قانونی چارہ جوئی کا حق

- سپریم کورٹ یا کورٹ کی جانب سے ہدایات، احکام یا رٹ کے اجرا کو تبدیل کرانے کا حق

فہرست

حصہ II : (صفحہ نمبر 115 تا 262)

موضوع پانچ
سیاحوں کی نظر سے
سماج کا تصور
(تقریباً دسویں صدی سے سترہویں صدی تک)

موضوع چھ
بھکتی۔صوفی روایات
مذہبی عقائد میں تبدیلی اور عقیدت مندانہ متون
(تقریباً آٹھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک)

موضوع سات
ایک شاہی راجدھانی: وجے نگر
(تقریباً چودھویں صدی سے سولھویں صدی تک)

موضوع آٹھ
کاشت کار، زمیندار اور ریاست
زرعی سماج اور مغلیہ حکومت
(تقریباً سولھویں تا سترھویں صدی)

موضوع نو
بادشاہ اور وقائع نگاری
مغل دربار
(تقریباً سولھویں تا سترھویں صدی)

حصہ I : (صفحہ نمبر 1 تا 114)

موضوع ایک
اینٹیں، منکے اور ہڈیاں
ہڑپا کی تہذیب

موضوع دو
بادشاہ، کسان اور شہر
ابتدائی ریاستیں اور معیشتیں
(تقریباً 600 ماقبل مسیحی دور — 600 مسیحی دور)

موضوع تین
قرابت، ذاتیں اور طبقے
(تقریباً 600 ماقبل مسیحی دور — 600 مسیحی دور)

موضوع چار
مفکر، عقائد اور عمارتیں
(تقریباً 600 ماقبل مسیحی دور — 600 مسیحی دور)

اس کتاب کو کس طرح استعمال کیا جائے

یہ کتاب تاریخ ہند کے موضوعات کا حصہ II ہے، حصہ III اس کتاب کے بعد آئے گا۔

☑ آموزش میں آسانی بہم پہنچانے کے لیے ہر باب کو متعدد حصوں اور ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

☑ آپ دیگر مواد بھی خانوں میں محور پائیں گے

یہ مشتمل ہے :

مختصر معنیٰ

اضافی معلومات

زائد تفصیلی تصریحات

اس کا مقصد آموزش کے عمل کو مدد دینا اور معلومات میں اضافہ کرنا ہے
لیکن یہ تشخیص کے ارادہ سے نہیں ہے۔

☑ ہر باب کا خاتمہ ٹائم لائن کے ایک مجموعہ سے ہوتا ہے۔ اس کو معلومات کے تناظر میں داخل کتاب کیا گیا ہے اور جو تشخیص کے لیے نہیں ہے۔

☑ ہر باب میں بہت سی **تصاویر، نقشے اور ماخذات** دیے گئے ہیں۔

(a) یہ تصاویر فنی تخلیقات جیسے اداروں، برتنوں، مہروں، سکوں، زیورات وغیرہ کے ساتھ ساتھ کتبات، مجسمے، پینٹنگ، عمارات، آثارِ قدیمہ کے مقامات، نقشے، لوگوں کے فوٹو گراف اور مقامات کی تصویروں وشبہیوں یعنی بصری مواد پر مشتمل ہے۔ جن کا استعمال مؤرخین آماخذوں کے طور پر کرتے ہیں۔

(b) کچھ ابواب میں **نقشے** دیے گئے ہیں۔

آماخذ

(c) آماخذوں کو الگ خانوں میں محصور کیا گیا ہے۔ یہ وسیع اقسام کے متون اور کتاب کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔ بصری اور کتابی آماخذات دونوں، ان سراغوں کو محسوس کرتے میں آپ کی مدد کریں گے جن کو مورخین استعمال کرتے ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ مورخین ان سراغوں کا کس طرح تجزیہ کرتے ہیں۔ **آخری امتحان مساوی رمماثل مواد کے اقتباسات یا تصاویر پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ اس طرح آپ کو، اس طرح کے مواد کو استعمال کرنے کا موقع دستیاب ہوگا۔**

☑ متن کے اندر دوز مروں میں سوالات دیے گئے ہیں :

(a) پیلے رنگ کے خانوں میں وہ سوالات دیے گئے ہیں جن کا استعمال تشخیص کی مشق کے لیے کیا جا سکتا ہے۔

(b) ➲ بحث کیجیے... عنوان کے تحت وہ سوالات شامل کیے گئے ہیں جو **تشخیص کے لیے نہیں ہیں۔**

☑ ہر باب کے آخر میں **چار** قسم کی تفویض دی گئی ہیں۔

مختصر سوالات — مختصر مضمون

نقشے کا کام — پروجیکٹ

یہ آخری تشخیص اور تعین قدر کے مشق کی تیاری کے مقصد سے دی گئی ہیں۔

امید ہے آپ اس کتاب کے استعمال سے لطف اندوز ہوں گے۔

5282CH10

نوآبادیت اور دیہات

سرکاری دستاویزات کی تحقیق اور تفتیش

موضوع

دس
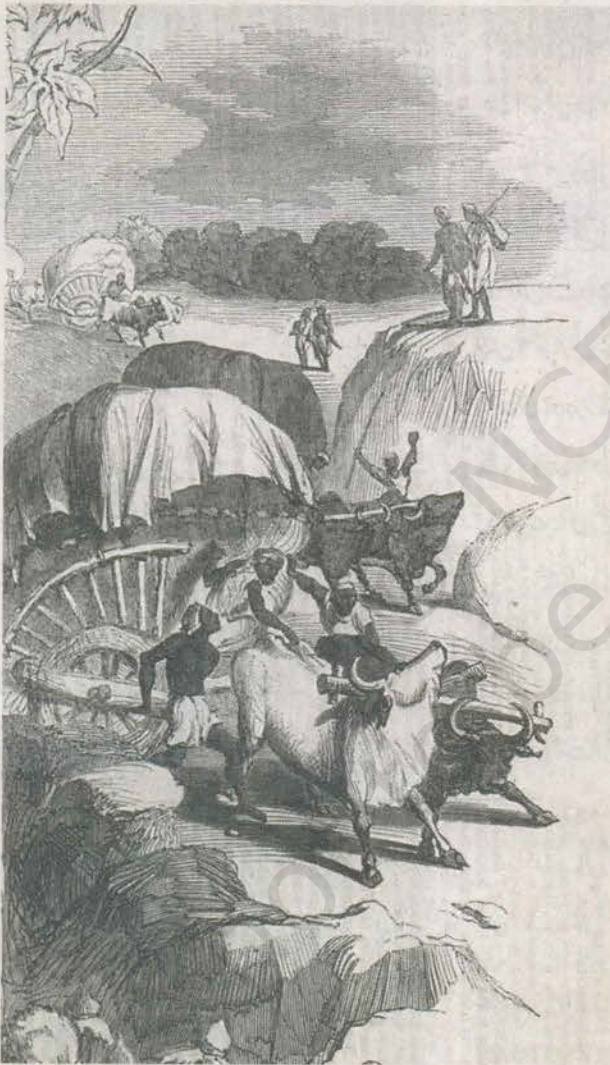
شکل 10.1

گاؤں سے منڈی کی طرف لے جائی جاتی کپاس

السٹریٹڈ لندن نیوز میں شائع تصویر، 20 اپریل 1861

اس باب میں آپ دیکھیں گے کہ نوآبادیاتی حکومت کے معنی ان لوگوں کے لیے کیا تھے جو دیہات میں رہتے تھے۔ اس باب میں آپ بنگال کے زمین داروں سے ملیں گے، راج محل کی پہاڑیوں کا سفر کریں گے جہاں پہاڑی اور سنتھال لوگ رہتے تھے اور پھر مغرب سے دکن کی طرف بڑھیں گے۔ آپ یہ دیکھیں گے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیہات میں اپنی حکومت کس طرح قائم کی، اپنی محصول پالیسیوں کو کیسے نافذ کیا، مختلف شعبہ ہائے زندگی کے افراد کے لیے ان پالیسیوں کے معنی کیا تھے اور انھوں نے معمولات زندگی کو کیسے تبدیل کر دیا تھا۔

ریاست کے ذریعہ متعارف کیے گئے قوانین عوام کے لیے کیا نتائج رکھتے ہیں: یہ کچھ حد تک متعین کرتے ہیں کہ کون لوگ دولت مند بنتے ہیں اور کون لوگ غریب ہو جاتے ہیں، کون نئی زمین حاصل کرتا ہے اور کون اپنی زمین کھو بیٹھتا ہے جس پر وہ رہتا تھا، جب کسانوں کو رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ کہاں جاتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اگرچہ لوگ قوانین کے مطابق کام کرتے ہیں تاہم یہ ایسے قوانین کی مزاحمت بھی کرتے ہیں جسے وہ ناانصافی پر محمول سمجھتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے لوگ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ قوانین کس طریقے پر نافذ کیے جانے چاہئیں۔ اس سے ان کے نتائج میں ترمیم ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی آپ ان ماخذوں کے متعلق بھی واقفیت حاصل کریں گے جو ہمیں ان تواریخ کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اور ان کی تعبیر و تشریح سے متعلق درپیش مشکلات سے بھی واقف ہو جائیں گے۔

آپ محصول ریکارڈوں، جائزوں (سروے)، وسائل اور جائزہ کاروں اور سیاحوں کے ذریعہ دیے گئے بیانات اور تحقیقاتی کمیشنوں کے ذریعہ پیش کردہ رپورٹوں سے بھی واقفیت حاصل کریں گے۔

1. بنگال اور زمین دار (BENGAL AND THE ZAMINDARS)

'راجہ' (لغوی معنی بادشاہ) کی اصطلاح کا استعمال عموماً طاقتور زمین داروں کے لیے کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، نوآبادیاتی حکومت سب سے پہلے بنگال میں قائم ہوئی تھی۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں سب سے پہلے دیہی سماج کو ازسرنو منظم کرنے اور زمین کے حقوق کے نئے نظام نیز نئے مال گزاری نظام کو قائم کرنے کی ابتدائی کوشش کی گئی۔ آیئے دیکھیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں بنگال میں کیا ہوا۔

1.1 بردوان میں ایک نیلامی (An auction in Burdwan)

1797 میں بردوان (موجودہ بردھمان) میں ایک نیلامی کی گئی۔ یہ ایک بڑا عوامی واقعہ تھا۔ بردوان کے راجہ کے قبضہ اختیار کے متعدد بحال (جائیداد / املاک) فروخت کیے گئے۔ 1793 میں استمراری بندوبست عمل میں لایا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مال گزاری کی ایک معین رقم طے کردی جو ہر زمین دار کو ادا کرنی ہوتی تھی۔ جو ریاستیں اپنی معین رقم ادا نہیں کرپاتی تھیں ان سے مال گزاری وصول کرنے کے لیے املاک نیلام کردی جاتی تھیں۔ بردوان کے راجہ پر بھی مال گزاری کی ایک بڑی رقم بقایا تھی۔

نیلامی کی بولی لگانے والے کو املاک فروخت کردی گئیں۔ لیکن کلکٹر نے فوراً ہی اس کہانی میں ایک انوکھا پہلو تلاش کرلیا۔ اسے نظر آیا کہ ان میں سے زیادہ تر خریدار راجہ کے اپنے ہی نوکر یا ایجنٹ تھے اور انھوں نے راجہ کی طرف سے ہی زمینوں کو خریدا تھا۔ نیلامی میں 95 فی صد سے زیادہ فروخت فرضی تھی۔ حالانکہ راجہ کی املاک عوامی طور پر فروخت کردی تھیں لیکن ان کی زمینوں کا کنٹرول اسی کے ہاتھ میں رہا۔

راجہ مال گزاری کی ادائیگی میں کیوں ناکام رہا؟ نیلامی میں خریدار کون لوگ تھے؟ یہ کہانی اس زمانے میں مشرقی ہندوستان کے دیہی علاقوں کی کارگزاریوں کے متعلق ہمیں کیا بتاتی ہے؟

1.2 ادا نہ کی گئی مال گزاری کا مسئلہ (The problem of unpaid revenue)

بردوان راج کی املاک ہی صرف ایسی املاک نہیں تھیں جو اٹھارھویں صدی کے آخری سالوں میں فروخت کی گئیں۔ استمراری بندوبست کے نفاذ کے بعد 75 فی صد سے بھی زیادہ زمینداریاں تبدیل کردی گئیں۔

شکل 10.2
ڈائمنڈ ھاربر روڈ، کلکتہ میں واقع بردوان کے راجہ کا محل۔
انیسویں صدی کے آخر تک بنگال کے بہت سے مالدار زمین داروں نے اپنے لیے اس طرح کے کورنتھین ستونوں کے ذریعہ سہارا دیے گئے داخلی پیش دہلیز (برساتی) والے، جس میں بال روم، وسیع میدان ہوتے تھے، شہری محل بنوائے تھے۔

شکل 10.3

چارلس کارنوالس (1805–1738) کی 1785 میں تھامس گینزبرگ کے ذریعہ بنائی گئی تصویر۔ امریکہ کی جنگ آزادی کے زمانے میں کارنوالس برطانوی فوج کا کمانڈر تھا اور 1793 میں جب بنگال میں استمراری بندوبست رائج کیا گیا اس وقت کارنوالس بنگال کا گورنر جنرل تھا۔

برطانوی افسران یہ امید کرتے تھے کہ استمراری بندوبست کے متعارف کیے جانے کے بعد سے وہ تمام مسائل حل ہوجائیں گے جو بنگال کی فتح کے بعد سے درپیش تھے۔ 1770 کی دہائی تک آتے آتے بنگال کی دیہی معیشت بحران کا شکار ہوچکی تھی، متواتر قحط پڑ رہے تھے اور زرعی پیداوار کم ہوتی جارہی تھی۔ افسران سوچتے تھے کہ زراعت، تجارت اور ریاست کے مال گزاری وسائل تبھی ارتقاپذیر کیے جاسکیں گے جب زراعت میں سرمایہ کاری کو فروغ دیا جائے گا۔ ایسا اسی وقت ہوسکے گا جب ملکیت کے حقوق محفوظ کردیے جائیں اور مال گزاری کی مانگ کی شرح مستقل خطوط پر متعین کردی جائے۔ اگر ریاست کا مال گزاری مطالبہ مستقل بنیادوں پر متعین کردیا جائے تو کمپنی مال گذاری کی مستقل آمدنی کی امید کرسکے گی اور مہم جو بھی اپنی سرمایہ کاری سے ایک یقینی فائدہ کمانے کی امید کرسکیں گے کیونکہ ریاست اپنے دعوے میں اضافہ کرکے منافع کی رقم نہیں چھین سکے گی۔ اس عمل سے افسران کو یہ امید تھی کہ چھوٹے کسانوں (yeomen) اور مال دار زمین مالکان کا ایک ایسا طبقہ ظہور میں آجائے گا جس کے پاس زراعت میں اصلاح کرنے کے لیے سرمایہ اور مہم (کارِ عظیم) دونوں ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی حکومت سے تربیت لے کر یہ طبقہ کمپنی کے تئیں وفادار رہے گا۔

تاہم مسئلہ یہ شناخت کرنے کا تھا کہ وہ کون سے افراد ہیں جو زراعت میں اصلاح کرنے کے ساتھ ریاست کو طے شدہ مال گزاری ادا کرنے کا ٹھیکہ لے سکیں گے۔ کمپنی کے افسران کے درمیان طویل مباحثے کے بعد بنگال کے راجاؤں اور تعلقہ داروں کے ساتھ استمراری بندوبست وجود میں آیا۔ ان کی بطور زمین دار درجہ بندی کردی گئی۔ ان کو ایک متعین مال گزاری مطالبہ دائمی طور پر ادا کرنا تھا۔ ان شرائط کے مطابق زمین دار گاؤں میں زمین مالک نہیں بلکہ وہ ریاست کی مال گزاری جمع کرنے والا تھا۔

زمین داروں کے تحت بہت سے گاؤں (کبھی کبھی 400 تک) ہوتے تھے۔ کمپنی کے تخمینے کے مطابق ایک زمین داری کے اندر آنے والے گاؤں مل کر ایک مال گزاری جائداد یعنی علاقہ تشکیل دیتے تھے۔ کمپنی پوری جائداد یا علاقے پر کل مطالبہ طے کرتی تھی جس کی مال گزاری ادا کرنے کا اقرار زمین دار کرتا تھا۔ زمین دار مختلف گاؤں سے کرایہ (مال گزاری) جمع کرتا تھا اور کمپنی کو مال گزاری ادا کرتا تھا نیز معین رقم کا فرق اپنے پاس بطور اپنی آمدنی رکھتا تھا۔ اس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ کمپنی کو مستقل طور پر مال گزاری رقم ادا کرے گا اور اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام ہوگا تو اس کی جائداد نیلام کی جاسکتی ہے۔

1.3 زمین دار کیوں رقم ادا کرنے کی پابندی نہیں کرتے تھے
(Why zamindars defaulted on payments)

تعلقہ دار کے لغوی معنی ہیں "ایسا شخص جس کے ساتھ تعلق یا رشتہ قائم ہو۔ بعد ازاں یہ لفظ تعلق ایک علاقائی اکائی کو مختص کرنے کے لیے مستعمل ہوا۔

کمپنی کے افسران سوچتے تھے کہ مال گزاری مطالبہ متعین کیے جانے سے زمین داروں میں تحفظ کا احساس پیدا ہوگا اور وہ اپنی سرمایہ کاری کے حوالے سے منافع پر یقین کے ساتھ اپنی جائدادوں میں اصلاح کرنے کے لیے حوصلہ افزا ہوں گے تاہم استمراری بندوبست کے بعد کی ابتدائی دہائیوں میں زمین دار مستقل طور پر اپنا مال گزاری مطالبہ ادا کرنے میں ناکام رہے۔ نتیجتاً بقایاجات کی رقم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اس ناکامی کے بہت سے اسباب تھے۔ اول: ابتدائی مطالبہ بہت زیادہ تھا۔ یہ اس وجہ سے محسوس کیا گیا کہ اگر مطالبہ کو آئندہ اوقات کے لیے متعین کیا جارہا ہے تو قیمتوں میں اضافہ اور زراعت میں توسیع ہونے سے آمدنی میں بڑھنے پر کمپنی اس اضافہ میں اپنے حصے کا دعویٰ کبھی نہیں کرسکے گی۔ اس متوقع نقصان کو کم سے کم بنائے رکھنے کے لیے کمپنی نے مال گزاری مطالبہ کو اعلیٰ سطح پر بنائے رکھا اور دلیل یہ دی کہ بتدریج زراعتی پیداوار میں توسیع ہوگی اور قیمتوں میں اضافہ ہوگا ویسے ویسے زمین داروں پر بوجھ کم ہوتا جائے گا۔

"رعیت" اصطلاح کا استعمال برطانوی دستاویزات میں کسانوں (باب 8) کے لیے کیا جاتا تھا۔ بنگال میں رعیت ہمیشہ زمین کو راست طور پر کاشت نہیں کرتی تھی بلکہ ماتحت (شکمی رعیت) کو آگے پٹہ پر دے دیا کرتی تھی۔

دوم: یہ اعلیٰ مطالبہ 1790 کی دہائی میں نافذ کیا گیا جس وقت زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں کمی ہوئی تھی اور رعیت کے لیے زمین داروں کے بقایاجات کی ادائیگی کرنا مشکل تھا۔ اگر زمین دار محصول خود جمع نہیں کرسکتا تو وہ کیسے کمپنی کو رقم ادا کرسکتا تھا؟ سوم: مال گزاری غیر متغیر تھی۔ فصل اچھی ہو یا خراب، مال گزاری وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنی ضروری تھی۔ حقیقتاً غروب آفتاب قانون کے مطابق اگر معین تاریخ کو سورج غروب ہونے تک رقم نہیں آتی تھی تو زمین داری کو نیلام کیا جاسکتا تھا۔ چہارم: استمراری بندوبست نے بنیادی طور پر زمین داروں کی طاقت کو رعیت سے محصول جمع کرنے اور اپنی زمین داری کا انتظام کرنے تک ہی محدود کردیا تھا۔

کمپنی زمین داروں کو بحیثیت اہم تو تسلیم کرتی تھی لیکن وہ ان پر کنٹرول، ان کے اقتدار واختیار کو مطیع کرنا اور ان کی خود مختاری کو بھی محدود کرنا چاہتی تھی۔ زمین داروں کی فوجی نفری کو سبکدوش کردیا گیا، سرحدی ٹیکس ختم کردیا گیا اور ان کی کچہریوں (عدالتوں) کو کمپنی کے ذریعہ تقرر یافتہ کلکٹر کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ زمین داروں نے اپنی انصاف کرنے اور مقامی پولیس کا نظم کرنے کی طاقت بھی کھودی۔ وقت گزرنے کے ساتھ کلکٹریٹ اقتدار کے ایک متبادل کے طور پر اور بہت سے کام جو زمین دار کرسکتے تھے ان پر بندشیں عائد کردی گئیں۔ ایک معاملے میں تو یہ ہوا

کہ جب راجہ مال گزاری کی ادائیگی کرنے میں ناکام رہا تو کمپنی کے ایک افسر کو تیزی سے اس واضح ہدایت کے ساتھ اس کی زمین داری میں بھیج دیا گیا کہ ''ضلع کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لو اور راجہ نیز اس کے افسران کے مکمل اثر و رسوخ اور اختیارات کو ختم کرنے کے لیے انتہائی موثر ذرائع کا استعمال کرو۔''

محصول جمع کرنے کے وقت زمین دار کا ایک کارندہ (افسر) جس کو عام طور پر ''عملہ'' کہتے تھے، گاؤں میں آتا تھا، لیکن محصول کا جمع کرنا ایک دوامی مشکل تھی۔ کبھی کبھی تو خراب فصل اور کم تر قیمتوں کے سبب رعیت کے لیے بقایاجات کی ادائیگی کرنا ایک مشکل امر ہو جاتا تھا اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ رعیت دانستہ طور پر رقم ادائیگی میں دیر کرتی تھی۔ مال دار رعیت اور گاؤں کے مکھیا— 'جوت دار' اور 'منڈل'— زمین دار' کو پریشانی میں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ چونکہ زمین دار آسانی سے ان پر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ وہ قصورواروں یعنی بقایاداروں پر مقدمہ تو چلاسکتا تھا لیکن عدالتی عمل طویل ہوتا تھا۔ اکیلے بردوان ضلع میں ہی 1798 میں محصول کے بقایاجات کی رقم کی ادائیگی کے 30,000 سے زائد مقدمات زیرغور تھے۔

1.4 جوت داروں کا عروج (The rise of the jotedars)

اگر چہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں بہت سے زمین دار بحران کا سامنا کر رہے تھے تو دوسری طرف مال دار کسانوں کا ایک گروہ گاؤں میں اپنی حالت مستحکم کرتا جا رہا تھا۔ فرانسس بکانن کے شمالی بنگال کے دیناج پور ضلع کے جائزے میں ہمیں مالدار کسانوں کے اس طبقے کا ذکر ملتا ہے جو 'جوت دار' کے نام سے معروف تھے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک جوت داروں نے زمین کے وسیع رقبے جو کئی ہزار ایکڑ پر محیط تھا، حاصل کرلیا تھا۔ مقامی تجارت اور مہاجنوں کے کاروبار پر بھی ان کا کنٹرول تھا، اس طرح یہ اس علاقے کے غریب کاشت کاروں پر بے انتہا طاقت کی مشق کرتے تھے۔ ان کی زمین کا کافی بڑا حصہ بٹائی داروں کے ذریعہ کاشت کیا جاتا تھا جو خود اپنے ہل لاتے تھے، کھیت میں محنت کرتے اور فصل کے بعد پیداوار کا نصف حصہ جوت داروں کو دے دیتے تھے۔

گاؤں کے اندر جوت داروں کی طاقت، زمین داروں کے مقابل زیادہ مؤثر ہوتی تھی۔ زمین داروں کے برخلاف جو عموماً شہری علاقوں میں رہتے تھے، جوت دار گاؤں میں ہی رہتے تھے اور غریب گاؤں والوں کے کافی بڑے حصے پر راست طور پر اپنے کنٹرول کا استعمال کرتے تھے۔ زمین داروں کے ذریعہ جمع (مال گزاری) میں اضافہ کرنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کی وہ زبردست مزاحمت کرتے تھے، زمین داری افسران کو اپنی ذمہ داری نبھانے سے روکتے

شکل 10.4

بنگال کے گائوں کا منظر، جارج ہنری کے ذریعہ بنائی کی گئی تصویر، 1820

ہنری ہندوستان میں 23 سال (25-1802) تک قیام پذیر رہا۔ اس دوران اس نے عام آدمی کی روزمرہ کی زندگی اور زمینی مناظر کی تصویر کشی کی۔ نیچے کی تصویر میں دیہی بنگال کے ایک گھر کی تصویر بنائی گئی ہے۔ جوت دار اور مہاجن ایسے ہی گھروں میں رہتے تھے۔

تھے۔ رعیت کو خدمت کے لیے تیار کرتے تھے جو ان پر منحصر تھی اور زمین دار کو مال گزاری رقم کی ادائیگی میں دانستہ طور پر دیر کرا دیتے تھے۔ حقیقتاً جب مال گزاری رقم کی ادائیگی نہ ہونے پر زمین دار کی جائداد نیلام کی جاتی تو اکثر ان جوت داروں میں سے ہی کوئی اسے خرید لیتا تھا۔

شمالی بنگال کے جوت دار سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ اگرچہ مالدار کسان اور گاؤں کے کھیا بھی بنگال کے دیگر حصوں کے دیہی علاقوں میں بارعب شخصیت بن کر ابھر رہے تھے۔ کچھ علاقوں میں ان کو 'حولدار' (Haoladar) کہا جاتا تھا اور کچھ علاقوں میں یہ ''گانٹی دار'' یا ''منڈل'' کے نام سے معروف تھے۔ ان کے عروج سے زمین داری اقتدار کا کمزور ہونا ناگزیر تھا۔

شکل 10.5

دیہی بنگال میں طاقت و اقتدار

متن کو شکل 10.5 کے ساتھ غور سے پڑھیے اور تیر کے مقامات کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ کو مناسب مقام پر رکھیے: محصول، مال گزاری، سود، قرض، پیداوار

1.5 زمین داروں کی مزاحمت (The zamindars resist)

تاہم دیہی علاقوں میں زمین داروں کا اقتدار ختم نہیں ہوا تھا۔ مال گزاری کا اعلیٰ مطالبہ اور اپنی جائیداد کی امکانی نیلامی کی مشکل سے نبرد آزما ہونے کے لیے زمین داروں نے اس دباؤ سے ابھرنے کے راستے تلاش کر لیے تھے اور نئے تناظر میں نئی حکمت عملی تیار کر لی تھی۔

فرضی فروخت ایک ایسی ہی حکمت عملی تھی جس میں جوڑ توڑ کے بہت سے سلسلے شامل تھے۔ مثال کے طور پر بردوان کے راجہ نے پہلے تو اپنی زمین داری کا کچھ حصہ اپنی والدہ کو منتقل کر دیا کیونکہ کمپنی نے یہ فیصلہ لے رکھا تھا کہ خواتین کی جائداد کو نہیں چھینا جائے گا۔ پھر دوسرے قدم کے طور پر اس کے گماشتوں نے نیلامی کے عمل میں ساز باز کی۔ کمپنی کے مال گزاری کے مطالبے کو دانستہ طور پر کر روک لیا گیا اور ادا نہ کیے گئے بقایا جات کی رقم میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب جائیداد کا کچھ حصہ نیلام کیا گیا تو زمین دار کے آدمیوں نے ہی دیگر خریداروں کے مقابلے اونچی بولی لگا کر خرید لیا۔ بعد میں انھوں نے خرید کی رقم کو ادا کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا اس جائداد کو پھر سے فروخت کرنا پڑا۔ ایک بار پھر زمین داروں کے گماشتوں نے ہی اسے خرید لیا اور ایک بار خرید کی رقم ادا نہیں کی گئی لہٰذا ایک بار پھر جائداد کو نیلام کرنا پڑا۔ یہ عمل بار بار دہرایا جاتا رہا، آخر کار ریاست اور نیلامی کے وقت بولی لگانے والے تھک گئے۔ یوں اس جائداد کو کم قیمت پر زمین دار کو ہی واپس فروخت کرنا پڑا۔ زمین دار کبھی بھی مال گزاری مطالبہ کو ادا نہیں کرتا تھا لہٰذا کمپنی شاذ و نادر ہی اپنی جمع بقایا جات کی رقم وصول کر پاتی تھی۔

اس طرح کے انصراف بڑے پیمانے پر واقع ہوئے تھے۔ 1793 سے 1801 کے درمیان، بنگال کی چار بڑی زمین داریوں بشمول بردوان، بہت سی بے نامی خریداریاں کی گئیں جن سے مجموعی طور پر 30 لاکھ روپیے حاصل ہوئے۔ نیلامیوں کی کل فروخت میں سے 15 فی صد معاملات مصنوعی تھے۔

زمین دار دیگر طریقوں سے بھی اپنی بے دخلی سے بچنے کے لیے فریب دیتے تھے۔ جب کوئی باہری شخص نیلامی کے ذریعہ کوئی جائداد خرید لیتا تھا تب بھی ہر موقع پر اسے قبضہ نہیں ملتا تھا۔ ایسے موقعہ پر سابق زمین دار کے ''لٹھیال'' کارندے ان پر حملہ کر دیتے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی تو رعیت بھی باہری لوگوں کی مزاحمت کرتی تھی۔ یہ خود کو اپنے زمین دار (پرانے) سے وفاداری کے جذبے کے ساتھ بندھا ہوا محسوس کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہی اقتدار کی علامت ہے اور وہ خود اس کی عوام ہیں۔ زمین داری کی فروخت سے ان کی شناخت اور غرور درہم برہم ہوتے تھے اس وجہ سے زمین دار آسانی سے بے دخل نہیں کیے جاسکتے تھے۔

ماخذ 1

دیناج پور کے جوت دار (The jotedars of Dinajpur)

بکانن بیان کرتا ہے کہ شمالی بنگال کے دیناج پور ضلع کے جوت دار کس طرح زمین دار کے نظم و ضبط کی مزاحمت کرتے تھے اور اسکے اقتدار کی جڑیں کھودتے تھے:

زمین مالکان اس طبقے کے افراد کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا ہونا نہایت ضروری تھا اس لیے کہ اس کے بغیر ضرورت مند کاشت کاروں کو قرض کی رقم کون دیتا...

جوت دار جو زمین کے بڑے حصے کو کاشت کرتے ہیں، بہت ضدی ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ زمین داروں کے ان پر کوئی قدرت و طاقت نہیں ہے وہ تو ان کو مال گزاری کی شکل میں کچھ ہی رپے دیتے ہیں اور ہر قسط میں کچھ ہیں روپے دیتے ہیں اور ہر قسط میں کچھ نہ کچھ رقم بقایا رہ جاتی ہے۔ ان کے پاس پٹے کی حق دار سے زیادہ زمین ہے۔ زمین دار کے افسران اگر انھیں کچہری میں بلاتے ہیں اور انھیں ڈرانے دھمکانے کے لیے گھنٹے دو گھنٹے کچہری میں روک لیتے ہیں تو وہ فوراً ہی ان کی شکایت کرنے کے لیے فوج داری تھانہ (پولس اسٹیشن) یا منصف کی کچہری میں پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمین دار کے کارندوں نے ان کی بے عزتی کی ہے۔ اس طرح مال داری بقایا جات رقم کے بغیر تصفیہ معاملات مسلسل ہیں۔ یہ (جوت دار) چھوٹی رعیت کو ان کا مال گزاری ادا نہ کرنے کے لیے اکساتے رہتے ہیں......

بیان کیجیے کہ جوت دار زمین داروں کے اقتدار کی کس طرح مزاحمت کرتے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں قیمتوں میں سرد بازاری کی حالت ختم ہوگئی چنانچہ جو مین دار 1790 کی دہائی کی مشکلات میں اپنا وجود قائم رکھنے میں کامیاب رہے انھوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرلیا۔ مال گزاری کی ادائیگی کے ضوابط میں بھی کچھ لچیلا پن پیدا کیا گیا۔ نتیجتاً گاؤں پر زمین دار کا اقتدار اور مضبوط ہوتا گیا۔ 1930 کی دہائی کی عظیم سرد بازاری کے دوران یہ آخر کار درماندہ ہوگئے اور جوت داروں نے دیہات میں اپنی طاقت مستحکم کرلی۔

1.6 پانچویں رپورٹ (The Fifth Report)

ہم جن تبدیلیوں پر بحث کررہے ہیں ان میں سے بہت سی تبدیلیوں کا ایک مفصل رپورٹ میں تذکرہ کیا گیا ہے جو 1813 میں برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی۔ یہ اس سلسلے کی پانچویں رپورٹ تھی جو ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ اور سرگرمیوں کے ضمن میں تیار کی گئی تھی۔ اکثر ''پانچویں رپورٹ'' کے نام سے معروف یہ رپورٹ 1002 صفحات پر مشتمل تھی جس کے 800 سے زائد صفحات ضمیمہ تھے جس میں زمین داروں اور رعیت کی عرضیاں، مختلف اضلاع کے کلکٹروں کی رپورٹیں، مال گزاری اندراج پرمبنی اعداد و شمار کے جدول اور افسران کے ذریعہ بنگال اور مدراس (موجودہ تامل ناڈو) کی مال گزاری اور عدالتی انتظامیہ پر لکھے نوٹس (حاشیے) شامل تھے۔

کمپنی نے 1760 کی دہائی کے وسط میں جب سے بنگال میں حکومت قائم ہوئی تبھی سے انگلینڈ میں اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جارہی تھی اور ان پر بحث و مباحثہ جاری تھا۔ انگلینڈ میں بہت سے ایسے گروہ بھی تھے جو ہندوستان اور چین کے ساتھ تجارت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کی مخالفت کرتے تھے۔ یہ گروہ چاہتے تھے کہ اس شاہی چارٹر (فرمان) کو رد کردیا جائے جس کے تحت کمپنی کو یہ اجارہ داری دی گئی ہے۔ ایسے نجی تاجروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی جو ہندوستانی تجارت میں حصہ لینا چاہتے تھے اور برطانیہ کے صنعت کار وہاں کی صنعت کے لیے ہندوستان کے بازار پر قبضہ چاہتے تھے۔ بہت سے سیاسی گروہوں کی تو یہ دلیل تھی کہ بنگال کی فتح کا فائدہ صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہی مل رہا ہے پورے برطانیہ کو نہیں۔ کمپنی کی بدحکمرانی اور بدانتظامی کے متعلق اطلاعات کے سبب برطانیہ میں گرما گرم بحث شروع ہوگئی اور کمپنی کے کارندوں کی بدعنوانی اور لالچ کے واقعات اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کو منضبط کرنے کے لیے اٹھارھویں صدی کے آخر میں متعدد ایکٹ (قانون) پاس کیے اور کمپنی کو مجبور کیا گیا کہ وہ ہندوستان کے نظم و نسق کے ضمن میں باقاعدہ اپنی رپورٹ پیش کیا کرے کمپنی کے معاملات کی تفتیش کرنے کے لیے کمیٹیوں کا تقرر کیا گیا۔ پانچویں رپورٹ ایک ایسی ہی رپورٹ تھی جو ''سلیکٹ کمیٹی'' کے ذریعہ پیش کی گئی تھی۔ یہ رپورٹ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی نوعیت پر برطانوی پارلیمنٹ میں شدید بحث و مباحثہ کی بنیاد بن گئی۔

شکل 10.6
مہاراجہ مہتاب چند (79–1820)
جب استمراری بندوبست نافذ کیا گیا اس وقت تیج چند بردوان کا راجہ تھا۔ اس کے بعد مہتاب چند کے تحت بردوان کی زمین داری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ مہتاب چند نے سنتھال بغاوت اور 1857 کی بغاوت میں انگریزوں کی مدد کی۔

'بے نامی'، کے لغوی معنی گمنام ہونا ہے۔ ہندی اور دیگر بہت سی ہندوستانی زبانوں میں اس اصطلاح کا استعمال ایسے انصرام کے لیے کیا جاتا ہے جو کسی فرضی یا نسبتاً غیر اہم افراد کے نام سے کیے جاتے ہیں حالانکہ کہ ان میں اصلی فائدہ پانے والے فرد کا نام نہیں دیا جاتا۔

'لٹھیال'، کے لغوی معنی ہیں وہ فرد جس کے پاس لاٹھی یا ڈنڈا ہو۔ یہ زمین داری کے طاقتور فرد کے طور پر کام کرتے تھے۔

شکل 10.7
انڈل راج محل
راج محل کے کھنڈرات ایک عہد کے خاتمہ کے بصری نشانات ہیں۔ اشرافیہ زمین دار طبقے کے زوال پذیر طرز زندگی پر بنی ستیہ جیت رے کی مشہور فلم ''جلشا گھر'' اسی انڈل راج محل میں عکس بندکی گئی تھی۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں بنگال کے دیہی علاقوں میں کیا ہوا، اس کے متعلق ہمارا تصور تقریباً ڈیڑھ صدی تک اس پانچویں رپورٹ کی بنیاد پر قائم رہا۔ پانچویں رپورٹ میں شامل ثبوت بیش قیمتی ہیں۔ لیکن ایسی سرکاری رپورٹوں کو بہت احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔ ہم کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ رپورٹ کس نے اور کیوں تحریر کی۔ حقیقتاً حالیہ تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانچویں رپورٹ میں پیش کیے گئے ثبوتوں اور دلائل کو بغیر کسی تنقید کے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

محققین نے دیہی بنگال میں نوآبادیاتی حکمرانی کے متعلق لکھنے کے لیے بنگال کے بہت سے زمین داروں کے آرکائیوز نیز اضلاع کی مقامی دستاویزات کی احتیاط کے ساتھ تحقیق کی ہے۔ یہ دستاویزات ظاہر کرتی ہیں کہ پانچویں رپورٹ لکھنے والے کمپنی کی بدانتظام حکومت کی شدید تنقید کرنے پر آمادہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی پانچویں رپورٹ میں روایتی زمین داری اقتدار کی درماندگی کا تذکرہ مبالغہ آمیز ہے اور جس پیمانے پر زمین دار اپنی زمین سے بے دخل ہوتے جارہے تھے، اس کے بارے میں زیادہ تخمینہ پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، حتیٰ کہ جب زمین داریاں نیلام کی جاتی تھیں تب بھی زمین دار ہمیشہ بے دخل نہیں کیے جاتے تھے اور وہ انوکھی تدابیر استعمال کرکے اپنی زمین داریاں قائم رکھتے تھے۔

ماخذ 2

پانچویں رپورٹ سے اقتباس (From the Fifth Report)

زمین داروں کی حالت اور زمینوں کی نیلامی کے حوالے سے پانچویں رپورٹ میں بیان کا کیا گیا ہے:

مال گزاری وقت کی پابندی کے ساتھ جمع نہیں کی جاتی تھی اور کافی حد تک زمینوں کا رقبہ میعادی طور پر نیلامی میں فروخت کرنے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ مقامی سال 1203 مطابق 97-1796 میں فروخت کے لیے شامل مشتہر زمین کی متعین رقم جمع یا تخمینہ 28,70,061 سکہ روپے تھا اور زمین کے رقبہ کی خرید رقم 17,90,416 سکہ روپے اور 14,18,756 سکہ روپے کی رقم جمع یا تخمینہ کی شکل میں فروخت کی گئی۔ 1204 مطابق 98-1797 میں 26,66,191 سکہ روپے کے لیے زمین مشتہر کی گئی 22,74,076 سکہ روپے کی مقدار میں زمین فروخت کی گئی نیز خرید رقم 21,47,580 سکہ روپے تھی۔ قصورواروں میں کچھ لوگ ملک کے پرانے خاندانوں میں سے تھے جیسے ناڈیا، راج شاہی، بشن پور (سبھی بنگال کے اضلاع) کے راجہ...........اور دیگر سال بہ سال ان کی جائیدادوں (جاگیروں) کے حصے ہوجانے سے ان کی حالت خراب ہوگئی، انھیں غریبی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا اور بعض مثالوں میں تو عوامی تخمینے کی رقم کو بے تخفیف بنائے رکھنے کے لیے مال گزاری افسران کو بھی کافی مشکلات اٹھانی پڑیں۔

جس لہجے میں ثبوت ریکارڈ کیا گیا ہے اس سے رپورٹ میں بیان کردہ حقائق کے ضمن میں تحریر کرنے والے کے رویہ کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟ اعداد و شمار کے ذریعہ رپورٹ میں کیا کہنے کی کوشش کی گئی ہے؟ آپ کے خیال میں کیا ان دو سالوں کے اعداد و شمار سے کسی بھی مسئلہ کے متعلق طویل مدتی عمومیت پیش کی جاسکتی ہے؟

بحث کیجیے...........

آپ نے زمین داروں کے ضمن میں بیان میں ابھی جو کچھ پڑھا اس کا موازنہ باب 8 کے بیان سے کیجیے۔

2. بیلچہ اور ہل (THE HOE AND THE PLOUGH)

آئیے اب ہم اپنی توجہ بنگال کی نم زمینوں سے ہٹا کر خشک خطّوں پر اور مقیم زراعت کے معمول سے ہٹا کر جھوم زراعت (پھیر بدل کر زراعت کرنا) پر مرکوز کریں۔ آپ یہاں ان تبدیلیوں کو دیکھیں گے جو زرعی معیشت کی سرحدوں کے باہر کی طرف توسیع ہونے سے آئیں جب راج محل کے پہاڑی علاقوں میں چراگاہیں اور جنگلات اس میں ضم ہوگئے۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان تبدیلیوں نے کس طرح اس علاقے کے اندر مختلف طرح کے تصادم پیدا کردیے۔

2.1 راج محل کی پہاڑیوں میں (In the hills of Rajmahal)

ابتدائی انیسویں صدی میں بکانن نے راج محل کی پہاڑیوں کی سیاحت کی تھی۔ اس کے بیان کے مطابق یہ پہاڑیاں ناقابل عبور تھیں۔ یہ ایسا خطرناک علاقہ تھا جہاں بہت کم افراد سفر کرنے کی ہمت کرتے تھے۔ بکانن جہاں کہیں بھی گیا وہاں اس نے لوگوں کو دشمنی پر آمادہ پایا۔ وہ لوگ افسران کے تئیں خدشات کا شکار ہونے، ساتھ ساتھ ان سے بات کرنے کے خواہش مند نہ تھے۔ بہت سی مثالوں میں تو وہ اپنے گاؤں کو ویران کر کے فرار ہوگئے تھے۔

شکل 10.8
راج محل میں ایک پہاڑی گاؤں کا منظر، ولیم ہوجز کے ذریعہ بنائی گئی تصویر، 1782

ولیم ہوجز ایک برطانوی فنکار تھا جو کیپٹن کک کے ساتھ اس کے بحرالکاہل کے دوسرے سمندری سفر (75–1772) پر گیا اور وہاں سے پھر ہندوستان آیا۔ 1781 میں وہ بھاگل پور کے کلکٹر آگسٹس کلیولینڈ کا دوست بن گیا۔ کلیولینڈ کے دعوت نامہ پر ہوجز 1782 میں اس کے ہمراہ جنگل محالوں کے دورہ پر گیا تھا اور وہاں اس نے کئی قلمی (aquatints) تصاویر بنائی تھیں۔ اس دور کے کئی برطانوی مصوروں کی طرح ہوجز نے بھی کئی دلکش مناظر کی دریافت کی تھی۔ اس دور کے دلکش مناظر کے متلاشی مصور رومانیت کے معیار سے تحریک یافتہ تھے۔ ان خیالات کی روایات کے تحت فطرت کی ستائش اور اس کے تزک واحتشام اور طاقت کی مدح وتوصیف کی جاتی تھی۔ رومانیت پسند محسوس کرتے تھے کہ فطرت کے ساتھ کلام کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فن کار فطرت کے ایک دلکش منظر کی نظم کے بطور نمائندگی کرے، جدید تہذیب سے نہ بگڑے، نامعلوم بڑی مناظر کو تلاش کرے، روشنی اور سائے کے پاکیزہ کھیل کی قدر کرے۔ فطرت کی ان ہی نامعلوم چیزوں کی تلاش میں ہوجز راج محل کی پہاڑیوں میں گیا۔ اسے مسطح بڑی مناظر اکتا دینے والے لگے اس نے کھردرے، بے قاعدہ اور گوناگونی میں خوب صورتی تلاش کی۔ شورش پسند قبائلی لوگوں کی وجہ سے جن بڑی مناظر کو نوآبادیاتی افسران خطرناک اور سرکش علاقے مانتے تھے وہی مناظر ہوجز کی تصاویر میں پردیسی اور شعری منظر نظر آئے۔

اوپر کی تصویر کو دیکھیے اور ان طریقوں کی شناخت کیجیے جن کے ذریعہ دلکش مناظر کی روایات کی نمائندگی کی گئی ہے۔

قلم کاری (Aquatint) ایک ایسی تصویر ہوتی ہے جو تانبے کی چادر پر تیزاب کے ساتھ کٹائی کر کے بنائی جاتی ہے اور پھر اس پر چھپائی ہوتی ہے۔

یہ پہاڑی نسل کے لوگ کون تھے؟ وہ بکانن کے دورے کے تئیں اتنے خدشہ کا شکار کیوں تھے؟ بکانن کا رسالہ ابتدائی انیسویں صدی میں ان لوگوں کی قابل رحم حالت کی جھلک ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس نے ان مقامات کے تعلق سے، جہاں جہاں وہ گیا، لوگوں سے ملا اور ان کے معمولات کو دیکھا، بطور سرگذشت (ڈائری) تحریر کیا۔ یہ رسالہ بہت سے سوالات ہمارے ذہن میں پیدا کرتا ہے لیکن یہ ہمیشہ جواب دینے میں مدد نہیں کرتا۔ اس کی یہ ڈائری وقت کے ایک لمحہ کے بارے میں بتاتی ہے، لوگوں اور مقامات کی طویل تاریخ کے متعلق نہیں بتاتی۔ اس کے لیے مورخین کو دیگر دستاویزات کی طرف رخ کرنا پڑتا ہے۔

اگر ہم اٹھارھویں صدی کے آخر کی مال گزاری دستاویزات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان پہاڑی نسل کے لوگوں کو ''پہاڑیا'' کیوں کہا جاتا تھا۔ یہ راج محل کی پہاڑیوں کے اردگرد رہا کرتے تھے۔ یہ جنگلی پیداوار سے گذر بسر کرتے اور جھوم کھیتی کرتے تھے۔ وہ جنگل کے چھوٹے سے حصے میں جھاڑیوں کو کاٹ کر اور گھاس پھوس کو جلا کر زمین صاف کر لیتے تھے۔ ان قطعات زمین پر جو راکھ کی پوٹاش سے زرخیز ہوجاتا تھا، یہ پہاڑی لوگ مختلف قسم کی دالیں اور جوار باجرہ اپنے کھانے کے لیے اُگاتے تھے۔ یہ اپنے بیلچہ سے زمین کو تھوڑا بہت کھرچ لیتے تھے اور کچھ سالوں تک اس صاف کی گئی زمین پر کھیتی کرتے اور پھر کچھ سالوں کے لیے خالی چھوڑ کر نئے علاقے میں چلے جاتے تا کہ اس زمین میں پھر سے زرخیزی پیدا ہوسکے۔

یہ پہاڑی لوگ غذا کے لیے جنگلات سے مہوا کے پھول جمع کرتے تھے، فروخت کرنے کے ریشم کے کوئے اور رال نیز کاٹھ کوئلہ پیدا کرنے کے لیے لکڑی جمع کرتے تھے۔ چٹائی کی مانند درختوں کے نیچے جو چھوٹے چھوٹے پودے اُگ آتے تھے اور خالی زمین پر گھاس کے قطعات جو زمین کو ڈھانک لیتے تھے، وہ جانوروں کے لیے چراگاہ دستیاب کراتے تھے۔

پہاڑی لوگوں کی زندگی بحیثیت شکاری، جھوم کھیتی کرنے والے کسان، غذا جمع کرنے والے، کاٹھ کوئلہ تیار کرنے والے نیز ریشم کے کیڑے پالنے والوں کی شکل میں جنگلات سے لازمی طور پر مربوط تھی۔ وہ املی کے درختوں کے جھنڈ کے اندر اپنی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور آم کے سائے میں آرام کرتے تھے۔ وہ پورے علاقے کو اپنی زمین تسلیم کرتے تھے جو ان کی شناخت کے ساتھ بقائے زندگی کی بنیاد بھی تھی۔ اور یہ لوگ باہری لوگوں کی دراندازی کی مزاحمت کرتے تھے۔ ان کے سردار اپنے گروہ کا اتحاد بنائے رکھتے تھے اور ان تنازعات کا تصفیہ کرتے اور دیگر قبائل نیز میدانی لوگوں کے ساتھ جنگ میں اپنے قبیلے کی قیادت کرتے تھے۔

بکانن کون تھا؟
(Who was Buchanan?)

فرانسس بکانن ایک طبیب (ڈاکٹر) تھا جو ہندوستان آیا اور بنگال میڈیکل سروس میں (1794 سے 1815 تک) ملازمت کی۔ کچھ سالوں کے لیے وہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ویلزلی کا سرجن رہا۔ کلکتہ (موجودہ کولکاتہ) کے قیام کے دوران اس نے ایک چڑیا گھر تشکیل دیا جو کلکتہ علی پور چڑیا گھر بن گیا۔ مختصر مدت کے لیے وہ بوٹانیکل گارڈن کا انچارج بھی رہا۔ بنگال حکومت کی درخواست پر اس نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے دائرۂ اختیار میں آنے والے علاقے کا تفصیلی سروے کیا۔ 1815 میں وہ بیمار پڑ گیا اور انگلینڈ واپس چلا گیا۔ اپنی والدہ کی موت کے بعد ان کی جائداد کا وارث بنا اور اس نے اپنی والدہ کے خاندان کا نام ''ہملٹن'' اختیار کر لیا اس لیے اکثر اس کو بکانن ہملٹن بھی کہا جاتا ہے۔

شکل 10.9
ولیم ہوجز کے ذریعہ بنا یا گیا جنگلی علاقے کا منظر، یہاں آپ جنگلات سے ڈھکی نچلی پہاڑیاں اور اوپر چٹانی سلسلے کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو حقیقت میں کہیں بھی 2,000 فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہیں۔ ہوجز درمیان میں کھڑی پہاڑیاں دکھا کر ان کے قابل حصول ہونے پر زور دینا چاہتا ہے۔

تصویر 10.8 اور 10.9 کو دیکھیے اور بتائیے کہ ان تصاویر میں قبائلی لوگ اور فطرت کے درمیان تعلقات کی نمائندگی کس طرح کی گئی ہے۔

ان پہاڑی باشندوں میں اپنی بنیاد کے ساتھ پہاڑی لوگ مستقل میدانی علاقوں پر یورش کرتے رہتے تھے جہاں سکونت پذیر کاشت کار رہتے تھے۔ یہ یورشیں ان کی بقائے زندگی کے لیے ضروری تھیں، خاص طور پر قحط سالی میں، ساتھ ہی یہ یورشیں سکونت پذیر جماعتوں پر اپنی طاقت کے دعوے کا بھی اظہار تھا۔ اور ایسی یورشیں باہری لوگوں کے ساتھ اپنے سیاسی تعلقات بنانے کے لیے گفت وشنید کا بھی ذریعہ تھیں۔ میدانی علاقے کے زمین دار اکثر ان پہاڑی سرداروں کو پابندی سے خراج ادا کر کے امن وامان خریدتے تھے۔ اسی طرح تاجر بھی ان پہاڑی لوگوں کے ذریعہ کنٹرول، پہاڑی راستوں (درّوں) کو استعمال کرنے کی اجازت انھیں کچھ رقم دے کر حاصل کرتے تھے۔ جب ایک دفعہ ان پہاڑی سرداروں کو ٹیکس مل جاتا تھا تو یہ تاجروں کی حفاظت کرتے تھے نیز یہ بھی یقین دہانی کراتے تھے کہ کوئی بھی ان تاجروں کے مال کو نہیں لوٹے گا۔

یہ گفت وشنید کا امن وامان معاہدہ کسی قدر آسانی سے ٹوٹ جانے والا تھا جو اٹھارھویں صدی کی آخری دہائی میں اس وقت ٹوٹ گیا جب مشرقی ہندوستان میں مقیم زراعت کی جارحانہ توسیع ہوئی۔ انگریزوں نے جنگلات کی صفائی کے کام کی حوصلہ افزائی کی، زمین داروں اور جوت داروں نے غیر مزروعہ زمین کو چاول کے کھیتوں میں تبدیل کر دیا۔ زمین مال گزاری کے وسائل کو بڑھانے کے لیے مقیم زراعت کی توسیع انگریزوں کے لیے ضروری تھی تاکہ برآمد کے لیے فصلیں پیدا ہوں اور مقیم ومنظم سماج کی بنیادیں قائم کی جاسکیں۔ یہ (انگریز) جنگلات کو شوریدہ سری کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے اور جنگلی لوگوں کو غیر مہذب، سرکش اور وحشی خیال کرتے تھے جن پر حکومت کرنا مشکل امر تھا۔ اس لیے انھوں نے محسوس کیا کہ جنگلات کا صفایا کیا جائے اور مقیم زراعت قائم کی جائے نیز جنگلی لوگوں کو مطیع اور مہذب بنایا جائے اور انھیں ترغیب دی جائے کہ وہ شکار کرنا چھوڑ دیں اور کھیتی کریں۔

جوں جوں مقیم زراعت میں توسیع ہوئی، جنگلات اور چراگاہوں کے تحت علاقہ محدود ہوتا گیا۔ اس وجہ سے پہاڑی لوگوں اور سکونت پذیر کاشت کاروں کے درمیان آویزش تیز ہوتی گئی۔ پہاڑی لوگوں نے باقاعدگی کے ساتھ پہلے سے زیادہ سکونت پذیر گاؤں پر یورشوں کی شروعات کر دی اور ان سے غذائی اجناس جانور چھین کر لے جانے لگے۔ نوآبادیاتی افسران نے برانگیختہ ہو کر پہاڑی لوگوں کو کنٹرول کرنے اور مغلوب کرنے کی کوششیں کیں، لیکن انھیں یہ ایک مشکل امر معلوم ہوا۔

1770 کی دہائی میں انگریزوں نے پہاڑی لوگوں کا شکار اور قتل کرنے کے لیے استیصال کی ایک ظالمانہ پالیسی اختیار کی۔ بالآخر 1780 کی دہائی میں بھاگل پور کے کلکٹر آگسٹس کلیولینڈ نے

امان قائم کرنے کی پالیسی تجویز کی جس کے مطابق پہاڑی سرداروں کو ایک سالانہ الاؤنس دیا جانا تھا اور اس کے عوض انھیں اپنے آدمیوں کے چال چلن کو یقینی بنانے کی ذمہ داری لینی تھی۔ ان سے یہ بھی امید کی گئی تھی کہ وہ اپنی بستیوں میں نظم وضبط بنائیں گے اور اپنے آدمیوں کو ڈسپلن میں رکھیں گے۔ بہت سے پہاڑی سرداروں نے الاؤنس لینے سے انکار کر دیا۔ جنھوں نے اسے قبول کیا ان میں سے اکثر اپنی قوم میں اپنا اقتدار کھو بیٹھے۔ نوآبادیاتی حکومت سے پیسہ لینے کے بعد سے انھیں ماتحت نوکر یا تنخواہ دار سردار تصور کیا جانے لگا۔

جب امن وامان کی مہم جاری تھی تب پہاڑی لوگ اپنے آپ کو دشمن فوجوں سے بے عزت ہونے سے بچنے کے لیے اور باہری لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے، پہاڑوں کے اندرونی حصوں میں واپس ہو گئے لہٰذا جب بکانن نے 11–1810 کے سردی کے زمانے میں اس علاقے کی سیاحت کی تو یہ فطری تھا کہ یہ پہاڑی لوگ بکانن کو شک اور بے یقینی سے دیکھیں۔ امن وامان کی مہموں کے تجربات اور بے رحمانہ جبر وتشدد کی یادداشتوں نے اس علاقے میں برطانوی دراندازی کے ان کے تصور کو ایک شکل دی تھی۔ ہر سفید آدمی انھیں طاقت کا ایک ایسا نمائندہ لگتا تھا جو جنگلات اور زمین پر اُن کے کنٹرول کو ان سے چھین کر ان کے طرز حیات اور بقائے زندگی کے وسائل کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔

حقیقتاً اس زمانے میں خطرے کے نئے اشارے ملنے لگے تھے یعنی اس علاقے میں سنتھال جنگلات کو صاف کرتے ہوئے، عمارتی لکڑی کو کاٹتے، زمین جوتتے اور چاول نیز کپاس اگاتے ہوئے کثرت سے آ رہے تھے۔ اس طرح سنتھال آبادکاروں نے نچلی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا تو پہاڑی لوگوں کو راج محل کی پہاڑیوں میں اور اندر کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا۔ اگر پہاڑی لوگوں کی زندگی کی علامت بیلچہ تھی جس کا استعمال وہ جھوم زراعت میں کرتے تھے تو نوآبادکاروں کو ہل کی طاقت کا نمائندہ مانا جاتا تھا۔ بیلچہ اور ہل کے درمیان یہ جنگ بہت طویل وقت تک چلی۔

2.2 سنتھال: پہلے رہنما آبادکار
(The Santhals: Pioneer settlers)

1810 کے آخر میں بکانن نے گنجوریا پہاڑ (جو راج محل پہاڑی سلسلے کا ایک حصہ تھا) کو پار کیا اور چٹانی علاقے سے گذرتے ہوئے ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ یہ ایک قدیم گاؤں جس اس کے اطراف کی زمین زراعت کی توسیع کے لیے ابھی حال ہی میں صاف کی گئی تھی، یہاں کے بڑے مناظر دیکھ کر بکانن کو یہ ثبوت ملا کہ ''انسانی محنت کا مناسب استعمال'' کے ذریعہ اس علاقے کا تغیر کلی ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے ''گنجوریا میں ابھی کافی مقدار میں کاشت کاری کی گئی ہے جس سے

ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے کو کتنا شاندار بنایا جاسکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس کی خوبصورتی اورخوش حالی دنیا کے کسی بھی علاقے کے برابر بنائی جاسکتی ہے۔'' یہاں کی زمین چٹانی ہے لیکن ''غیر معمولی طور پر عمدہ'' ہے اور بکانن نے اتنی عمدہ تمباکو اور سرسوں کہیں نہیں دیکھی تھی۔ معلوم کرنے پر اسے پتہ چلا کہ یہاں سنتھالوں نے کاشت کاری کی حدوں کی کافی توسیع کر لی تھی۔ یہ لوگ (سنتھال) 1800 کے قریب اس علاقے میں آئے تھے۔ انھوں نے پہاڑی لوگوں کو بے دخل کر دیا جو ان نچلی ڈھلانوں پر رہتے تھے، جنگلات کو صاف کیا اور یہاں کی زمین پر آباد ہو گئے۔

سنتھال راج محل کی پہاڑیوں پر کیسے پہنچے؟ سنتھال 1780 کی دہائی کے آس پاس بنگال میں آنا شروع ہوئے۔ زمین دار زراعت کے لیے زمین تیار کرنے اور زراعت کی توسیع کرنے کے لیے انھیں اجرت پر رکھتے تھے اور برطانوی افسران انھیں جنگل محالوں میں آباد ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ جب بھی انگریز پہاڑی افراد کو مغلوب کرنے اور مقیم کھیتی کرنے کے لیے انھیں تبدیل کرنے میں ناکام رہتے تو وہ سنتھالوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ پہاڑی لوگوں نے جنگلات کو کاٹنے سے انکار کر دیا۔ ہل کو ہاتھ لگانے میں مزاحمت کی اور مسلسل سرکشی کرتے رہے۔ اس کے برخلاف سنتھال مثالی آباد کار ظاہر ہوئے۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت سے جنگلوں کو صاف کیا اور ہل چلایا یعنی زراعت کی۔

سنتھالوں کو زمین دے کر راج محل کی پہاڑیوں کے دامن میں آباد ہونے کے لیے راغب کر لیا گیا۔ 1832 تک زمین کے ایک بڑے رقبے کی دامن کوہ کی شکل میں حد بندی کر دی گئی۔

شکل 10.10
سنتھال علاقے میں ایک پہاڑی گاؤں، 23 فروری 1856 میں السٹر ٹیڈ لندن نیوز میں شائع تصویر۔
1850 کی ابتدائی دہائی میں والٹر شیرول کے ذریعہ بنائی گئی راج محل کی نچلی پہاڑیوں میں واقع ایک گاؤں کی تصویر۔ یہ گاؤں پُرسکون، پُرامن اور دلکش ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی زندگی باہری دنیا سے متاثر معلوم نہیں ہوتی۔

تصویر 10.12 کا اس سنتھال گاؤں کی تصویر کے ساتھ موازنہ کیجیے۔

اسے سنتھالوں کی زمین کے طور پر اعلان کر دیا گیا۔ انھیں اس علاقے کے اندر ہی رہنا تھا ہل چلا کر زراعت کرنی تھی اور سکونت پذیر کسان بننا تھا۔ سنتھالوں کو عطیہ میں دی جانے والی زمین کے معاہدہ میں یہ شرط تھی کہ انھیں دی گئی زمین کے کم سے کم دسویں حصے کو صاف کر کے زراعت کرنی تھی۔ اس علاقے کا سروے کر کے یہاں کا نقشہ تیار کیا گیا، کھمبے لگا کر اس کو باڑھ سے گھیر دیا گیا۔ اس کو میدانی علاقے کی سکونت پذیر دنیا اور پہاڑی لوگوں کی پہاڑیوں سے الگ کر دیا گیا۔ دامن کوہ کی حد بندی کے بعد سنتھالوں کی بستیوں میں کافی تیزی کے ساتھ توسیع ہوئی۔ اس علاقے میں سنتھالوں کے گاؤں کی تعداد جو 1938 میں 40 تھی 1851 تک بڑھ کر 1,437 تک پہنچ گئی۔ اس مدت میں سنتھالوں کی آبادی جو صرف 3,000 تھی بڑھ کر 82,000 سے بھی زیادہ ہوگئی۔ جوں جوں زراعت کی توسیع ہوتی گئی، کمپنی کی تجوریوں میں مال گزاری کی رقم میں اضافہ ہوتا گیا۔

سنتھالوں کی روایت اور انیسویں صدی کے گانے بڑی وضاحت کے ساتھ ایک لمبے سفر کی تاریخ بتاتے ہیں۔ یہ سنتھال کے ماضی کی مستقل نقل مکانی کی نمائندگی کرتے ہیں، بسنے کی جگہ انتھک تلاش کی۔ اور دامن کوہ تک ان کا سفر ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے

جب سنتھال راج محل کی پہاڑیوں کے گھیرے پر آباد ہوئے تو پہاڑی لوگوں نے ان سے مزاحمت کی لیکن وہ ان پہاڑیوں میں اندر کی جانب ہٹنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ انھیں نچلی پہاڑیوں اور وادیوں میں نیچے کی طرف حرکت کرنے کے علاوہ اندرونی خشک حصوں اور زیادہ بنجر نیز اوپری پہاڑیوں کے چٹانی علاقوں تک محدود کر دیا گیا۔ اس سے ان کی زندگی پر طویل مدتی اثرات مرتب ہوئے اور یہ مفلس ہوتے گئے۔ جھوم زراعت، نئی نئی زمینوں کی طرف اقدام کرنے اور مٹی کی قدرتی زرخیزی کا استعمال کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہوتی ہے۔ جب زیادہ زرخیز زمینیں ان کی دسترس سے دور ہو گئیں، جو اب دامن کوہ کا حصہ بن چکی تھیں، تو پہاڑی لوگ اپنی کھیتی کے طریقے کو مؤثر طور پر زندہ نہیں رکھ سکے۔ جب اس علاقے کے جنگلات زراعت کے لیے صاف کر دیے گئے تب پہاڑی شکاریوں کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے برخلاف سنتھال لوگوں نے اپنی پہلی والی حرکت پذیر زندگی کو چھوڑ دیا اور ایک جگہ مستقل آباد ہو گئے اور بازار کے لیے کئی قسم کی تجارتی فصلوں کی زراعت کرنے لگے اور تاجروں نیز مہاجنوں کے ساتھ معاملات کرنے لگے تھے۔

شکل 10.11
سیدھو مانجھی، سنتھال بغاوت کا قائد

تاہم سنتھالوں نے بھی جلد ہی یہ جان لیا کہ انھوں نے جس زمین پر کھیتی کرنی شروع کی ہے وہ ان کے ہاتھوں سے پھسلتی جارہی ہے۔ سنتھالوں نے جس زمین کو صاف کر کے کھیتی شروع کی اس پر حکومت بھاری ٹیکس لگا رہی تھی۔ مہاجن (دیکو) سود کی اعلیٰ شرح لگا رہے تھے اور جب قرض ادا نہ کیا جاتا تھا تو اس صورت میں زمین پر قبضہ کر رہے تھے نیز زمین دار دامن کوہ کے علاقے پر کنٹرول کرنے کا دعویٰ کرنے لگے۔

1850 کی دہائی تک سنتھال یہ محسوس کرنے لگے کہ اپنے لیے ایک مثالی دنیا تعمیر کرنے کے لیے جہاں ان کی اپنی حکومت ہوگی، زمین داروں، مہاجنوں اور نوآبادیاتی ریاست کے خلاف بغاوت کرنے کا وقت آگیا ہے۔ یہ سنتھال بغاوت (56-1855) کے بعد سنتھال پرگنہ وجود میں آگیا جس کے لیے 5500 مربع میل کا علاقہ بھاگل پور اور بیربھوم ضلع سے لیا گیا۔ نوآبادیاتی حکومت کو امید تھی کہ سنتھالوں کے لیے نیا پرگنہ وجود میں لانے اور اس میں چند خاص قوانین کا نفاذ کرنے سے سنتھال خوش ہوسکتے ہیں۔
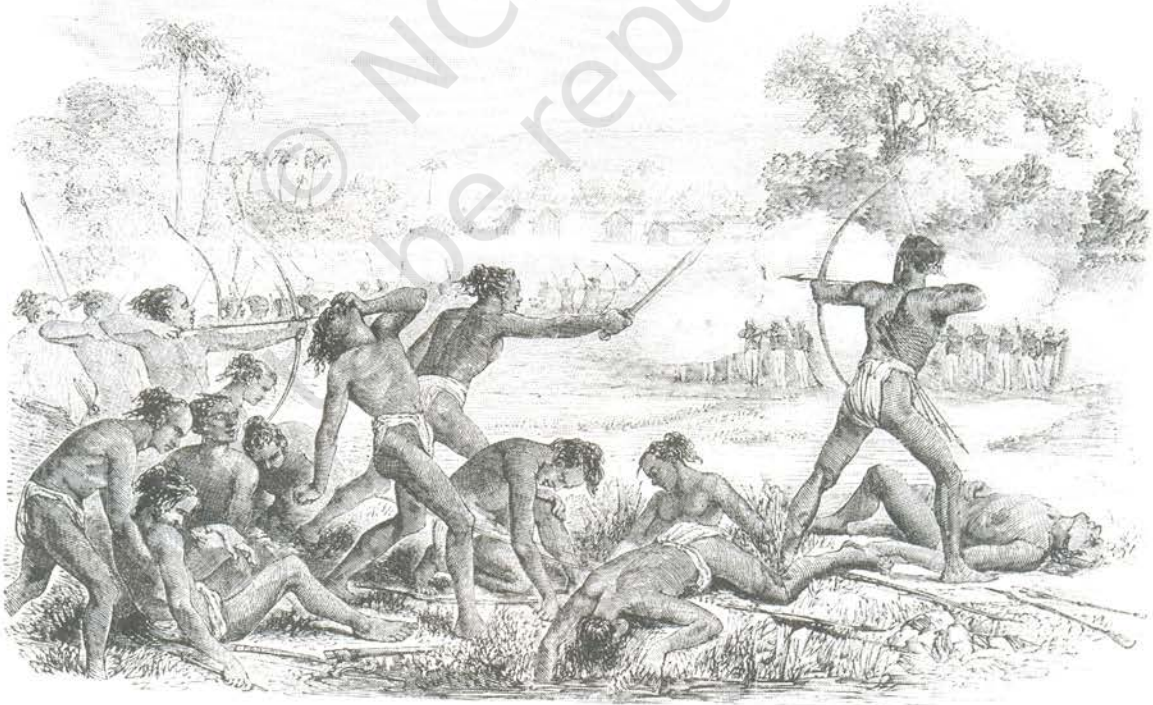
شکل 10.12
سنتھال برطانوی راج کے سپاہیوں سے جنگ کرتے ہوئے۔ 23 فروری 1856 کے السٹر ٹیڈ لندن نیوز میں شائع تصویر۔
اس بغاوت نے سنتھالوں کے تئیں برطانوی تصور کو تبدیل کر دیا۔ جو گاؤں پہلے پرسکون اور پرامن نظر آتے تھے (تصویر 10.10) اب تشدد اور خوں ریزی کے مقامات بن گئے۔

تصور کیجیے کہ آپ انگلینڈ میں الستریٹیڈ لندن نیوز کے قاری ہیں۔ تصویر 10.12، 10.13 اور 10.14 میں دکھائے گئے مناظر کے تئیں آپ کیسے ردعمل ظاہر کریں گے؟ آپ کے ذہن میں یہ تصاویر سنتھالوں کی کیا شبیہ بناتی ہیں؟

شکل 10.13

جلتے ہوئے سنتھال گائوں 23 فروری 1856 کے الستریٹیڈ لندن نیوز میں شائع تصویر

بغاوت کچل دیے جانے کے بعد علاقے کی تلاشی لی گئی۔ مشتبہ لوگوں کو پکڑا گیا اور گاؤں کو آگ لگا دی گئی۔ جلتے ہوئے گاؤں کی تصاویر انگلینڈ کی عوام کو دکھائی گئیں۔ ایک دفعہ پھر یہ مظاہرہ کرنے کے لیے کہ برطانوی کتنے طاقتور ہیں اور ان میں بغاوت کو کچلنے اور نوآبادیاتی نظام کو نافذ کرنے کی صلاحیت ہے۔

شکل 10.14

سنتھال قیدیوں کو لے جاتے ہوئے۔ 1856 میں استریٹڈ لندن نیوز میں شائع تصویر

دھیان دیجیے کہ ایسی تصاویر کس طرح کے سیاسی پیغام کو ذہن نشیں کراتی ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ برطانوی افسران فاتحانہ انداز میں فخریہ انداز میں ہاتھی پر سوار ہیں۔ گھوڑے پر سوار ایک افسر حقہ پی رہا ہے۔ اس تصویر میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ پریشانی کا وقت ختم ہو گیا اور بغاوت کچل دی گئی ہے۔ باغیوں کو زنجیروں میں باندھ کر کمپنی کے سپاہی انھیں حفاظت کے ساتھ گھیرے ہوئے جیل لے جا رہے ہیں۔

2.3 بکانن کی روداد (The accounts of Buchanan)

ہم بکانن کی روداد کی بنیاد پر یہاں خاکہ کھینچ رہے ہیں، لیکن اس کی رپورٹوں کو پڑھتے ہوئے ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ملازم تھا۔ اس کے سفر صرف برّی مناظر اور نامعلوم کی دریافت کی خواہش سے ہی تحریک یافتہ نہیں تھے۔ وہ نقشہ نویسوں، جائزہ کاروں، پالکی اٹھانے والوں، قلیوں وغیرہ لوگوں کی ایک بڑی فوج کے ہمراہ ہر جگہ کوچ کرتا تھا۔ اس کے سفر کا خرچ ایسٹ انڈیا کمپنی برداشت کرتی تھی کیونکہ اسے ان اطلاعات کی ضرورت تھی جن کو جمع کرنے کی امید بکانن سے تھی۔ بکانن کو اس بارے میں خاص طور پر ہدایت دی گئی تھی کہ اسے کیا دیکھنا ہے اور تحریر کرنا ہے۔ وہ جب بھی اپنے لوگوں کی فوج کے ہمراہ کسی گاؤں میں پہنچتا تو اس کو فوراً ہی سرکار کے ایک ایجنٹ کی شکل میں ہی دیکھا جاتا تھا۔

جوں ہی کمپنی نے اپنی طاقت مستحکم کی اور تجارت کی توسیع کی اس نے قدرتی وسائل کی طرف دیکھنا شروع کیا تاکہ پر کنٹرول کر کے ان کا استحصال کیا جا سکے۔ اس نے برّی مناظر اور مال گزاری وسائل کا سروے کیا، انکشافی مہمیں منظّم کیں اور اطلاعات جمع کرنے کے لیے ماہر ارضیات اور جغرافیہ داں نیز نباتات داں اور طبی ماہرین کو بھیجا۔ بلاشبہ بکانن ایک غیر معمولی مشاہد تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا، جو جہاں کہیں بھی گیا وہاں اس نے پتھروں اور چٹانوں نیز وہاں کی زمین کی مختلف سطحوں اور پرتوں کا بغور پر مشاہدہ کیا۔ اس نے تجارتی نقطۂ نظر سے قیمتی معدنیات اور پتھروں کو تلاش کیا۔ اس نے خام لوہا، ابرق، گرینائٹ اور سالٹ پیٹر کی تمام علامات کو ریکارڈ کیا۔ اس نے نمک بنانے اور کانوں سے خام لوہا نکالنے کے مقامی معمولات کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔

کسی برّی منظر کے متعلق لکھتے ہوئے بکانن صرف یہ نہیں بیان کرتا کہ اس نے کیا دیکھا اور برّی منظر کیسا لگتا تھا بلکہ وہ یہ بھی لکھتا کہ اس میں تغیر لا کر اسے زیادہ پیداواری کیسے بنایا جا سکتا ہے، کس طرح کی فصلوں کی زراعت ہو سکتی ہے، کون سے درخت کاٹے جا سکتے ہیں اور کون سے پیدا کیے جا سکتے ہیں اور ہم کو یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ اس کی بصارت اور اس کی فوقیت مقامی باشندوں سے مختلف ہوتی تھی۔ کیا ضروری ہے، اس ضمن میں اس کا تخمینہ کمپنی کے تجارتی اغراض و مقاصد اور ترقی کے ضمن میں جدید مغربی تصور سے متعین ہوتا ہے۔ ناگزیر طور پر وہ جنگلاتی باشندوں کی طرز زندگی کا ناقد تھا اور یہ محسوس کرتا تھا کہ جنگلات کو زراعتی زمینوں میں تبدیل کرنا ہوگا۔

ماخذ 3

سنتھالوں پر بکانن کا بیان (Buchanan on the Santhals)

بکانن لکھتا ہے:

نئی زمینیں صاف کرنے میں بہت ہوشیار ہیں۔ لیکن حقیرانہ انداز میں رہتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیوں میں کوئی باڑھ نہیں ہوتی ہے اور دیواریں چھوٹی چھوٹی سیدھی کھڑی کی گئی چھڑوں سے جو کافی نزدیک ہوتی ہیں، بنائی جاتی ہیں، جن پر اندر کی جانب پلاسٹر کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی اور بدسلیقہ ہوتی ہیں اور چھت سپاٹ ہوتی ہیں جس میں بہت کم محرابی پن ہوتا ہے۔

ماخذ 4

کڈویا کے قریب کی چٹانیں (The rocks near Kaduya)

بکانن کا رسالہ مندرجہ ذیل جیسے مشاہدات سے بھرا ہوا ہے:

تقریباً ایک میل آگے چلنے کے بعد (میں) کسی سطح کی شہادت کے بغیر چٹانوں کے پہلو کے باہر نکلتے ہوئے کم اونچائی والے حصہ پر آ گیا؛ یہ ایک چھوٹا دانے دار گرینائٹ ہے ساتھ ہی سرخ قلمی دھات (Feldspar) سنگ مروہ (Quartz) اور سیاہ ابرق (Black Mica)......

یہاں سے آدھے میل کے فاصلے پر میں ایک دوسری چٹان پر آیا جو طبق در طبق نہیں تھی اور جو عمدہ دانے دار گرینائٹ ساتھ میں پیلی سی قلمی دھات، سفید سنگ مروہ اور سیاہ ابرق تھا۔

ماخذ5

جنگلات کی صفائی اور مقیم زراعت کے متعلق
(On clearance and settled cultivation)

راج محل کی نچلی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے بکانن نے لکھا:

اس علاقے کا منظر بہت ہی عمدہ ہے، یہاں کی زراعت خاص طور پر گردش کرتی ہوئی تنگ وادیوں میں چاروں طرف دھان کی زراعت، بکھرے درختوں کے ساتھ صاف کی گئی زمین اور چٹانی پہاڑیاں بے عیب ہیں؛ اس کے باوجود اس علاقے میں کچھ ترقی کے ظہور اور وسیع پیمانے پر اصلاح شدہ زراعت کی، جس کے لیے یہ علاقہ انتہائی اثر پذیر ہے۔ لکڑی کی جگہ یہاں ٹسر Tassar (ریشم کا کیڑا) اور لاکھ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر آسان اور پالاس کے باغات لگائے جاسکتے ہیں۔ باقی جنگل کو بھی صاف کر دینا چاہیے اور بڑے حصے پر زراعت کرنی چاہیے۔ اگر چہ اس مقصد کے لیے جو جگہ مناسب نہ ہو وہاں پنکھیا کھجور اور مہوا کے درخت اگائے جاسکتے ہیں۔

بحث کیجیے

بکانن کا تذکرہ ارتقا کے متعلق اس کے خیالات کے بارے میں ہمیں کیا بتاتا ہے؟ اقتباس سے حوالہ دیتے ہوئے اپنے دلائل پیش کیجیے۔ اگر آپ ایک پہاڑی باشندے ہوتے تو ان خیالات کے متعلق کیا ردعمل ہوتا؟

3. دیہات میں بغاوت
(A Revolt in the Countryside)

(The Bombay Deccan) (بمبئی دکن)

آپ پڑھ چکے ہیں کہ نو آبادیاتی بنگال کے کسانوں اور زمین داروں نیز راج محل کی پہاڑیوں کے پہاڑی اور سنتھالوں کی زندگی کس طرح تبدیل ہوئی۔ آیئے اب مغربی ہندوستان اور بعد کے عہد کی طرف رخ کرتے ہیں اور تحقیق کرتے ہیں کہ ممبئی دکن کے دیہی علاقوں میں کیا ہو رہا تھا۔

ایسی تبدیلیوں کی تحقیق کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہاں کے کسانوں کی بغاوت پر دھیان مرکوز کیا جائے۔ ایسے ماحولیاتی وقت میں باغی اپنا غصہ اور جوش جنون ظاہر کرتے ہیں۔ وہ جسے ناانصافی اور اپنی پریشانی کے اسباب سمجھتے ہیں اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم ان کی مزاحمت کو بطور تمہید سمجھنا چاہتے ہیں اور ان کے غصے کی تہوں کو ادھیڑنا ہے تو ہم کو ان کی زندگی اور تجربات کی جھلک دیکھنی ہوگی۔ بصورت دیگر یہ ہم سے پوشیدہ رہے گی۔ بغاوتیں دستاویزات بھی پیش کرتی ہیں جن کا مؤرخین معائنہ کر سکتے ہیں۔ باغیوں کی حرکات وسکنات سے ہوشیار ہو کر اور نظم ونسق کو دوبارہ قائم کرنے کی خواہش سے ریاست کے عہدے داران صرف باغیوں کو دبانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے اسباب کی تحقیق کرتے ہیں تاکہ پالیسیوں کو تشکیل دیا جاسکے اور امن وامان قائم کیا جاسکے۔ اس تلاش سے شہادتیں حاصل ہوتی ہیں جس کی مؤرخین تحقیق کر سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے دوران ہندوستان کے مختلف حصوں میں کسانوں نے مہاجنوں اور اناج کے تاجروں کے خلاف بغاوتیں کیں۔ اسی طرح کی ایک بغاوت 1875 میں دکن میں بھی واقع ہوئی۔

3.1 بہی کھاتوں کو جلا دینا (Account books are burnt)

یہ تحریک پونہ (موجودہ پونے) ضلع کے ایک بڑے گاؤں سوپا سے شروع ہوتی۔ سوپا ایک بازار مراکز تھا جہاں بہت سے دکان دار اور مہاجن رہتے تھے۔ 12 مئی 1875 کو قرب وجوار کے دیہی علاقے کی رعیت (کسان) جمع ہوگئے اور دکان داروں پر ان کے بہی کھاتوں اور قرض معاہدوں کا مطالبہ کرتے ہوئے ان پر حملہ کردیا۔ انھوں نے بہی کھاتوں کو جلایا، اناج کی دکانوں کو لوٹ لیا اور ساہوکاروں کے گھروں کو بھی آگ لگادی۔

پونہ سے یہ بغاوت احمد نگر تک پھیل گئی۔ پھر آئندہ دو مہینوں میں یہ بغاوت مزید 6500 کلومیٹر کے رقبے میں پھیل گئی۔ 30 سے بھی زیادہ گاؤں اس سے متاثر ہوئے۔ ہر جگہ بغاوت کا نمونہ ایک جیسا ہی تھا۔ ساہوکاروں پر حملہ کیا گیا، بہی کھاتوں کو جلایا گیا اور قرض معاہدوں کو تباہ کردیا گیا۔ ساہوکار گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اکثر واقعات میں وہ اپنی ملکیت اور مال واسباب بھی پیچھے چھوڑ گئے۔

جب بغاوت پھیلی تو برطانوی افسران کی آنکھوں کے سامنے 1857 (دیکھیے باب 11) کے مناظر آگئے۔ باغی کسانوں کو اطاعت قبول کرنے اور خوفزدہ کرنے کے واسطے گاؤں میں پولیس چوکیاں قائم کی گئیں، جلد ہی فوجوں کو بلایا گیا: 95 افراد کو گرفتار کیا گیا اور بہت سے لوگوں کو سزا دی گئی لیکن دیہی علاقوں کو اپنے کنٹرول میں کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔

ماخذ 6

اس دن سوپا میں (On that day in Supa)

16 مئی 1875 کو پونہ کے ضلع مجسٹریٹ نے پولس کمشنر کو لکھا:

بروز سنیچر، 15 مئی کے دن سوپا میں آنے کے بعد میں اس ہنگامے سے آگاہ ہوا۔

ایک مہاجن کا گھر جلا دیا گیا تقریباً ایک درجن مکانوں کو بزور طاقت توڑ دیا گیا اور پوری طرح مال واسباب کو برباد کردیا گیا۔ حساب کتاب کے کاغذات، معاہدے، اناج، دیہاتی کپڑے سڑکوں پر لاکر جلا دیے گئے جہاں راکھ کے ڈھیر اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

چیف کانسٹیبل نے 50 لوگوں کو گرفتار کیا۔ چوری کی دو ہزار کی ملکیت کی بازیافت کی گئی تخمیناً 25,000 روپے سے زیادہ کا نقصان ہوا۔ مہاجنوں کا نقصان کا دعویٰ ایک لاکھ سے زیادہ کا ہے۔

دکن رائٹس کمیشن

ساہوکار ایک ایسا شخص ہوتا تھا جو مہاجن اور تاجر دونوں کے کردار ایک ساتھ ادا کرتا تھا۔

ماخذ 7

ایک اخبار کی رپورٹ (A news paper report)

"رعیت اور مہاجن" کے عنوان سے مندرجہ ذیل رپورٹ نیٹیو اوپینین (Native Opinion) ،6 جون 1876 نامی اخبار میں شائع ہوئی اور بمبئی کے نیٹیو نیوز پیپر میں اس کا حوالہ دیا گیا:

یہ (رعیت) پہلے اپنے گاؤں کی سرحد پر یہ دیکھنے کے لیے جاسوسی کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرکاری افسران آرہے ہیں تو ان کے آنے کی اطلاع مجرموں کو وقت پر ہی دے دیتے ہیں۔ پھر وہ ایک گروہ کی شکل میں جمع ہوکر اپنے قرض خواہ (ساہوکار) کے گھر جاتے ہیں اور ان سے ان کے اقرار نامے اور دیگر دستاویزات حوالے کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور انکار کرنے پر قرض خواہوں پر حملہ کرنے اور لوٹ مار کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اگر ایسے کسی حادثے کے وقت کوئی سرکاری افسران کے گاؤں کی طرف آتا ہوا نظر آتا ہے تو جاسوس مجرموں کو اس کی اطلاع دے دیتے ہیں اور بعد میں یہ مجرمین وقت رہتے غائب ہوجاتے ہیں۔

ایک مصنف کے ذریعہ مستعمل الفاظ اور اصطلاحات اکثر ہمیں اس کے میلان خاطر کے متعلق بتاتے ہیں۔ ماخذ 7 کو غور سے پڑھیے اور ان اصطلاحات کا انتخاب کیجیے جو مصنف کے کسی میلان خاطر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بحث کیجیے کہ اس علاقے کی رعیت ایسی حالت کا تذکرہ کس انداز میں کرتی ہوگی۔

اقرار نامے اور دستاویزات کیوں جلائے جاتے تھے؟ یہ بغاوتیں کیوں ہوئیں؟ یہ ہمیں دکن کے دیہات کے متعلق اور نوآبادیاتی حکومت کے تحت زرعی تبدیلیوں کے متعلق کیا بتاتے ہیں۔ آیئے ہم انیسویں صدی کے دوران ہوئی تبدیلیوں کی طویل تاریخ پر نظر ڈالیں۔

2. ایک نیا مال گزاری نظام (A new revenue system)

جوں جوں برطانوی حکومت بنگال سے ہندوستان کے دیگر علاقوں تک وسیع ہوتی گئی، ایک نیا نظام مال گزاری نافذ کر دیا گیا۔ استمراری بندوبست کو بنگال کے باہر کسی علاقے میں شاذ و نادر ہی وسعت دی گئی تھی۔

ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ 1810 کے بعد زرعی قیمتوں میں اضافہ ہوا جس سے تیار فصل کی قیمت قدر بھی بڑھی اور بنگال کے زمین داروں کی آمدنی بھی زیادہ ہوئی۔ چونکہ مال گزاری مطالبہ استمراری بندوبست کے تحت طے کیا گیا تھا، اس لیے نوآبادیاتی حکومت اس اضافہ شدہ آمدنی میں اپنے حصے کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے مالی وسائل کو وسعت دینے کی شدید خواہش کے سبب نوآبادیاتی حکومت کو اپنے لگان کو زیادہ سے زیادہ کرنے کے طریقوں پر غور و فکر کرنا پڑا۔ اس لیے انیسویں صدی میں الحاق شدہ صوبوں میں عارضی مال گزاری بندوبست کیے گئے۔

اس کے علاوہ دیگر اسباب بھی تھے۔ جب افسران پالیسیاں تجویز کرتے ہیں تو ان کی سوچ ان معاشی نظریات سے شدت سے بنتی ہے جن سے پہلے سے وہ خوب واقف ہوتے ہیں۔ 1820 کی دہائی تک انگلینڈ کے ڈیوڈ ریکارڈو ایک ماہر معاشیات کے طور پر مشہور تھے۔ نوآبادیاتی افسران نے اپنے کالج کے دنوں میں ریکارڈو کے خیالات و نظریات کو پڑھا تھا۔ جب مہاراشٹر میں برطانوی افسران نے 1820 کی دہائی میں ابتدائی بندوبست کی شرائط تشکیل کرنے کے متعلق کام شروع کیا تو ان خیالات و نظریات میں سے کچھ پر عمل آوری کرنے لگے تھے۔

ریکارڈو کے خیالات کے مطابق زمین مالکان کو اس وقت رواج پذیر ''اوسط لگان'' کا ہی صرف دعویٰ کرنا چاہیے۔ جب زمین سے ''اوسط لگان'' سے زیادہ پیدا ہونے لگے تو زمین مالکان کو زائد مقدار میں آمدنی ہوگی جس پر ریاست کو ٹیکس لگانے کی ضرورت ہے۔ اگر ٹیکس نہیں لگایا گیا تو کاشت کار کرایہ دہندگان میں بدل جائیں گے اور ان کی زائد مقدار آمدنی کا زمین کی اصلاح میں از روئے پیدائش سرمایہ کاری نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں بہت نے برطانوی افسران نے سوچا کہ بنگال کی تاریخ ریکارڈو کے نظریہ کی تصدیق کر دی ہے۔ وہاں کے زمین دار کرایہ دہندگان کے طور پر تبدیل ہوتے نظر آئے کیونکہ انھوں نے اپنی زمینیں پٹے پر دے دیں اور کرائے کی آمدنی پر

کرایہ دہندہ کی اصطلاح کا استعمال ایسے لوگوں کی تخصیص کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جو اپنی ملکیت سے کرایہ آمدنی پر زندگی گزارتے ہیں۔

گزر بسر کرنے لگے۔ یہ ضروری تھا کہ برطانوی افسران بھی یہ محسوس کرنے لگیں کہ ایک مختلف نظام اپنایا جائے۔

جو مال گزاری نظام بمبئی دکن میں رائج کیا گیا وہ ''رعیت واری بندوبست'' کے نام سے معروف ہے۔ بنگال میں نافذ نظام کے خلاف مال گزاری راست طور پر ''رعیت'' کے ساتھ طے کی جاتی تھی۔ مختلف طرح کی زمینوں سے ہونے والی اوسط آمدنی کا تخمینہ کرلیا جاتا تھا، رعیت کی مال گزاری ادا کرنے کی استعداد کا تخمینہ کرلیا جاتا تھا اور ریاست کے حصے کی شکل میں اس کی ایک مقدار طے کردی جاتی تھی۔ ہر تیسویں سال میں زمینوں کا از سر نو سروے کیا جاتا تھا اور لگان کی شرح بڑھادی جاتی تھی۔ تاہم لگان کا مطالبہ زیادہ عرصہ تک مستقل نہیں تھا۔

3.3 مال گزاری مطالبہ اور کسان کا قرض
(Revenue demand and peasant debt)

ممبئی دکن میں پہلا مال گزاری بندوبست 1820 کی دہائی میں کیا گیا۔ مال گزاری کا مطالبہ اتنا زیادہ تھا کہ بہت سے مقامات پر کسان اپنے گاؤں کو چھوڑ کر نئے علاقوں میں ہجرت کر گئے۔ ان علاقوں میں زمین گھٹیا قسم کی تھی اور بارش بھی غیر مستقل تھی، خاص طور پر مسئلہ شدید تھا۔ جب بارش نہیں ہوتی تو فصل کم مقدار میں ہوتی تھی لہذا کسان کے لیے لگان ادا کرنا ناممکن ہوجاتا تھا۔ تاہم لگان جمع کرنے والے نگراں کلکٹر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تھے اور اپنے اعلیٰ افسران کو خوش کرنے کے لیے کوشش کرتے تھے۔ اس لیے وہ انتہائی سخت گیری کے ساتھ رقم وصول کرنے کی جدوجہد کرتے تھے۔ جب کوئی شخص لگان ادا کرنے میں ناکام رہتا تو اس کی فصلیں ضبط کرلی جاتی تھیں اور پورے گاؤں پر جرمانہ نافذ کردیا جاتا تھا۔

1830 کی دہائی تک مسئلہ مزید سخت ہوگیا۔ 1832 کے بعد زرعی پیداوار کی قیمتوں میں تیزی سے گراوٹ آئی اور ڈیڑھ دہائی تک اس حالت میں کوئی بہتری نہیں ہوئی جس کا مطلب کسانوں کی آمدنی میں مزید گراوٹ تھا، اس زمانے میں 34-1832 کے سالوں میں دیہی علاقے قحط میں برباد ہوگئے۔ دکن کے ایک تہائی جانور ہلاک ہوگئے اور نصف انسانی آبادی بھی فوت ہوگئی۔ جو بچ گئے ان کے پاس بھی اس بحران سے نکلنے کے لیے زرعی ذخیرہ نہ تھا۔ لگان ادا نہ کیا گیا تو بقایا میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایسے میں کاشت کار کیسے زندہ رہے؟ انھوں نے لگان کیسے ادا کیا، اپنے ہل بیل کیسے خریدے یا بچوں کی شادیاں کیسے کیں؟

انھیں ناگزیر طور پر قرض لینا پڑا۔ مہاجنوں سے قرض لے کر ہی شاذ و نادر لگان ادا کیا جاسکتا تھا لیکن رعیت نے اگر ایک دفعہ قرض لے لیا تو اس کے لیے اسے واپس کرنا کافی مشکل تھا۔ قرض بڑھتا گیا اور قرض کی رقم غیر ادا شدہ بنی رہی تو کسانوں کا انحصار مہاجنوں پر بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ روزمرہ کی ضرورتوں کی اشیا خریدنے اور اپنے پیداواری اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھیں مزید اب قرض لینے کی ضرورت پڑ گئی۔ 1840 کی دہائی تک افسران کو بھی ہر جگہ کسانوں کے قرض کے بوجھ کی خطرناک سطح کے شواہد ملنے لگے۔

1840 کی دہائی کے وسط تک معاشی بحالی کی علامات نظر آنے لگیں۔ بیشتر برطانوی افسران نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ 1820 کی دہائی میں کیے گئے بندوبست بے رحمانہ تھے۔ مطالبہ کیا گیا کہ لگان بہت زیادہ تھا، نظام سخت گیر تھا اور کسانوں کی معیشت گرنے کے قریب تھی۔ اس لیے کھیتی کی توسیع کرنے کے لیے کسانوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر لگان مطالبہ کو معتدل کیا گیا۔ 1845 کے بعد زرعی قیمتوں کی بحالی مستحکم ہوئی۔ کاشت کار اب اپنے زرعی رقبے میں توسیع کرنے لگے اور نئے علاقوں میں حرکت پذیر ہونے لگے تھے نیز چراگاہی زمینوں کو کاشت شدہ کھیتوں میں تبدیل کرنے لگے۔ لیکن کسانوں کو اپنی کاشت کاری میں توسیع کرنے کے لیے زیادہ ہلوں اور مویشیوں کی اور زمین و بیج خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ ان سب کاموں کے لیے ایک بار پھر انھیں مہاجنوں سے قرض لینے کے لیے جانا پڑا۔

شکل 10.15

کپاس کی گرم بازاری

اس گراف کی لائن کپاس کی قیمتوں میں ہونے والے اضافہ اور کمی کو ظاہر کر رہی ہے۔

3.4 کپاس میں پھر گرم بازاری آئی

(Then came the cotton boom)

1860 کی دہائی سے قبل برطانیہ میں درآمد کی جانے والی خام کپاس کا تین چوتھائی حصہ امریکہ سے آتا تھا۔ برطانوی سوتی کپڑے کے صنعت کار طویل عرصے سے امریکی کپاس سپلائی پر اپنے انحصار کی وجہ سے پریشان تھے۔ اگر یہ ذریعہ بند ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس سوال سے پریشان ہو کر مشتاقانہ انداز میں کپاس کی سپلائی کے لیے متبادل ذریعہ تلاش کر رہے تھے۔

1857 میں برطانیہ میں کاٹن سپلائی ایسوسی ایشن قائم کی گئی اور 1859 میں مانچسٹر کاٹن کمپنی تشکیل دی گئی جس کا مقصد دنیا کے ہر حصے میں کپاس کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کرنا تھا جو ان کی نشوونما کے لیے موزوں ہو۔ انھوں نے ہندوستان کو ایک ایسے ملک کے طور پر دیکھا جو امریکہ سے کپاس کی سپلائی بند ہو جانے کی صورت میں لنکا شائر کو کپاس کی فراہمی کر سکتا تھا۔ کپاس کی کاشت کے لیے ہندوستان میں موافق زمین اور آب و ہوا کے ساتھ سستی مزدوری بھی تھی۔

شکل 10.16
کپاس کی نقل و حمل کے لیے گاڑیاد ایک برگد کے نیچے کھڑی ہوئی ہیں۔
السٹریٹڈ لندن نیوز، 13 دسمبر 1862

1861 میں جب امریکی خانہ جنگی چھڑ گئی تو برطانیہ میں پورے کپاس حلقوں میں خوف کی لہر پھیل گئی۔ امریکہ سے درآمد خام کپاس کی سپلائی میں گراوٹ آئی۔ یہ حسب معمول مقدار کی تین فی صد سے کم تھی۔ 1861 میں جہاں بیس لاکھ گانٹھیں (ہر گانٹھ 400 ربس کی) آئی تھیں وہیں 1862 میں صرف 35 ہزار گانٹھیں درآمد ہوئیں۔ مضطربانہ انداز میں ہندوستان اور دیگر ملکوں کو یہ پیغامات بھیجے گئے کہ برطانیہ کو کپاس کی درآمد میں اضافہ کریں۔ بمبئی میں کپاس کے تاجروں نے اس کی سپلائی کا تخمینہ کرنے اور زراعت کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے کپاس پیدا کرنے والے ضلعوں کا دورہ کیا۔ کپاس کی قیمتیں بلند ہوئیں (تصویر 10.15 دیکھیے) ویسے ہی بمبئی میں کپاس برآمد کرنے والے تاجروں نے برطانیہ کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن طریقے سے زیادہ سے زیادہ کپاس خریدنے کو یقینی بنایا۔ اس لیے انھوں نے شہری ساہوکاروں کو پیشگی رقم دی جو اُن دیہی مہاجنوں کو دیں تاکہ وہ خطیر رقم ادھار دیں، جنھوں نے پیداوار کو یقینی بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ جب گرم بازاری آتی ہے تو قرض آسانی سے زیادہ تعداد میں لیا دیا جاتا ہے، کیونکہ جو قرض دیتے ہیں وہ اپنی رقم کی وصولیابی کے بارے میں بےفکری محسوس کرتے ہیں۔

شکل 10.17 کے تین پینل ہیں، کپاس کی نقل و حمل کے مختلف طریقے دکھائے گئے ہیں۔ تصویر میں کپاس کے وزن سے گرتے بیلوں، سڑک پر پڑے گول مول بٹے اور کشتی پر لدی گانٹھوں کے ڈھیر پر دھیان دیجیے، فنکار ان تصاویر کے ذریعہ کیا سمجھانا چاہتا ہے؟

شکل 10.17
ریلوے کے دور سے قبل کپاس کی نقل و حمل، السٹریٹڈ لندن نیوز، 20 اپریل 1861

امریکی خانہ جنگی کے دوران جب امریکہ سے کپاس کی سپلائی بند ہو گئی تب برطانیہ پُر امید ہو گیا کہ ہندوستان برطانوی صنعتوں کے لیے کپاس کی تمام ضرورتوں کے لحاظ سے سپلائی کر دے گا، اس لیے سپلائی کا تخمینہ کیا جانے لگا، کپاس کی خوبی کی جانچ کی جانے لگی اور پیداوار کی خرید و فروخت کرنے کے طریقوں کا مطالعہ ہونے لگا۔ السٹریٹڈ لندن نیوز کے صفحات میں ان کی یہ دلچسپی منعکس ہوتی ہے۔

شکل 10.18
کشتیوں کا ایک بیڑا مرزاپور سے گنگا کے راستے کپاس کی گانٹھیں لے جاتے ہوئے۔
السٹریٹڈ لندن نیوز، 13 دسمبر 1862۔
ریلوے کا دور شروع ہونے سے قبل مرزاپور کا قصبہ دکن سے آنے والی کپاس کا ذخیرہ مرکز تھا۔

اس ارتقا کا دکن کے دیہی علاقوں پر گہرا اثر پڑا۔ دکن کے گاؤں کی رعیت نے اچانک دیکھا کہ ان کی رسائی بظاہر غیر محدود قرض تک ہو گئی ہے۔ انھیں کپاس اگائے جانے والی فی ایکڑ زمین کے لیے سو روپے کی رقم پیشگی دی جانے لگی۔ ساہوکار بھی وسیع طور پر طویل مدتی شرائط کے قرض دینے کے لیے رضامند تھے۔

جب امریکی بحران جاری تھا تو اس زمانے میں بمبئی دکن میں کپاس کی پیداوار وسیع ہو گئی تھی۔ 1860 اور 1864 کے درمیان کپاس پیداوار کا رقبہ دوگنا ہو گیا۔ 1862 تک 90 فی صد سے زائد کپاس برطانیہ میں ہندوستان سے آتی تھی۔

گرم بازاری کے یہ سال بھی تمام کپاس تاجروں میں خوشحالی کا باعث نہیں بنے۔ کچھ مال دار کسانوں کو فائدہ ہوا، لیکن کپاس کے کاروبار کی وسعت کا مطلب یہ ہوا کہ اکثریت قرض کے بوجھ سے دب گئی۔
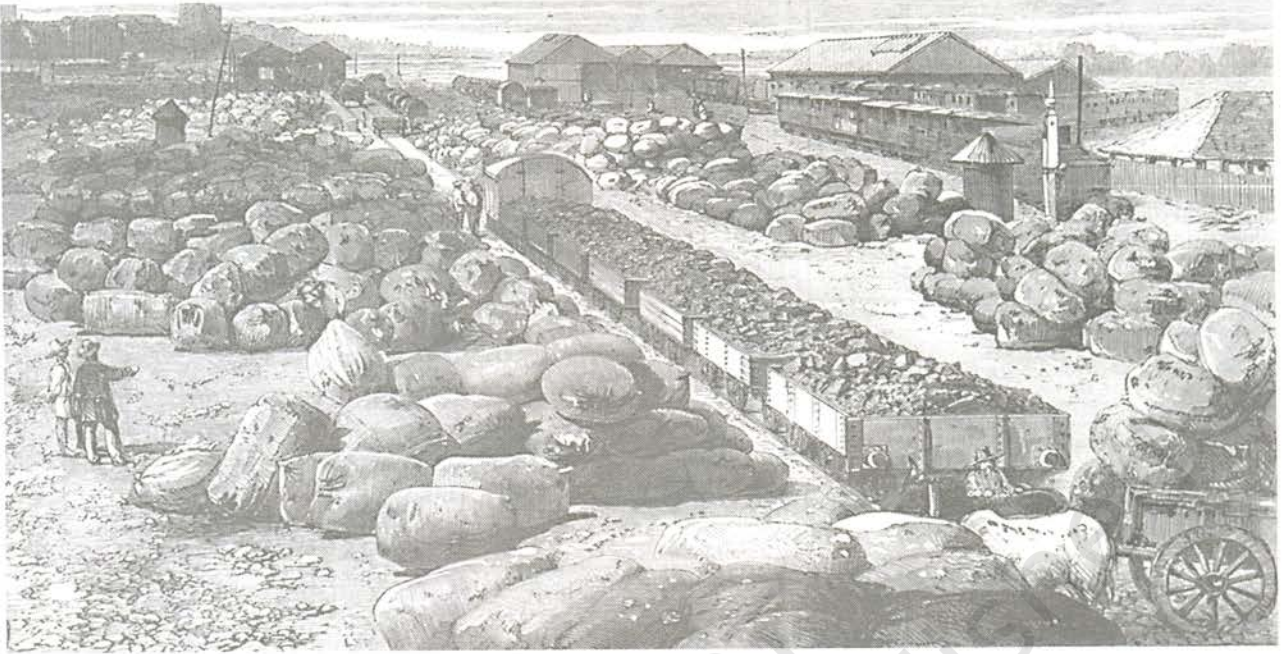
شکل 10.19

گریٹ انڈین پین سولا ریلوے کے ٹرمنس پر کپاس کی گانٹھیں لندن کے لیے جہاز پر چڑھانے کے لیے پڑی ہیں۔ السٹریٹڈ لندن نیوز، 23 اگست 1862۔

ایک دفعہ ریلوے شروع ہوگئی تو کپاس کی سپلائی صرف بیل گاڑیوں اور کشتیوں پر ہی موقوف نہیں رہی بلکہ ریلوے سے بھی ہونے لگی۔ ندیوں سے آمدورفت وقت کے ساتھ کم ہوگئی، لیکن نقل وحمل کے پرانے طریقے پوری طرح برطرف نہیں ہوئے۔ تصویر کے پیش منظر میں دائیں طرف لدی ہوئی بیل گاڑی ریلوے اسٹیشن سے بندرگاہ تک کپاس کی گانٹھیں لے جانے کے انتظار میں کھڑی ہے۔

3.5 قرض کے منبع کا خشک ہوجانا (Credit dries up)

جس طرح کپاس میں گرم بازاری تھی، ہندوستان کے کپاس کے تاجر امریکہ کو مستقل طور پر برطرف کر کے خام کپاس کے عالمی بازار پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ 1861 میں 'بامبے گزٹ' کے مدیر نے سوال کیا 'غلام ریاستوں (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کو ہٹا کر ہندوستان کو لنکا شائر کا سامان بہم پہنچانے والا بننے سے کون روک سکتا ہے؟' 1865 تک یہ خواب بھی بند ہوگئے۔ جب امریکہ میں خانہ جنگی ختم ہوگئی تو کپاس کی پیداوار کو پھر سے رواج دیا گیا اور ہندوستانی کپاس کی برطانیہ میں درآمد باقاعدہ طور پر زوال پذیر ہوگئی۔

مہاراشٹر میں برآمد تاجر اور ساہوکار اب وسیع پیمانے پر طویل مدتی قرض دینے کے لیے زیادہ پُرجوش نہ تھے۔ وہ یہ دیکھ سکتے تھے کہ ہندوستانی کپاس کے لیے مطالبہ زوال پذیر ہے اور کپاس کی قیمتوں میں بھی کمی آ رہی ہے اس لیے انھوں نے اپنے دائرہ عمل بند کرنے، کسانوں کو پیشگی رقم محدود کرنے اور بقایا قرض کی ادائیگی کے مطالبہ کا فیصلہ کیا۔

اگر چہ قرض کا منبع خشک ہو گیا تھا لیکن مال گزاری کے مطالبہ میں اضافہ کر دیا گیا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ پہلا مال گزاری بندوبست 1820 اور 1830 کی دہائی میں کیا گیا۔ اب دوسرا بندوبست کرنے کا وقت تھا اور اس نئے بندوبست میں مطالبہ کو ڈرامائی طور پر 50 سے 100 تک بڑھا دیا گیا۔ رعیت ایسے وقت پر جب قیمتیں گر رہی تھیں اور کپاس کے کھیت غائب ہو رہے تھے بڑھی ہوئی مقدار میں مطالبہ کی ادائیگی کیسے کر سکتی تھی تاہم انھیں ایک بار پھر مہاجنوں کی طرف رخ کرنا پڑا لیکن انھوں نے اب قرض دینے سے انکار کر دیا۔ انھیں رعیت کی قرض ادائیگی کی صلاحیت پر اب زیادہ یقین نہیں رہا تھا۔

3.6 ناانصافی کا تجربہ (The experience of injustice)

مہاجنوں کے ذریعہ قرض دینے سے انکار کرنے پر رعیت غضبناک ہو گئی۔ اس کا سبب صرف یہ نہ تھا کہ وہ قرض میں ڈوبے جا رہے ہیں یا اپنی بقائے زندگی کے لیے مہاجنوں پر پوری طرح سے منحصر ہو گئے ہیں بلکہ ان کی اس حالت پر مہاجن پوری طرح بے حس ہو گئے ہیں۔ مہاجن حضرات بھی دیہات کے رواجی معیارات کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

ماخذ 8

رعیت کی ایک عرضداشت
(A ryot petitions)

یہ ایک عرضداشت کی مثال ہے جو کرجات تعلقہ کے میراج گاؤں کی ایک رعیت کی طرف سے کلکٹر احمد نگر، دکن رائٹس کمیشن کو دی گئی تھی:

ساہوکار کافی عرصے سے ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ چونکہ ہم اپنے گھر کے اخراجات پورے کرنے سے زیادہ نہیں کما پاتے، ہم حقیقت میں ان سے پیسے، کپڑے اور اناج کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں جو ہم ان سے سخت مشکل سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں ان کے ساتھ سخت شرائط پر معاہدہ کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ضروری کپڑے اور اناج بھی ہمیں نقد شرح پر نہیں بیچتے۔ ہم سے جو قیمتیں طلب کی جاتی ہیں وہ نقد رقم ادائیگی کرنے والے گاہکوں کے مقابلے عام طور پر پچیس یا پچاس فی صد زائد ہوتی ہیں...... ہمارے کھیتوں کی پیداوار بھی ساہوکار لے جاتے ہیں جس کو اٹھاتے وقت وہ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ اس کی قیمت ہمارے کھاتے میں کر دی جائے گی۔ وہ جب ہماری پیداوار لے جاتے ہیں تو ہمیں اس کی رسید دینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔

وضاحت کیجیے کہ رعیت اپنی عرضداشت میں کیا شکایت کر رہی ہے۔ مہاجنوں کے ذریعہ کسان سے لی گئی فصل اس کے کھاتے میں کیوں نہیں رقم کی جاتی تھی؟ کسانوں کو کسی قسم کی کوئی رسید کیوں نہیں دی جاتی تھی؟ اگر آپ مہاجن ہوتے تو ان معمولات کے لیے کیا وجوہات پیش کرتے؟

سود پر قرض دینے کا کاروبار یقینی طور پر نوآبادیاتی حکومت سے قبل ہی کافی پھیل چکا تھا اور مہاجن اکثر طاقتور افراد ہوتے تھے۔ مختلف نوع کے رواجی معیار مہاجن اور رعیت کے درمیان رشتوں کو ضبط میں لاتے تھے۔ ایک عام معیار یہ تھا کہ سود کے دام بنیادی سرمایہ سے زیادہ نہیں لیے جا سکتے۔ اس کا مطلب مہاجن کے ذریعہ جبراً وصولیابی کو محدود کرنا اور یہ واضح کرنا تھا کہ ''معقول سود'' میں کیا شمار کیا جا سکتا تھا۔ نوآبادیاتی حکومت کے تحت یہ معیار ختم ہو گئے۔ دکن رائٹس کمیشن کے ذریعہ تحقیق کیے گئے بہت سے معاملوں میں سے ایک میں مہاجن نے 100 روپے قرض پر 2,000 روپیے سے بھی زیادہ سود کی شرح لگا رکھی تھی۔ یکے بعد دیگر کے عرضداشت میں رعیت نے اس طرح کی جبراً وصولیابی اور رواج کی خلاف ورزی کے متعلق ناانصافی کی شکایت کی تھی۔

ماخذ 9

کرایہ کی دستاویز (کرایہ نامہ) (Deeds of hire)

جب کسان پر قرض کا بوجھ زیادہ بڑھ گیا تو وہ مہاجن کو قرض کی ادائیگی کرنے سے معذور ہوگیا۔ اس کے پاس مہاجن کے پاس اپنی تمام ملکیت — زمین، بیل گاڑیاں اور مویشی دینے کے علاوہ کوئی متبادل نہ تھا لیکن مویشی کے بغیر وہ زراعت جاری کیسے رکھ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے زمین اور مویشی کرائے پر لے لیے، اب اسے ان مویشیوں کے لیے جو بنیادی طور پر اس کے ہی مال واسباب تھے، رقم ادا کرنا پڑتی تھی۔ اسے ایک کرایہ نامہ لکھنا پڑتا تھا جس میں واضح طور پر تحریر ہوتا تھا کہ یہ مویشی اور بیل گاڑیاں اس کی ملکیت نہیں ہیں۔ تصادم کی صورت میں یہ دستاویز عدالت کے ذریعہ نافذ کرائی جاسکتی تھی۔

ذیل میں ایک دستاویز کا متن دکن فساد کمیشن کے ریکارڈ سے پیش کیا جا رہا ہے جس پر نومبر 1873 میں ایک کسان نے دستخط کیے تھے:

میں نے آپ کو واجب الادا قرض کے کھاتے میں اپنی بار برداری کی لوہے کی دھروں والی دو گاڑیاں، ان کے سازوسامان اور چار بیلوں کے ساتھ فروخت کی ہیں...... میں نے اس دستاویز کے تحت ان ہی دو گاڑیوں اور چار بیلوں کو آپ سے کرایہ پر لیا ہے۔ میں ہر ماہ آپ کو چار روپے فی ماہ کے حساب سے ان کا کرایہ دوں گا اور آپ سے آپ کی دستی تحریر شدہ رسید حاصل کروں گا۔ رسید کی عدم موجودگی میں یہ بحث نہیں کروں گا کہ کرایہ ادا کر دیا گیا ہے۔

ان سبھی وعدوں (پابندیوں) کی فہرست تیار کیجیے جو کسان اس دستاویز میں دے رہا ہے۔ اس طرح کی کرایہ دستاویز کسان اور مہاجن کے درمیان رشتوں کے متعلق ہمیں کیا بتاتی ہے؟ اس سے کسان اور بیلوں (جو سابقہ دنوں میں خود اس کے تھے) کے درمیان رشتوں میں کیا تبدیلی آئے گی؟

رعیت مہاجنوں کو پیچ دار اور مکار وفریبی کے طور پر دیکھنے لگے۔ وہ مہاجنوں کو قانون کو توڑنے اور کھاتوں میں جعل سازی کی شکایت کرتے تھے۔ 1859 میں انگریزوں نے ایک حد بندی قانون (limitation law) پاس کیا جس میں کہا گیا کہ مہاجن اور رعیت کے درمیان دستخط شدہ معاہدہ صرف تین سالوں کے لیے ہی جائز ہوگا۔ اس قانون کا مقصد طویل عرصے تک سود کو جمع ہونے سے روکنا تھا تاہم مہاجنوں نے اس قانون کو اپنی طرف کرلیا اور رئیت کو مجبور کیا کہ وہ ہر تیسرے سال ایک معاہدہ پر دستخط کریں۔ جب ایک نئے معاہدہ پر دستخط ہوجاتے تو ادا نہ کی گئی بقایا رقم یعنی اصل قرض اور اس پر بننے والا سود بنیادی رقم کی شکل میں درج ہوتا اور اس پر نئے سود کی شرح سے حساب لگایا جاتا۔ دکن رائٹس کمیشن کو وصول شدہ دستاویزوں میں رعیت نے یہ بیان کیا کہ یہ طریق عمل کیسے کام کر رہا تھا (دیکھیے ماخذ 10) اور کس طرح مہاجن رعیت کو جعلسازی (کم واپس کی گئی رقم) کے لیے مختلف قسم کے دیگر ذرائع استعمال کر رہے تھے۔ جب قرض کی دوبارہ ادائیگی ہوتی تو وہ رسید دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ معاہدوں میں فرضی اعداد وشمار داخل کر دیتے، کسانوں سے کم داموں میں فصل حاصل کر لیتے اور آخر کار کسانوں کی ملکیت پر قبضہ کر لیتے تھے۔

دستاویزات اور معاہدے نئے استحصالی نظام کے مظہر کے طور پر سامنے آئے۔ ماضی میں اس طرح کے دستاویزات کم ہوا کرتے تھے۔ تاہم انگریز غیر رسمی افہام وتفہیم کی بنیاد پر جیسا کہ ماضی میں عام تھا، ایسے لین دین کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں لین دین کی شرائط اقرار ناموں، معاہدوں اور دستاویزوں میں صریح طور پر اور غیر مشروط انداز میں مقرر ہونے چاہئیں۔ جب تک کوئی دستاویز یا اقرار نامہ قانونی طور پر قابل نفاذ نہیں ہوگا تب تک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ کسانوں کی زندگی کی بدبختی و پریشانی معاہدوں اور دستاویزوں کے نئے نظام کے ساتھ آئی۔ وہ دستاویزوں پر دستخط کرتے اور انگوٹھے کا نشان لگاتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ حقیقتاً کس پر دستخط کر رہے ہیں۔ انھیں ان شرائط کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا جو مہاجن ان معاہدوں میں داخل کر دیتے تھے۔ وہ تحریر شدہ الفاظ سے ڈرتے تھے لیکن ان کے پاس کوئی دوسری صورت بھی نہ تھی کیونکہ انھیں بقائے زندگی کے لیے قرض کی ضرورت تھی اور مہاجن قانونی معاہدوں کے بغیر قرض دینے کے لیے راضی نہ تھے۔

ماخذ 10

قرض میں اضافہ کیسے ہوا؟ (HOW DEBTS MOUNTED?)

دکن رائٹس کمیشن کو پیش ایک عرضداشت میں ایک رعیت کی وضاحت درج ہے کہ قرضوں کا نظام کس طرح کام کرتا تھا:

ایک ساہوکار اپنے قرض دار کو ایک معاہدے کے تحت 100 روپے کی رقم 2-3 آنہ فی صد کی ماہانہ شرح پر قرض دیتا ہے۔ قرض لینے والا اس رقم کو معاہدہ پاس ہونے کی تاریخ سے آٹھ دن کے اندر ادائیگی پر راضی ہو جاتا ہے۔ رقم کی واپس ادائیگی کے طے شدہ وقت کے تین سال بعد ساہوکار اپنے قرضدار سے بنیادی رقم اور سود ملا کر ایک اور معاہدہ اسی شرح سود سے کرتا ہے اور اسے قرض بے باق کرنے کے لیے 125 دن کی مہلت دیتا ہے۔ تین سال اور 15 دن گزر جانے کے بعد قرض دار کے ذریعہ ایک تیسرا معاہدہ پاس کیا جاتا ہے...... (یہ عمل بار بار دوہرایا جاتا ہے)...... 12 سال کے اختتام پر...... ایک ہزار روپے کی رقم پر کل میزان 2028 روپے 10 آنہ اور تین پیسے ہو جاتا ہے۔

سود کی شرح کا حساب لگایئے جو رعیت ان سالوں میں ادا کر رہی تھی۔

4. دکن رائٹس کمیشن
(THE DECCAN RIOTS COMMISSION)

جب دکن میں بغاوت پھیل گئی تو بمبئی کی گورنمنٹ بنیادی طور پر اسے سنجیدگی سے لینے کو رضامند نہ تھی، لیکن ہندوستان کی حکومت نے جو 1857 کی یادوں سے پریشان تھی بمبئی کی حکومت پر دباؤ

ڈالا کہ وہ فسادات کے اسباب کی تحقیق کرنے کے لیے ایک جانچ کمیشن قائم کرے۔کمیشن نے ایک رپورٹ تیار کی جو برطانوی پارلیمنٹ میں 1878 میں پیش کی گئی۔

یہ رپورٹ جسے دکنی فساد رپورٹ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے،مؤرخین کو فساد کا مطالعہ کرنے کے لیے مختلف ماخذ افراہم کرتی ہے۔کمیشن نے ان اضلاع میں جانچ کرائی جہاں فسادات پھیلے ہوئے تھے۔رعیت،ساہوکاروں اور چشم دید گواہوں کے بیانات قلم بند کیے۔مختلف علاقوں میں مال گزاری کی شرح قیمت اور شرح سود کے اعداد وشمار جمع کیے اور ضلع مجسٹریٹوں کے ذریعہ بھیجی گئی رپورٹوں کا موازنہ کیا۔

بحث کیجیے

آج کل آپ جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں پر لی جانے والی شرح سود کی جانچ پڑتال کیجیے اور معلوم کیجیے کہ شرح سود گذشتہ 50 سالوں میں تبدیل ہوئی یا نہیں۔مختلف گروپوں کے افراد کے ذریعہ ادا کی گئی شرح سود میں کیا کوئی اختلاف ہے؟ان اختلافات کے کیا اسباب ہیں؟

اس طرح کے ماخذوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ وہ سرکاری ماخذ ہیں اور واقعات کی ترجمانی کے متعلق سرکاری تشویش کو منعکس کرتے ہیں۔مثال کے طور پر دکن رائٹس کمیشن سے خاص طور پر یہ رائے ظاہر کرنے کے لیے کہا گیا کہ سرکاری مال گزاری کے مطالبہ کی سطح بغاوت کا سبب تھی۔تمام شہادتیں پیش کرنے کے بعد کمیشن نے یہ رپورٹ دی کہ سرکاری مطالبہ کسانوں کے غصہ کا سبب نہیں تھا۔یہ مہاجن ہی تھے جو ناراضگی کا سبب بنے تھے۔یہ دلیل نوآبادیاتی ریکارڈوں میں اکثر ملتی ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی سرکار یہ ماننے کو قطعی تیار نہ تھی کہ عوامی بے اطمینانی سرکاری کاروائی کا سبب تھی۔

سرکاری رپورٹیں تاریخ کو از سرنو تحریر کرنے میں قیمتی ماخذ ہوتی ہیں۔لیکن انھیں ہمیشہ احتیاط سے پڑھنا چاہیے اور اخبارات،غیر سرکاری روداودں،قانونی دستاویزات اور ممکنہ زبانی ماخذوں کی منتخب شہادت وثبوت کے ساتھ ملا کر پڑھنا (ان کی سچائی کی جانچ کرنا) چاہیے۔

ٹائم لائن

1765	انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی دیوانی حاصل کی
1773	ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں کو منضبط کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعہ ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا گیا
1793	بنگال میں استمراری بندوبست کا نفاذ
1800s	سنتھال کا راج محل کی پہاڑیوں کی طرف آنے لگے اور یہاں آباد ہونے لگے۔
1818	بمبئی میں پہلے مال گزاری بندوبست کا آغاز
1820s	زرعی قیمتوں میں کمی کی شروعات
1840s–50s	بمبئی دکن میں زرعی توسیع کا ست عمل
1855–56	سنتھال بغاوت
1861	کپاس میں گرم بازاری کی شروعات
1875	دکن کے گاؤں میں رعیت کی بغاوت

100 سے 150 لفظوں میں جواب دیجیے

1- دیہی بنگال کے بہت سے علاقوں میں جوت دار ایک طاقتور شخصیت کیوں تھے؟

2- زمین دار افراد اپنی زمین داریوں میں کس طرح کنٹرل بنائے رکھتے تھے ؟

3- پہاڑی لوگوں نے باہری لوگوں کے آنے پر کس طرح کا ردعمل ظاہر کیا؟

4- سنتھالوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغات کیوں کی؟

5- دکن کی رعیت کے مہاجنوں کے خلاف غصہ کی وجوہات کیا ہیں؟

مندرجہ ذیل پر ایک مختصر مضمون (تقریباً 250 سے 300 الفاظ پر مشتمل) لکھیے:

6- استمراری بندوبست کے بعد بہت سی زمین داریاں کیوں نیلام کردی گئیں ؟

7- کن معنوں میں پہاڑی لوگوں کا ذریعہ معاش سنتھالوں سے مختلف تھا؟

8- امریکی خانہ جنگی نے کس طرح ہندوستان میں رعیت کی زندگی کو متاثر کیا؟

9- کسانوں کی تاریخ لکھنے کے تعلق سے سرکاری ماخذوں کے استعمال میں کیا شکایات آتی ہیں؟

شکل 10.20
ایک دیہی منظرولیم پر نسیپ کے ذریعہ بنائی گئی تصویر، 1820

نقشہ کا کام

10۔ برصغیر کے نقشے کے خاکے پر اس باب میں مذکورہ علاقوں کی نشاندہی کیجیے اور پتہ لگائیے کہ کیا ایسے بھی دیگر علاقے تھے جہاں استمراری بندوبست اور رعیت داری نظام رائج تھا۔ ایسے علاقے کو بھی نقشوں پر دکھائیے۔

پروجیکٹ (کوئی ایک)

11۔ فرانسس بکانن نے مشرقی ہندوستان کے بہت سے اضلاع کے متعلق رپورٹیں شائع کی تھیں۔ ان میں سے کوئی رپورٹ پڑھیے اور اس باب میں زیر بحث موضوع پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے دیہی سماج کے متعلق دستیاب اطلاعات کو جمع کیجیے۔ ایسے متون کا استعمال مؤرخین کس طرح کر سکتے ہیں ان طریقوں پر روشنی ڈالیے۔

12۔ آپ جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں کی دیہی کمیونٹی کے اندر موجود بزرگوں سے بات کیجیے اور ان کھیتوں پر جائیے جن کو وہ جوتتے ہیں۔ معلوم کیجیے کہ وہ کیا پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنی معاش کس طرح کماتے ہیں، ان کے والدین کیا کرتے ہیں، ان کی اولاد اب کیا کرتی ہیں اور گزشتہ 75 سالوں میں ان کی زندگی میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اپنی تحقیقات کی بنیاد پر ایک رپورٹ لکھیے۔

مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

سگاتا بوس 1986
ایگریرین بنگال
کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج

فرانسس بکانن، 1930
جرنل آف دی فرانسس بکانن کیپٹ ڈیورنگ دی سروے آف دی ڈسٹرکٹ آف بھاگل پور
سپرنٹنڈنٹ، گورنمنٹ پرنٹنگ، بہار اوراڑیسہ، پٹنہ

رام چندر گوہا، 1989
دی ان کوئٹ وڈس :ایکولوجیکل چینج اینڈ پیزنٹ ریسسٹنز دی ہمالیاز
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی

سمیت گہا 1985
دی ایگریرین اکنامی آف دی بومبے دکن 1818- 1941
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی

دویندر کمار، 1968
ویسٹرن انڈیا ان دی نائنٹیتھ سنچری :اے اسٹڈی ان دی سوشل ہسٹری آف مہاراشٹرا،
روٹلیج اینڈ کیگان پال، لندن

رتنا لیکھا رائے، 1979
چینج ان بنگال ایگریرین سوسائٹی، تقریباً، 1760-1850
منوہر، نئی دہلی

کمار سریش سنگھ 1966
ڈسٹ-اسٹروم اینڈدی ہینگنگ مسٹ :اے اسٹڈی آف برسامنڈااینڈ ہز مومنٹ ان چھوٹاناگپور، (1901 -1874)
فرماکے۔ ایل۔ مکھوپادھیائے، کولکاتہ

5282CH11

بغاوتیں اور راج

1857 کی بغاوت اور اس کی نمائندگی

10 مئی 1857 کو بعد دوپہر میرٹھ چھاونی کے سپاہیوں نے بغاوت کردی۔اس کی شروعات پیدل فوج کے ہندوستانی سپاہیوں نے کی تھی جو تیزی سے گھوڑسوار فوج میں اور پھر شہر تک پھیل گئی۔شہر کے عوام اور قرب وجوار کے گاؤں کے لوگ سپاہیوں کے ساتھ متحد ہوگئے۔سپاہیوں نے اسلحہ خانہ (Bell of Arms) پر قبضہ کرلیا جہاں ہتھیار اور گولہ بارود رکھے ہوئے تھے نیز سفید لوگوں (انگریزوں) پر حملہ کرنا شروع کردیا،ان کے بنگلوں کو تاخت وتاراج کرنا اور جلانا شروع کردیا۔ریکارڈ آفس،جیل،کورٹ،پوسٹ آفس،خزانہ وغیرہ جیسی سرکاری عمارتوں کو تباہ کردیا گیا اور لوٹ لیا گیا۔دہلی کے لیے ٹیلی گراف لائن کاٹ دی گئی۔اندھیرا ہوتے ہی سپاہیوں کا ایک جتھہ گھوڑوں پر سوار ہوکر دہلی کی طرف چل پڑا۔

11 مئی کی صبح ہی سپاہی لال قلعہ کے دروازہ پر پہنچ گئے۔یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ضعیف مغل بادشاہ بہادر شاہ (ظفؔر) سحری (سورج طلوع ہونے سے پہلے کا کھانا) کھا کر اور نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ انھوں نے دروازوں پر ہنگامہ اور شوروغل کی آوازیں سنیں۔سپاہی جو اُن کے جھروکے کے نیچے اکٹھا ہوگئے تھے انھوں نے کہا "ہم میرٹھ سے تمام انگریزوں کو ختم کرکے آئے ہیں،کیونکہ انھوں نے ہم سے گائے اور سور کی چربی چڑھے کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے کے لیے کہا تھا۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا عقیدہ (مذہب) خراب ہوجاتا۔" سپاہیوں کا ایک دوسرا جتھہ بھی دہلی میں داخل ہوگیا اور شہر کے عام لوگ اُن کے ساتھ شامل ہوگئے۔ بڑی تعداد میں اہل یوروپ مار دیے گئے۔دہلی کے دولت مند لوگوں پر حملے ہوئے اور لوٹ مار ہوئی۔یہ واضح تھا کہ دہلی اب انگریزوں کے کنٹرول سے باہر ہوچکی تھی۔گھوڑے پر سوار چند سپاہی شاہی دربار کے آداب کی تعمیل کیے بغیر قلعے میں داخل ہوگئے۔اُن کا مطالبہ تھا کہ بادشاہ ان کو دعائے برکت دے۔سپاہیوں سے گھرے بہادر شاہ ظفر کے پاس ان کی بات ماننے کے علاوہ دیگر کوئی چارہ نہ تھا۔اس طرح بغاوت نے ایک قسم کا قانونی جواز حاصل کرلیا تھا کیونکہ اس بغاوت کو اب مغل بادشاہ کے نام پر چلایا جاسکتا تھا۔

شکل 11.1
بہادر شاہ ظفؔر کی تصویر

12 اور 13 مئی کو شمالی ہندوستان میں امن چین رہا۔ جوں ہی یہ خبر پھیلی کہ دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہوگیا ہے اور بہادر شاہ نے بغاوت کو اپنی حمایت دے دی ہے، گنگا کی وادی اور دہلی کے مغرب کی طرف بعض چھاونیوں میں یکے بعد دیگرے بغاوت شروع ہونے لگی۔

1. بغاوت کا نمونہ (PATTERN OF THE REBELLION)

اسلحہ خانہ (Bell of Arms) ایک ذخیرہ گھر ہوتا ہے جہاں ہتھیاروں کو رکھا جاتا ہے۔

اگر ان بغاوتوں کی تاریخوں کو تاریخ وار ترتیب سے رکھا جائے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جوں جوں بغاوت کی خبر ایک سے دوسرے قصبے تک پہنچتی گئی ویسے ویسے سپاہی ہتھیار اٹھاتے گئے۔ ہر چھاونی میں معاملہ ایک جیسا ہی تھا۔

فرنگی اصل میں فارسی زبان کی اصطلاح ہے جو ممکن ہے فرینک (جس سے فرانس کا نام پڑا ہے) سے اخذ کی گئی ہو۔ اکثر اردو اور ہندی میں غیر ملکی (مغربی) لوگوں کے لیے اس کا استعمال توہین آمیز انداز میں کیا جاتا ہے۔

سپاہیوں نے اپنی کارروائی کا آغاز ایک خاص قسم کے اشارے (سگنل) سے کیا: بہت سے مقامات پر توپ کا گولہ داغا گیا یا نقارہ بجایا گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے اسلحہ خانہ پر قبضہ کیا اور خزانہ کو لوٹ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے جیل خانہ، ٹیلی گراف آفس، ریکارڈ روم، بنگلوں اور سرکاری عمارتوں پر حملہ کیا اور تمام ریکارڈ جلا دیے۔ گورے لوگوں سے وابستہ ہر چیز اور ہر شخص ان کا نشانہ بنا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو متحد کرنے اور بغاوت کو فروغ دینے نیز فرنگیوں کا استیصال کرنے کے لیے ہندی، اردو اور فارسی میں اعلانات و اشتہارات جاری کیے جانے لگے۔

جب بغاوت میں عام لوگ شامل ہونے لگے تو حملوں میں بھی وسعت آگئی۔ بڑے شہروں جیسے لکھنؤ، کان پور اور بریلی میں مہاجن اور متمول طبقہ بھی باغیوں کے غصہ کا نشانہ بننے لگے۔ کسان ان کو ظالم انگریزوں کے اتحادی کے طور پر دیکھتے تھے۔ بیشتر مقامات پر اُن کے مکانات لوٹ لیے گئے اور تاخت و تاراج کر دیے گئے۔ سپاہیوں کی صفوں میں ہونے والی اس بغاوت نے جلد ہی ایک کھلی بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔ اس موقع پر ہر قسم کے اقتدار اور نظام مراتب کی اعلانیہ نافرمانی ہوئی۔

شکل 11.2
لکھنؤ میں عام لوگ سپاہیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں پر حملہ کرتے ہوئے۔

مئی اور جون کے اِن مہینوں میں باغیوں کی کارروائیوں کا انگریزوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ انفرادی طور پر اہل یوروپ اپنی اور اہل خانہ کی زندگیوں کو بچانے کی کوشش کررہے تھے۔ برطانوی حکومت کے بارے میں ایک برطانوی افسر نے لکھا تھا ''تاش کے پتوں سے بنے مکان کی طرح ڈھیر ہوگئی تھی۔''

ماخذ 1

غیر معمولی زمانے میں عام زندگی (Ordinary life in extraordinary times)

بغاوت کے مہینوں کے دوران شہروں میں کیا ہوا؟ ہنگامے کے ان مہینوں میں لوگ کیسے زندگی جی رہے تھے؟ معمولاتِ زندگی کس طرح متاثر ہوئے؟ مختلف شہروں کی رپورٹیں روزمرہ کی سرگرمیوں کے ختم ہونے کے متعلق ہمیں کیا بتاتی ہیں؟ 14 جون 1857 کے ''دہلی اردو اخبار'' سے ان رپورٹوں کو پڑھیے:

> یہ بات سبزیوں اور ساگ (پالک) کے معاملے میں بھی صادق آتی ہے۔ لوگ اس بات کی شکایت کررہے ہیں کہ کدو اور بینگن تک بھی بازار میں نہیں پائے جاتے۔ آلو اور اروی جب کبھی ملتی بھی ہیں تو باسی اور سڑی گلی قسم کی جسے دوراندیش کنجڑوں (سبزی فروش) نے پہلے سے ذخیرہ کررکھا تھا۔ شہر کے اندر واقع باغیچوں سے بعض پیداوار شہر کے کچھ علاقوں تک پہنچ جاتی ہے لیکن غریب اور متوسط طبقے کے افراد انھیں دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر لیتے ہیں۔ (چونکہ یہ چندہ افراد کے لیے ہی ہیں)
>
> ...... یہاں چند دیگر باتوں پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے جو لوگوں کے لیے کافی نقصان کا سبب بنی ہوئی ہیں وہ یہ کہ بھشتیوں (پانی بھرنے والے) نے پانی بھرنا بند کردیا۔ غریب شرفا خود اپنے کاندھوں پر گگرے میں پانی بھر کر لاتے تب کہیں جاکر صرف اہل خانہ کے ضروری کام جیسے کھانا بنانا وغیرہ ممکن ہوسکتے۔ حلال خور، حرام خور ہوگئے ہیں۔ بہت سے محلوں میں لوگ کئی دنوں کے لیے کمانے کے اہل نہیں ہیں اور اگر یہ حالت مسلسل بنی رہی تو پھر صحت کی خرابی، موت اور بیماریاں مل کر شہر کی آب وہوا خراب کردیں گی اور پورے شہر میں ایک وبا پھیل جائے گی یہاں تک کہ قرب وجوار کے علاقے بھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

ان دونوں رپورٹوں اور اس زمانے میں دہلی کے متعلق اس باب میں دیے گئے بیانات کو پڑھیے۔ یاد رکھیے کہ اخبارات کی خبریں اکثر اخباری نامہ نگاروں کے میلان خاطر کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس تناظر میں دہلی اردو اخبار، لوگوں کے ردِّعمل کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟

1.2 خبر رسانی کے طریقۂ کار (Lines of communication)

مختلف مقامات پر بغاوت کے نمونہ میں یکسانیت کے لیے وجہ جزوی طور پر اس کی منصوبہ بندی اور تال میل میں پوشیدہ تھی۔ یہ بالکل واضح ہے کہ مختلف چھاونیوں میں سپاہیوں کی صفوں کے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ موجود تھا۔ مئی کی ابتدا میں جب ساتویں اودھ اور ریگولر کیولری نے نئے کارتوسوں کو قبول کرنے سے انکار کردیا تو انھوں نے 48 نیٹیو انفینٹری کو تحریر کیا کہ ''ہم نے اپنے عقیدے کے لیے یہ کام کیا تھا اور 48 نیٹیو انفینٹری کے احکامات کا انتظار کررہے ہیں۔'' سپاہی یا

ان کے سفیر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے۔ چنانچہ لوگ بغاوت کے منصوبے بنا رہے تھے اور اس کے متعلق بات کر رہے تھے۔

ماخذ 2

سسٹن اور تحصیل دار (Sisten and the tahsildar)

بغاوت اور غدر برپا کرنے کے متعلق پیغامات کی اطلاع بہم رسانی کے تناظر میں سیتاپور میں تعینات ایک دیسی عیسائی پولس انسپکٹر سسٹن بتاتا ہے کہ وہ تسلیمات ادا کرنے سہارن پور مجسٹریٹ کے پاس گیا ہوا تھا۔ سسٹن ہندوستانی لباس پہنے ہوئے تھا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا، اسی وقت بجنور سے ایک تحصیل دار کمرے میں داخل ہوا۔ اسے علم ہوا کہ سسٹن اودھ سے آیا ہے۔ اس نے پوچھا ''اودھ سے کیا خبر ہے؟ کام کیسا چل رہا ہے، بھائی؟'' محتاط انداز میں سسٹن نے جواب دیا ''اگر ہمیں اودھ میں کام کرنا پڑتا ہے تو جناب عالی کو بھی علم ہو جائے گا۔'' تحصیل دار نے کہا ''اس پر بھروسہ رکھیے، اس بار ہم کامیاب ہوں گے، معاملات کی رہنمائی قابل ہاتھوں میں ہے۔'' بعد میں تحصیل دار کی شناخت بجنور کے باغیوں کے اہم ترین لیڈر کے طور پر ہوئی تھی۔

باغی اپنے منصوبوں کی اطلاعات کن طریقوں سے پہنچاتے تھے اور کس طرح تبادلہ خیال کرتے تھے، اس کے متعلق اس بات چیت سے کیا خیال ظاہر ہوتا ہے؟ تحصیل دار نے سسٹن کو ایک احتمالی باغی کیوں سمجھا تھا؟

بغاوتوں کا نمونہ اور شہادتوں کا سلسلہ جوڑنے سے خیال ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کسی حد تک منصوبہ بندی اور تال میل موجود تھا، جس سے انتہائی اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منصوبے کس طرح بنائے گئے ہیں؟ منصوبہ ساز کون تھے؟ دستیاب دستاویزات کی بنیاد پر اس طرح کے سوالات کے راست جوابات دینا مشکل امر ہے، لیکن ایک واقعہ اس بارے میں ایک سراغ دیتا ہے کہ بغاوتیں کس طرح منظم ہوئی ہوں گی۔ بغاوت کے دوران اودھ ملٹری پولس کے کیپٹن ہیرسی کا تحفظ اس کے ہندوستانی ماتحتوں کے ذریعہ دیا گیا تھا۔ جہاں کیپٹن ہیرسی تعینات تھا وہیں 41 ویں نیٹیو انفینٹری تعینات تھی۔ انفینٹری کا اصرار تھا چونکہ وہ اپنے تمام سفید افسروں کو ختم کر چکے ہیں اس لیے ملٹری پولس کو ہیرسی کو بھی مارنا ہوگا یا اسے گرفتار کر کے 41 ویں نیٹیو انفینٹری کے سپرد کرنا ہوگا۔ ملٹری پولس نے دونوں طرح کے اصرار ماننے سے انکار کر دیا اور یہ طے کیا گیا کہ معاملہ کا تصفیہ کرنے کے لیے ہر رجمنٹ کے دیسی افسروں کی ایک پنچایت بلائی جائے۔ بغاوت کے ابتدائی مورخین میں سے ایک چارلس بال لکھتا ہے کہ یہ پنچایت رات کو کان پور سپاہی لائنس میں بلائی گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ فیصلے اجتماعی طور پر لیے جا رہے تھے۔ اور اس امر واقعہ کا علم بھی ہوتا ہے کہ سپاہی ان لائنس میں رہتے ہوئے اور ایک مشترکہ زندگی میں شریک کار تھے

غدر / بغاوت (Mutiniy) کے معنی مسلح افواج کے اندر قوانین اور ضوابط کی اجتماعی نافرمانی ہیں بغاوت (Revolt) کے معنی مستقل بنیاد پر قائم اقتدار وطاقت کے خلاف لوگوں کی بغاوت ہے۔ اصطلاح (Revolt) (بغاوت) اور (Rebellion) (بغاوت) کا استعمال ہم معنی کے طور پر بھی کر سکتے ہیں۔

1857 کی بغاوت کے تناظر میں اصطلاح بغاوت (Revolt) کا حوالہ ابتدائی طور پر غیر فوجی آبادی کی شورش و بغاوت (کسانوں، زمین داروں، راجاؤں، جوت داروں) کے لیے دیا جاتا ہے۔ اگرچہ بغاوت (Mutiny) سپاہیوں کی بغاوت تھی۔

اوران میں سے بیشتر ایک ہی ذات سے آئے تھے اس لیے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں ہے کہ وہ یکجا ہوکر اپنی قسمت کے فیصلے لے رہے ہوں گے۔ یہ سپاہی اپنی بغاوت کے خالق خود ہی تھے۔

1.3 قائداور پیروکار (Leaders and followers)

انگریزوں سے لڑنے کے لیے قیادت اور تنظیم کی ضرورت تھی۔اس کے لیے کئی مرتبہ باغیوں نے ایسے لوگوں کی طرف رخ کیا جو انگریزوں کی فتح سے قبل قائد رہ چکے تھے۔میرٹھ کے سپاہیوں نے سب سے پہلے جو کام کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ دہلی کی طرف دوڑے اور بوڑھے مغل بادشاہ سے بغاوت کی قیادت قبول کرنے کی درخواست کی جس میں وقت لگا۔ بہادرشاہ ظفر کا پہلا ردعمل خوف اور انکار تھا۔ یہ صرف اس وقت ہو پایا جب کچھ سپاہی لال قلعہ کے دربار کے اندر حسب معمول درباری آداب ورسوم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے داخل ہوگئے تھے، چونکہ بوڑھے بادشاہ نے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ اس کے پاس انتخاب کم ہیں اس لیے وہ بغاوت کے برائے نام لیڈر بننے کے لیے راضی ہوگئے۔

شکل 11.3
رانی لکشمی بائی کی ایک مقبول عام شبیہ

ہر جگہ چھوٹے پیمانے پر اسی طرح کے مناظر سامنے آئے۔ کان پور میں سپاہیوں اورعوام نے پیشوا باجی راؤ دوم کے جانشین نانا صاحب کے سامنے یہ بات رکھی، اُن کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بغاوت میں باغیوں کے لیڈر کے طور پر شامل ہوں۔جھانسی میں عوام کے دباؤ سے مجبور ہوکر رانی کو خود کو بغاوت کا لیڈر ماننا پڑا۔اسی طرح کا معاملہ بہار میں آرا کے مقامی زمین دار کنور سنگھ کے ساتھ تھا۔اودھ میں جہاں مقبول عام نواب واجد علی شاہ کی بے دخلی اور ریاست کا الحاق لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تازہ تھا لکھنؤ میں برطانوی حکومت کے زوال کے بعد نواب کے نوجوان بیٹے برجیس قدر کے باغیوں کا لیڈر بننے پر عوام نے خوشیاں منائیں۔

ہر جگہ قائد دربار سے وابستہ افراد — رانیاں، راجا، نوابین اور تعلقہ دار نہیں اکثر بغاوت کا پیغام عام آدمی، خواتین نیز مذہبی افراد کے ذریعہ جارہا تھا۔میرٹھ سے ایسی خبریں آرہی تھیں کہ وہاں ہاتھی پر سوار ایک فقیر دیکھا گیا جس سے سپاہی لگا تار ملاقات کرنے جاتے تھے۔ اودھ کے الحاق کے بعد لکھنؤ میں بہت سے مذہبی قائد اور خود ساختہ پیغمبر برطانوی حکومت کو تباہ و برباد کرنے کی تبلیغ کر رہے تھے۔

شکل 11.4
نانا صاحب
1857 کے آخر میں جب بغاوت فرو ہوگئی تو نانا صاحب بھاگ کر نیپال چلے گئے۔ جسے افسانوی انداز میں اُن کی ہمت اور بہادری کا حصہ بتایا جاتا ہے۔

دیگر جگہوں پر مقامی قائد ابھرے جو کسانوں، زمین داروں اور قبائلیوں کو سخت تاکید کرتے تھے۔ شاہ مل نے اتر پردیش میں بڑوت پرگنہ کے گاؤں کے لوگوں کو منظّم کیا۔چھوٹا ناگ پور میں سنگھ بھوم کے قبائلی کاشت کار گونو علاقے کے کول قبیلے کے باغیوں کا لیڈر بن گیا۔

1857 کے دو باغی

شاہ مل

شاہ مل اتر پردیش کے پرگنہ بڑوت کے ایک بڑے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اُن کا تعلق ایک جاٹ کسان خانوادے سے تھا جس کی قرابت داری چوراسی دیس (چوراسی گاؤں) تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس علاقے کی زمین آب پاشی سے بھرپور اور زرخیز تھی۔ یہ زمین زرخیز اور سیاہ چکنی مٹی والی تھی۔ بہت سے گاؤں والے خوش حال تھے اور برطانوی زمین مال گزاری نظام کو ظالمانہ مانتے تھے کیونکہ لگان کا مطالبہ زیادہ اور اس کی وصولیابی بے لوچ یعنی سخت تھی۔ اس وجہ سے کسان اپنی زمین باہری لوگوں یعنی تاجروں اور مہاجنوں کے ہاتھوں میں دیتے جارہے تھے جو اس علاقے میں آرہے تھے۔

شاہ مل نے چوراسی دیس کے گاؤں کے مکھیا اور کسانوں کو جمع کرنا شروع کیا، انھوں نے راتوں میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں سفر کیا اور لوگوں کو برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے اصرار کیا۔ بہت سے دیگر علاقوں کی طرح یہاں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت، ظلم اور ناانصافی کی تمام علامات کے خلاف ایک عام بغاوت میں تبدیل ہوگئی۔ کسان اپنے کھیت چھوڑ کر نکل پڑے اور مہاجنوں نیز تاجروں کے مکانات کو تاخت وتاراج کردیا۔ بے دخل زمین مالکوں نے ان زمینوں پر قبضہ کرلیا جن کو وہ کھو چکے تھے۔ شاہ مل کے آدمیوں نے سرکاری عمارتوں پر حملہ کردیا۔ ندی پر بنے پل کو تباہ کردیا اور پختہ سڑکوں کو کھود دیا کیونکہ جزوی طور پر سرکاری افواج کو اپنے علاقے میں آنے سے روکنا تھا۔ وہ نیز پلوں اور سڑکوں کو کچھ حد تک برطانوی حکومت کے مظہر کے طور پر بھی دیکھتے تھے۔ انھوں نے دہلی میں بغاوت کرنے والے سپاہیوں کو رسد بھیجی اور برطانوی ہیڈکوارٹر نیز میرٹھ کے درمیان تمام خبررسانی کا سلسلہ روک دیا۔ مقامی طور پر راجہ تسلیم کیے جانے والے شاہ مل نے ایک انگریز افسر کے بنگلے پر قبضہ کرلیا اور اس کو "انصاف کے ایوان" میں تبدیل کردیا جہاں وہ جھگڑوں کا تصفیہ اور فیصلے دینے لگے۔ انھوں نے جاسوسی کا ایک حیرت انگیز نیٹ ورک قائم کیا تھا۔ ایک عرصے کے لیے اس علاقے کے لوگوں کو محسوس ہوا کہ "فرنگی راج" ختم ہوچکا اور ان کا اپنا "راج" آگیا۔

شاہ مل جولائی 1857 میں ایک جنگ میں مارے گئے۔

مولوی احمد اللہ شاہ

مولوی احمد اللہ شاہ اُن علما میں سے ایک تھے جنھوں نے 1857 کی بغاوت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد میں تعلیم حاصل کی تھی اور چھوٹی عمر میں ایک خطیب ومبلغ بن گئے تھے۔ 1856 میں انگریزوں کے خلاف لوگوں سے جہاد اور بغاوت کا اصرار کرنے کے لیے انھیں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں متحرک دیکھا گیا۔ وہ پالکی میں بیٹھ کر، آگے ڈھول بجانے والوں اور پیچھے اپنے متبعین کے ساتھ چلا کرتے تھے۔ اس وجہ سے عام طور پر وہ "ڈنکا شاہ" کے نام سے پکارے جانے لگے۔ برطانوی افسران اس وجہ سے پریشان تھے کہ ہزاروں لوگ مولوی کے متبعین بننا شروع ہوگئے تھے اور بہت سے مسلمانوں نے انھیں الہامی پیغمبر کے طور پر دیکھنا شروع کردیا تھا۔ 1856 میں جب وہ لکھنؤ پہنچے تو پولیس نے انھیں شہر میں خطبہ دینے سے روک دیا۔ بعدازاں 1857 میں انھیں جیل میں بند کردیا گیا۔ جب وہ جیل سے رہا ہوئے تو 22ویں نیٹیو انفینٹری نے انھیں اپنا لیڈر منتخب کرلیا۔ انھوں نے چنہٹ کی مشہور جنگ لڑی جس میں ہنری لارنس کی قیادت والی برطانوی فوجوں کو شکست ہوئی تھی۔ مولوی صاحب کو ان کی جرأت اور طاقت کے لیے جانا جاتا تھا۔ فی الحقیقت بہت سے افراد مانتے تھے کہ وہ ناقابل تسخیر ہیں اور ان کے پاس جادوئی طاقت ہے نیز انگریز اُن کو مار نہیں سکتے۔ یہ اس یقین کی وجہ سے تھا جو انھوں نے لوگوں پر جزوی طور پر اپنی عظمت واقتدار کی بنیاد پر قائم کرلیا تھا۔

شکل 11.5
ہنری ہارڈنگ کی فرانسس گرانٹ کے ذریعہ بنائی گئی تصویر، 1849

گورنر جنرل کے طور پر ہارڈنگ نے فوج کے آلات کی جدید کاری کی کوشش کی تھی۔ اس نے جن این فیلڈ رائفل کو فوج میں متعارف کرایا تھا اس میں شروع میں چربی چڑھے کارتوسوں کا استعمال ہوتا تھا جس کے خلاف سپاہیوں نے بغاوت کی تھی۔

1.4 افواہیں اور پیش گوئیاں (Rumours and prophecies)

افواہوں اور پیشین گوئیوں نے لوگوں میں عملی اقدام کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ میرٹھ سے جو سپاہی دہلی پہنچے تھے انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو گائے اور سور کی چڑھے کارتوسوں کے متعلق بتایا تھا کہ ان کارتوسوں کو منہ سے چھیلیں گے تو اُن کی ذات اور مذہب خراب ہوجائے گا۔ سپاہیوں کا یہ اشارہ این فیلڈ رائفل کے اُن کارتوسوں کی طرف تھا جو حال ہی میں اُن کو ملے تھے۔ انگریزوں نے سپاہیوں سے وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ اس معاملے میں ایسا نہیں ہے لیکن گائے اور سور کی چربی چڑھے نئے کارتوسوں کے متعلق یہ افواہ شمالی ہندوستان کی چھاؤنیوں میں جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی۔

اس افواہ کی اصل تلاش کی جاسکتی تھی۔ رائفل انسٹرکشن ڈپو کے کمانڈنٹ کیپٹن رائٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ دم دم میں واقع اسلحہ خانہ میں کام کرنے والے ایک ''نیچی ذات'' کے خلاصی نے جنوری 1857 کے تیسرے ہفتے میں ایک برہمن سپاہی سے اس کے ہی لوٹے سے پانی پلانے کے لیے کہا۔ برہمن سپاہی نے یہ کہتے ہوئے پانی پلانے سے انکار کردیا کہ ''نیچی ذات'' کے چھونے سے لوٹا ناپاک ہوجائے گا۔ رپورٹ کے مطابق خلاصی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جلد ہی تمہاری ذات برباد ہونے والی ہے چونکہ تمھیں بہت جلد گائے اور سور کی چربی چڑھے کارتوسوں کو منہ سے چھیلنا ہوگا۔'' ہم اس رپورٹ کی صداقت کے متعلق کچھ نہیں جانتے لیکن ایک دفعہ یہ افواہ پھیلنا شروع ہوگئی تو برطانوی افسران کی طرف سے تمام یقین دہانیوں کے باوجود اس کو پھیلنے سے نہیں روکا جاسکا اور سپاہیوں کے درمیان اس کا خوف پھیل گیا۔

1857 تک یہ واحد افواہ نہیں تھی جو شمالی ہندوستان میں پھیلی تھی بلکہ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ برطانوی حکومت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذات اور مذہب کو تباہ کرنے کے لیے ایک بڑی سازش تیار کی ہے۔ افواہ کے مطابق اس مقصد کے لیے انگریزوں نے بازار میں فروخت ہونے والے آٹے میں گائے اور سور کی ہڈیوں کا سفوف ملا دیا ہے۔ قصبوں اور چھاؤنیوں میں سپاہیوں اور عام لوگوں نے آٹے کو چھونے سے بھی انکار کردیا۔ یہاں ایک خوف اور بدگمانی تھی کہ انگریز ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں، یہ دہشت تیزی سے پھیلی، برطانوی افسران نے ہندوستانیوں کا خوف کم کرنے کی کوشش کی جو لا حاصل رہی۔ ان خدشات نے لوگوں کو ہنگامی اقدام کے لیے اکسایا۔ عملی قدم کے لیے دعوت کے ردعمل سے اس پیشین گوئی کے ذریعہ تقویت ملی کہ پلاسی 23 جون 1852 کو کی جنگ کے سو سال پورے ہوتے ہی برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا۔

اس وقت صرف افواہیں ہی نہیں پھیل رہی تھیں بلکہ شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسی رپورٹیں بھی آرہی تھیں کہ گاؤں گاؤں میں چپاتیاں تقسیم کی جارہی ہیں۔ایک شخص رات میں آتا تھا اور گاؤں کے چوکی دار کو ایک چپاتی دیتا تھا اور پانچ مزید چپاتیاں تیار کر کے اگلے گاؤں میں تقسیم کرنے کے لیے کہتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چپاتیاں تقسیم کرنے کا مطلب اور مقصد نہ اس وقت واضح تھا اور نہ آج تک واضح ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ اسے آئندہ ہلچل کی علامت سمجھ رہے تھے۔

1.5 لوگ افواہوں پر کیوں یقین کررہے تھے؟
(Why did people believe in the rumours?)

تاریخ میں ہم افواہوں اور پیشین گوئیوں کی طاقت کو نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ جانچ پڑتال کے ذریعہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ آیا یہ حقیقتاً صحیح ہیں یا نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ جو اِن میں یقین کررہے تھے ان کی ذہنی کیفیت کے متعلق اس سے کیا ترجمانی ہوتی ہے—ان کے خوف اور خدشات، ان عقائد اور ایقان کے متعلق کیا ترجمانی ہوتی ہے، افواہیں تبھی پھیلتی ہیں جب لوگوں کے ذہنوں میں شدید خوف اور شک کی آواز گونج رہی ہو۔

1857 میں شروع ہونے والی افواہوں کو جب 1820 کی دہائی سے انگریزوں کے ذریعہ اختیار کی گئی پالیسیوں کے تناظر میں دیکھنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک کی قیادت میں انگریز مغربی تعلیم ،مغربی تصورات اور مغربی اداروں کے ذریعہ ہندوستانی سماج کی ''اصلاح'' کرنے کے مقصد سے مختلف پالیسیاں اختیار کررہے تھے۔ ہندوستانی سماج کے بعض طبقوں کے تعاون سے انگریزی میڈیم یعنی ذریعہ تعلیم کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جن میں مغربی سائنس اور حریت پسندانہ (liberal) فنون پڑھائے جاتے تھے۔ انگریزوں نے ستی کی رسم ختم کرنے (1829) اور ہندو بیوہ کو دوبارہ شادی کرنے کی اجازت دینے کے قوانین بنائے تھے۔

بد انتظامی اور گود لینے والے بچہ کو جانشین تسلیم کرنے سے انکار کرنا جیسے مختلف قسم کے بہانوں کے ذریعہ انگریزوں نے نہ صرف اودھ بلکہ بیشتر ریاستوں جیسے جھانسی اور ستارا کا الحاق کرلیا۔ جونہی ان علاقوں کا الحاق ہوتا انگریز وہاں اپنا نظم ونسق، قوانین، زمینی بندوبست اور مال گزاری اکٹھا کرنے کے طریقے رائج کردیتے تھے۔شمالی ہندوستان کے لوگوں پر ان سب کا مجموعی اثر گہرا تھا۔

لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ جن چیزوں کو عزیز اور پاک سمجھتے ہیں — راجہ، بادشاہ اور سماجی مذہبی رسومات سے لے کر زمینی ملکیت کے نمونے اور مال گزاری تک — ان سب کو ختم کیا جا رہا ہے اور وہ ایک نظام کے ذریعہ بدل رہی ہیں جو زیادہ لاشخصی، بیگانہ اور ظالمانہ ہے۔ یہ احساس و شعور عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کے ذریعہ مزید سخت ہو رہا تھا۔ ایسی غیر یقینی حالت میں افواہیں غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ پھیل رہی تھیں۔

1857 کی بغاوت کی بعض بنیادی تفصیلات کی چھان بین کرنے کے لیے اودھ پر غائرانہ نظر ڈالیں جو اُن اہم مراکز میں سے ایک تھا جس سے 1857 کا واقعہ ظاہر ہوا تھا۔

بحث کیجیے

اس حصہ کو ایک مرتبہ پھر پڑھیے اور ان طریقوں پر توجہ دیجیے جن سے بغاوت کے دوران لیڈر ابھرتے تھے اور ان اختلافات و یکسانیت کی وضاحت کیجیے جن پر آپ کی توجہ مبذول ہوئی۔ کن ہی دو لیڈروں کے متعلق بحث کیجیے کہ عام لوگ ان کی طرف کس وجہ سے متوجہ ہوئے۔

2. اودھ میں بغاوت (AWADH IN REVOLT)

2.1 ''یہ شاہ دانہ ایک دن ہمارے منہ میں گرے گا'' (A cherry that will drop into our mouth one day)

1851 میں گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے اودھ کی ریاست کے ضمن میں ذکر کیا تھا کہ ''یہ شاہ دانہ ایک دن ہمارے منہ میں گرے گا۔'' پانچ سال بعد 1856 میں ریاست کا رسمی طور پر برطانوی سلطنت میں الحاق کر لیا گیا۔

فتح مرحلوں میں واقع ہوئی۔ 1801 میں امدادی معاہدہ (Subsidiary Alliance) اودھ پر عائد کیا گیا۔ اس معاہدے کی شرائط کے ذریعہ نواب کو اپنی فوجی طاقت ختم کر دینا، ریاست کے اندر انگریز فوجی دستوں کو تعینات کرنے کی اجازت دینا اور دربار سے وابستہ برطانوی ریزیڈنٹ کے مشورے کے مطابق کام کرنا تھا۔ مسلح افواج سے محروم نواب اپنی ریاست میں قانونی نظم و نسق بنائے رکھنے کے لیے روز افزوں انگریزوں پر منحصر ہوتا گیا۔ وہ باغی سرداروں اور تعلقہ داروں پر اب کنٹرول کرنے کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

ریزیڈنٹ، گورنر جنرل کے ذریعہ مقرر کیا ہوا نمائندہ ہوتا تھا۔ وہ ایسی ریاست میں رہتا تھا جو راست طور پر برطانوی حکومت کے تحت نہیں آتی تھی۔

دریں اثنا انگریزوں کی اودھ کے علاقے پر قبضہ کرنے میں دلچسپی روز افزوں بڑھتی جا رہی تھی۔ انھیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ وہاں کی زمین نیل اور کپاس کی پیداوار کے لیے اچھی ہے۔ یہ علاقہ ایسی جگہ واقع تھا جہاں سے خارجی ہندوستان کے لیے بنیادی بازار کو ارتقا پذیر کیا جا سکتا تھا تاہم 1850 کی دہائی کی ابتدا تک ہندوستان کے تمام اہم علاقے: مراٹھا خطے، دوآب کا علاقہ، کرناٹک، پنجاب اور بنگال فتح کر لیے گئے تھے۔ تقریباً ایک صدی قبل بنگال کی فتح کے ساتھ شروع ہوا علاقائی الحاق کا عمل 1856 میں اودھ پر قبضے کے ساتھ مکمل ہونے کی امید تھی۔

2.2 ''جسم سے جان نکل چکی تھی''
(The life was gone out of the body)

لارڈ ڈلہوزی کے ذریعہ کیے گئے الحاق نے تمام علاقوں اور فرماں رواؤں میں بے اطمینانی پیدا کر دی تھی، لیکن اتنا غصہ کہیں اور نہ تھا جتنا شمالی ہند کے دل اودھ میں تھا۔ یہاں نواب واجد علی شاہ کو ناقص انتظام حکومت کے عذر کے ساتھ گدی سے اتار دیا گیا اور کلکتہ جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ برطانوی حکومت نے یہ بھی غلط فرض کر لیا کہ نواب واجد علی شاہ ایک غیر مقبول حکمراں تھے، اس کے برخلاف لوگ ان کو بہت پیار کرتے تھے۔ جب وہ اپنے محبوب وطن لکھنؤ کو چھوڑ کر جا رہے تھے تو بیشتر افراد گریہ و ماتم کے گیت گاتے ہوئے کان پور تک ان کے پیچھے گئے تھے۔

نواب کی جلاوطنی سے نقصان اور رنج و ملال کے اس منظر کو کئی معاصر مشاہدین نے قلم بند کیا ہے۔ ان میں سے ایک نے لکھا تھا ''جسم سے جان نکل چکی تھی اور اس شہر کا جسم بے جان باقی رہ گیا تھا...... وہاں کوئی سڑک یا بازار اور گھر ایسا نہ تھا جس سے جانِ عالم کی جدائی میں سوہان روح کے ساتھ بلند آواز میں رونے کی آواز نہ آ رہی ہو'' ایک لوک گیت میں ماتم کیا گیا کہ ''انگریز بہادر آئے اور ملک پر قبضہ کر لیا'' (انگریز بہادر آئن، ملک لئے لِن ہو)

امدادی معاہدہ
(Subsidiary Alliance)

امدادی معاہدہ لارڈ ویلزلی کے ذریعہ 1798 میں ایجاد کردہ ایک نظام تھا۔ ان تمام لوگوں کو جو یہ معاہدہ انگریزوں کے ساتھ کرتے تھے، چند شرائط قبول کرنی پڑتی تھیں:

(a) انگریز اپنے اتحادی کی طاقت وقوت کی بیرونی و خارجی دھمکیوں سے حفاظت کے لیے ذمہ دار ہوں گے۔

(b) اتحادی کی قلم رو میں ایک انگریز مسلح فوجی نفری تعینات ہوگی۔

(c) اس مسلح فوجی نفری کی نگہداشت کے لیے اتحادی کو وسائل مہیا کرانے ہوں گے۔

(d) اتحادی کسی دیگر حکمراں کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کر سکتا یا جنگ میں صرف انگریزوں کی اجازت کے ساتھ ہی مشغول ہو سکتا ہے۔

نقشہ 1
1857 میں انگریزوں کے کنٹرول میں ہندوستان کی قلم رو
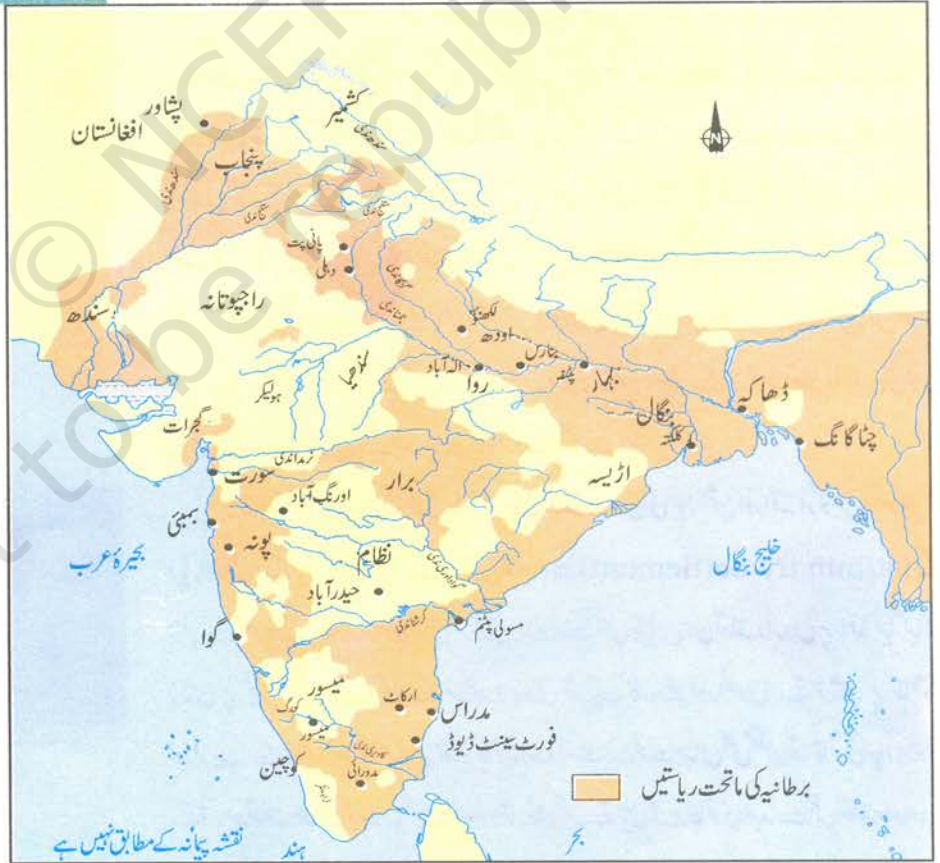
یہ جذباتی تغیرعظیم فوری مادی نقصانات کے ذریعہ مزید سخت ہوا تھا۔نواب کے ہٹائے جانے کے سبب دربار اوراس کا تمدن بھی ختم ہوگیا۔اس طرح لوگوں کا ایک کامل سلسلہ ـــ موسیقار، رقاص،شاعر، دست کار، باورچی،خادم،انتظامی اہلکاراور بہت سےلوگوں نے اپنا ذریعہ معاش کھودیا۔

2.3 فرنگی راج اورایک دنیا کا خاتمہ
(*Firangi raj* and the end of a world)

اودھ میں شکوہ وشکایت کے ایک سلسلے نے شہزادوں،تعلقہ داروں،کسانوں اور سپاہیوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔وہ''فرنگی راج'' کے آنے کومختلف معنوں میں اپنی دنیا کے خاتمہ کی شکل میں دیکھنے لگے ـــ وہ چیزیں ٹوٹ رہی تھیں جواُن کے لیے قیمتی تھیں جن کی وہ عزت کرتے اورمحبوب رکھتے تھے۔1857 کی بغاوت میں تمام پیچیدہ جذبات اورامور، روایات اوروفاداریاں خودسامنے آرہی تھیں۔دوسری جگہوں کے مقابلےاودھ میں یہ بغاوت غیرملکی نظام کے خلاف عوامی مزاحمت کی علامت بن گئی۔

اودھ کے الحاق سے صرف نواب ہی نہیں بلکہ اس علاقے کے تعلقہ دار بھی بے دخل ہوگئے تھے۔اودھ کے دیہی علاقوں میں تعلقہ داروں کی جاگیریں اور قلعے بکھرے پڑے تھے جوکئی نسلوں سے دیہی علاقوں میں زمین اوراقتدار پرکنٹرول رکھے ہوئے تھے۔انگریزوں کے آنے سے قبل تعلقہ دار باضابطہ مسلح افواج رکھتے تھے،وہ قلعہ جات تعمیر کرتے اور جب تک کہ وہ نواب کی بالادستی کوقبول کرتے رہتے اوراپنے تعلقہ کی مال گزاری اداکرتے رہتے تب تک خودمختاری کا لطف اٹھاتے رہتے تھے۔چند بڑے تعلقہ داروں کے پاس تو12000 تک پیدل سپاہی ہوتے تھے حتی کہ چھوٹے تعلقہ داروں کے پاس بھی تقریباً200 پیدل سپاہی ہوتے تھے۔انگریز ان تعلقہ داروں کی طاقت کو برداشت کرنے کے خواہش مند نہ تھے۔الحاق کے فوراًبعد تعلقہ داروں کی فوج کوغیرمسلح کردگیااوران کےقلعہ جات تباہ کردیے گئے۔

برطانوی زمین مال گزاری پالیسی نے تعلقہ داروں کی پوزیشن اوراقتدار کومزید کھوکھلا کردیا۔الحاق کے بعد1856 کے جامع بندوبست (summary settlement) کے نام سے معروف پہلا برطانوی مال گزاری بندوبست اس بنیاد پران تعلقہ داروں پرنافذ کیاگیا جو زمین پر غیرمستقل حدبندی کے ساتھ زبردستی شریک کارتھے اورانھوں نے زمین پر طاقت اورفریب کے ساتھ قبضہ قائم کرلیا تھا۔جامع بندوبست کےتحت جہاں بھی ممکن تھا قانونی چارہ جوئی کےذریعہ تعلقہ داروں کو ہٹا دیا گیا۔اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ برطانوی عہد سے قبل تعلقہ دار اودھ

ماخذ3

نواب صاحب رخصت ہوچکے
(The Nawab has left)

ایک دوسرے گیت میں حکمراں کی تباہ حالی پرآہ وبکا کی گئی ہے جسے اپنے مادرِوطن کوچھوڑنا پڑا:

شرفااورکسان سب مل کررورہے تھےاورتمام
عالم آنسوبہا رہاتھا اور ماتم کررہاتھا آہ! جان
عالم الوداع کہنے پرمجبور ہوگئے اوراپنے ملک
سے پردیس چلے گئے۔

اس پورے حصے کو پڑھیےاورمباحثہ کیجیے کہ لوگ واجد علی شاہ کی روانگی سے رنجیدہ کیوں تھے؟

شکل11.5
اودھ کا ایک زمین دار،1880

میں کل گاؤں کے 67فی صد گاؤں پر قبضہ رکھتے تھے۔ جامع بندوبست کے نفاذ کے ذریعہ یہ تعداد کم ہو کر 38فی صد رہ گئی۔ جنوبی اودھ کے تعلقہ داروں پر سب سے سخت مار پڑی، چند نے تو جن پر پہلے اُن کا قبضہ تھا، آدھے سے زیادہ گاؤں کھو دیے تھے۔

برطانوی زمین مال گزاری افسران کو یقین تھا کہ وہ تعلقہ داروں کو ہٹا کر زمین کو اس کے حقیقی مالک کو بخش دینے کے اہل ہوں گے اور اس طرح کسانوں کے استحصال میں کمی آئے گی۔ اس طرح ریاست کی مال گزاری وصولی میں اضافہ ہوا لیکن کسانوں سے مال گزاری مطالبہ کے بوجھ میں کمی نہیں آئی۔ افسران کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ اودھ کے وسیع علاقے کا تخمینہ حقیقتاً کافی بڑھا چڑھا کر کیا گیا تھا۔ بعض علاقوں میں مال گزاری مطالبہ میں 30 سے 70فی صد اضافہ ہو گیا تھا۔ اس طرح نہ تو تعلقہ داروں کے اور نہ ہی کسانوں کے پاس اس الحاق پر خوش ہونے کے اسباب باقی رہے۔

تعلقہ داروں کی بے دخلی کا مطلب ایک پورے سماجی نظام کا ٹوٹ جانا تھا۔ وفاداری اور سرپرستی کے جن رشتوں سے کسان تعلقہ داروں کے ساتھ بندھے تھے وہ درہم برہم ہو گیا۔ برطانوی عہد سے قبل تعلقہ دار ہی ظالم تھے لیکن بہت سے ان میں رحم دل سرپرست کی شبیہہ بھی رکھتے تھے۔ وہ بقایا جات کی مختلف شکلوں میں کسانوں سے رقم تو وصول کرتے تھے لیکن اکثر وقت پڑنے پر کسانوں کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔ اب انگریزوں کے تحت کسانوں سے لگان کا تخمینہ بڑھا چڑھا کر کرنے اور وصولیابی کے بے لچک طریقے راست طور پر ظاہر ہونے لگے تھے۔ اب اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ مشکل حالات میں یا فصل خراب ہونے کی صورت میں ریاست کا مال گزاری مطالبہ کم ہو جائے گا یا وصولیابی ملتوی کر دی جائے گی یا یہ کہ کسانوں کو تیوہاروں کے موقع پر قرض اور مدد مل پائے گی جو کہ پہلے تعلقہ دار مہیا کر دیا کرتے تھے۔

ان جگہوں میں جیسے اودھ جہاں 1857 میں مزاحمت بہت ہی زیادہ اور دیر تک رہی، لڑائی تعلق داروں اور ان کے کسانوں کے ذریعہ چلائی جا رہی تھی ان میں بہت سارے تعلق دار اور اودھ کے نواب کے وفادار تھے اور وہ بیگم حضرت محل کے ساتھ لکھنؤ میں انگریزوں سے لڑے۔ کچھ انؔ کی ہار تک ان کے ساتھ رہے۔

کسانوں کی شکایتیں فوجی بیرکوں میں پہنچنے لگی تھیں کیونکہ سپاہیوں کی اکثریت اودھ کے گاؤں سے ہی بھرتی کی گئی تھی۔ کئی دہائیوں سے سپاہی کم تنخواہ اور چھٹی حاصل کرنے کے سلسلے

ماخذ 4

تعلقہ دار کیا سوچتے تھے
(What *taluqdars* thought)

تعلقہ داروں کے رویہ کو رائے بریلی کے نزدیک واقع کلاکنکر کے راجہ ہنونت سنگھ نے بے حد عمدہ ڈھنگ سے ظاہر کیا۔ بغاوت کے دوران ہنونت سنگھ نے ایک انگریز افسر کو پناہ دی تھی اور محفوظ مقام تک پہنچایا تھا۔ افسر کو رخصت کرتے وقت ہنونت سنگھ نے اس سے کہا تھا:

> صاحب آپ کے ملک کے لوگ اس ملک میں آئے اور ہمارے راجاؤں کو دھکیل دیا۔ آپ اپنے افسران کو بھیج کر ضلعوں میں جاگیروں کی حق ملکیت کا معائنہ کراتے ہیں۔ ایک ہی جھٹکے میں آپ نے مجھ سے میری زمین چھین لی جو میرے خاندان کی قدیم عہد سے تھی۔ میں نے اطاعت اختیار کر لی۔ اچانک آپ کی بدقسمتی شروع ہو گئی۔ اس زمین کے لوگ آپ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے، تب آپ میرے پاس آئے جس کو آپ نے محروم کر دیا تھا، میں نے آپ کو بچایا، لیکن اب —اب میں اپنے خادموں کو لے کر لکھنؤ جا رہا ہوں تا کہ آپ کو ملک سے باہر نکالنے کی کوشش کروں۔

یہ اقتباس تعلقہ داروں کے رویہ کے بارے میں آپ کو کیا بتاتا ہے؟ اس زمین کے لوگوں سے ہنونت سنگھ کا کیا مطلب تھا؟
ہنونت سنگھ نے لوگوں کے غصہ کی کیا وجہ بیان کی؟

میں پریشانی کی شکایت کر رہے تھے۔ 1850 کی دہائی تک آتے آتے ان کی بے اطمینانی کی دیگر وجوہات بھی پیدا ہوگئیں۔

1857 کی بغاوت سے پہلے ہی سپاہیوں کے اپنے اعلیٰ سفید افسران کے ساتھ رشتے معنی خیز انداز میں تبدیل ہو چکے تھے۔ 1820 کی دہائی میں سفید افسران سپاہیوں کے ساتھ ایک خاص حد تک دوستانہ رشتے بناتے تھے، وہ ان کی موج مستی کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، ان کے ساتھ کشتی لڑتے، تلوار بازی کرتے اور شکار پر جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے انگریز روانی سے ہندوستانی بولتے اور ملک کے رسم و رواج اور تمدن سے خوب واقف تھے۔ یہ افسران سخت گیر اور پدرانہ شفقت دونوں رکھتے تھے۔

1840 کی دہائی میں یہ تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ افسران کے اندر برتری کا ایک شعور پیدا ہوا اور سپاہیوں کو کم تر نسل کا مانتے ہوئے ان سے نازیبا سلوک کرنے لگے، ان کے احساسات پر تکبر سوار تھا۔ دشنام طرازی اور جسمانی تشدد عام بات ہوگئی چنانچہ سپاہیوں اور افسران کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ اعتماد کی جگہ شک وشبہات نے لے لی۔ چکنائی چڑھے کارتوسوں کا واقعہ اس کی نمایاں مثال ہے۔

شکل 11.7
یوروپی طرز کی وردی پہنے بنگال کے سپاہی

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شمالی ہند کے دیہی علاقوں اور سپاہیوں کے درمیان ایک گہرا رابطہ موجود تھا۔ بنگالی فوج کے سپاہیوں کی اکثریت اودھ کے گاؤں اور مشرقی اتر پردیش سے بھرتی کی گئی تھی۔ اُن میں بہت سے افراد برہمن یا ''اعلیٰ ذات'' سے تعلق رکھتے تھے۔ فی الحقیقت اودھ کو ''بنگال فوج کی پرورش گاہ'' کہا جاتا تھا۔ سپاہیوں کے خاندان اپنے اردگرد جن تبدیلیوں کو دیکھ رہے تھے اور جو خطرے محسوس کر رہے تھے وہ جلد ہی سپاہی بیرکوں میں منتقل ہو گئے۔ اسی طرح نئے کارتوسوں کے متعلق سپاہیوں کا خوف، تعطیلات کے متعلق ان کی شکایتیں اور سفید افسران کی طرف سے نسلی دشنام طرازی کی خبریں گاؤں میں بھی پہنچنے لگیں۔ سپاہیوں اور دیہی دنیا کے درمیان اس رابطے کے بغاوت کے طریق پر اہم اثرات مرتب ہوئے۔ جب سپاہی اپنے اعلیٰ افسران کی اعلانیہ نافرمانی کرتے تھے اور ہتھیار اٹھاتے تھے تو فوراً ہی گاؤں میں اُن کے ہم پیشہ لوگ ان کے ساتھ جڑ جاتے تھے۔ ہر جگہ کسان ہجوم کی شکل میں شہروں میں پہنچ کر اور سپاہیوں نیز شہر کے عام لوگوں کے ساتھ متحد ہو کر بغاوت کے مجموعی عمل میں شامل ہو رہے تھے۔

بحث کیجیے...

معلوم کیجیے کہ کیا آپ کی ریاست کے لوگوں نے 1857 کی بغاوت میں حصہ لیا تھا یا نہیں؟ اگر لیا تھا تو معلوم کیجیے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اگر نہیں تو اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کیجیے۔

3. باغی کیا چاہتے تھے؟
(WHAT THE REBELS WANTED?)

بحیثیت فاتح انگریزوں نے اپنی تکالیف ومصائب، اور اس کے ساتھ ہی اپنی جاں بازی کے واقعات قلم بند کیے۔ انھوں نے باغیوں کو ایک احسان فراموشوں اور وحشیوں کا گروہ سمجھ کر خارج کردیا۔ باغیوں کے استیصال کا مطلب یہ تھا کہ ان کی آواز کو خاموش کردیا جائے۔ چند باغیوں کو ہی ان واقعات کے متعلق اپنا بیان قلم بند کرانے کا موقع ملا تاہم باغیوں میں زیادہ تر سپاہی اور عام لوگ تھے جو خواندہ یعنی پڑھے لکھے نہ تھے۔ اس طرح اپنے خیالات کا پروپیگنڈہ کرنے کے لیے اور لوگوں کو مائل کرکے بغاوت میں شامل ہونے کے لیے جاری کیے گئے بعض اعلانات اور اشتہارات کے علاوہ ہمارے پاس بہت زیادہ مواد نہیں ہے جس کی روشنی میں باغیوں کے تناظر کو سمجھا جاسکے۔ چنانچہ 1857 میں کیا ہو رہا تھا اسے از سرنو تحریر کرنے کی کوششوں میں ناگزیر طور پر انگریزوں کی لکھی تحریروں پر منحصر ہونا پڑتا ہے۔ اگرچہ یہ ماخذات افسران کی ذہنیت کو ظاہر کرتے ہیں اور باغی کیا چاہتے تھے اس کے متعلق ہمیں بہت کم بتاتے ہیں۔

3.1 اتحاد کی مدبرانہ بصیرت (The vision of unity)

1857 میں باغیوں کے اعلان میں آبادی کے سبھی طبقوں سے بلالحاظ ذات ومذہب بار بار اپیل کی جاتی تھی۔ بہت سے اعلان مسلم شہزادوں کی طرف سے یا ان کے نام سے جاری کیے گئے تھے بلکہ یہاں تک کہ ان کے تخاطب میں ہندوؤں کے جذبات کا خیال رکھا گیا تھا۔ بغاوت کو ایک ایسی جنگ کے طور پر دیکھا گیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا نقصان یا نفع برابر تھا۔ اشتہارات میں برطانوی عہد سے قبل کے ماضی پر توجہ دینے اور مغل سلطنت کے تحت مختلف قوموں کی بقائے باہمی کے ساتھ رہنے کی مدح سرائی کی جاتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے نام کے تحت جو اعلان جاری کیا گیا تھا اس میں حضرت محمدؐ اور مہاویر دونوں کے معیار کے تحت لوگوں سے لڑائی میں شامل ہونے کی اپیل کی گئی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ شورش کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق پیدا کرنے کی انگریزوں کی کوششوں کے باوجود شاید ہی کوئی مذہبی فرق دکھائی دیا ہو۔ مغربی اتر پردیش میں بریلی میں انگریزوں نے 1857 میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنے کے لیے 50 ہزار روپیے خرچ کیے تھے۔ ان کی یہ کوشش ناکام رہی۔

ماخذ5

اعظم گڑھ اعلامیہ، 25اگست1857
(The Azamgarh Proclamation, 25 August 1857)

باغی کیا چاہتے تھے، اس کے متعلق ہماری معلومات کا یہ ایک اہم ماخذ ہے:

یہ سب جانتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندوستان کے لوگ، ہندو اور مسلمان دونوں، ملحد و بے دین اور دغاباز انگریزوں کی ظلم وتعدی اور جابرانہ حکومت کے تحت تباہ و برباد ہیں لہٰذا ملک کے سبھی مالدار لوگوں خاص طور پر وہ لوگ جو کسی بھی طرح سے مسلم شاہی خاندان سے رشتہ رکھتے ہیں اور جن لوگوں کو روحانی رہنما اور آقا سمجھا جاتا ہے اُن کا یہ لازمی فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی اور ملکیت کو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے خطرے میں ڈال دیں......

اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے طویل عمر سے اپنے گھروں کو چھوڑ چکے اور ہندوستان سے انگریزوں کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی بہترین کوشش کرنے والے بہت سے ہندو اور مسلمان سرداران بذات خود میرے سامنے پیش ہوئے اور ہندوستانی صلیبی جنگ (مذہبی جنگ) کے میدان میں حصہ لیا اور مجھے پوری امید ہے کہ جلد ہی مغرب سے بھی مدد ملے گی لہٰذا عوام کی اطلاع کے لیے موجودہ اشتہار کئی حصوں پر مشتمل جاری کیا جارہا ہے اور یہ سب کی نہایت اہم ذمہ داری ہے کہ اس پر بااحتیاط غور کریں اور اس پر پابند عمل ہوں۔ اس مشترکہ مقصد میں جو متفکر و مضطرب پارٹیاں حصہ لینا چاہتی ہیں لیکن جن کے پاس خود کے لیے مہیا کرنے کے وسائل نہیں ہیں، ان کو میری طرف سے اپنا روزانہ کا معاش قبول کرنا ہوگا اور یہ سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندو اور مسلم دونوں کی پرانی کتابوں میں معجزاتی کام کرنے والوں کی تحریروں میں اور نجومیوں و پنڈتوں کی پیشین گوئیوں میں......سب حتمی طور پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں یا کہیں بھی اب انگریزوں کے قدم زیادہ دن تک نہیں ٹک پائیں گے۔ لہٰذا یہ سب لوگوں کا فرض ہے کہ وہ انگریزوں کی حکمرانی کے مسلسل بنے رہنے کی امید چھوڑ دیں اور میرا ساتھ دیں اور مشترکہ اچھائی کو تقویت دینے میں اپنی انفرادی محنت و کوشش سے بادشاہی یا شاہی حکومت کے پاس ولحاظ کے مستحق بنیں اور اس طرح سے اپنے جداگانہ مقصد حاصل کریں۔ وگرنہ یہ سنہری موقع ہاتھ سے پھسل گیا تو ہمیں اپنی بے عقلی پر پشیمان ہونا پڑے گا......

شق I ''زمین داروں کی بابت''— یہ ظاہر ہے کہ زمین داری بندوبست طے کرنے میں انگریزی حکومت نے بے حساب ''جمع'' (مال گزاری مطالبہ) عائد کردیا ہے اور بہت سے زمین داروں کو بے عزت اور تباہ و برباد کردیا ہے۔ لگان کے بقایاجات کی وصولی کے لیے ان کی جاگیریں عوامی طور پر نیلام کردی گئی ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ ایک رعیت یا خادمہ یا غلام کے ذریعہ کیے گئے قانونی مقدمے پر بھی باعزت زمین داروں کو عدالت میں طلب کیا جارہا ہے، گرفتار کیا جارہا ہے، قید میں ڈالا جارہا ہے اور بے عزت کیا جارہا ہے۔ زمین داروں کی بابت مقدمے بازی میں اسٹامپ کی بے انتہا قیمت اور دیوانی عدالت کے دیگر غیر ضروری اخراجات......ان سب کا تخمینہ فریق مقدمہ کو نادارادا کرتا ہے۔ مزید برآں زمین داروں کے خزانے سے اسکولوں، اسپتالوں، سڑکوں وغیرہ کے لیے چندہ کے نام پر ہر سال ٹیکس لیے جارہے ہیں۔ اس طرح کے استحصال بالجبر کا بادشاہی حکومت میں کوئی وجود نہیں ہوگا، لیکن اس کے برخلاف شاہی حکومت میں ''جمع'' کمتر رہے گی۔ زمین داروں کا وقار اور عزت محفوظ ہوگی اور ہر زمین دار اپنی زمین داری میں خود مختارانہ حکومت کرے گا......

شق II ''تاجروں کی بابت''— یہ بات صاف ہے کہ اس بے دین وملحد اور دغاباز برطانوی حکومت نے تمام عمدہ اور قیمتی تجارتی اشیا جیسے نیل، کپڑے اور دیگر جہازی مال یعنی جہاز پر بار کیے جانے والے مال کی تجارت پر اجارہ داری قائم کرلی ہے۔ لوگوں کے لیے اب صرف ادنیٰ اشیا کی تجارت ہی چھوڑی ہے......مزید برآں ڈاک خرچ، چنگی اور اسکول کے لیے چندہ وغیرہ کے نام پر رقم تاجروں کے منافع سے ٹیکس کی شکل میں لے لیتے ہیں۔ ان تمام رعاتیوں کے باجود مہمل لوگوں کی شکایت پر یا مقدمہ کی صورت میں تاجروں کو قانوناً ذمہ دار مانتے ہوئے گرفتار اور ذلیل کرتے ہیں۔ جب بادشاہی حکومت بنے گی تو مندرجہ بالا تمام دھوکے بازی کی مشق ترک کردی جائے گی۔ خشکی اور پانی کے راستے ہونے والی ہر چیز کی تجارت کسی استثنا کے بغیر ہندوستان کے دیسی تاجروں کے لیے کھول دی جائے گی......چنانچہ یہ ہر تاجر کی ذمہ داری ہے کہ وہ لڑائی میں حصہ لے اور بادشاہی حکومت کی اپنے آدمیوں اور اپنی دولت کے ساتھ مدد کرے......

شق III ''سرکاری ملازمین کی بابت''— اب یہ راز کی بات نہیں ہے کہ برطانوی سرکار کے تحت انتظامی اور فوجی خدمات میں ملازمت کرنے والے دیسی (ہندوستانی) لوگوں کی بہت کم عزت ہے، ان کی تنخواہ کم ہے اور ان کے پاس اثر ورسوخ کے طریقے نہیں ہیں۔ دونوں شعبوں میں بلند درجہ اور منافع کے سارے عہدے پوری طرح سے انگریزوں کو عطا کیے جاتے ہیں...... لہٰذا انگریزوں کی خدمت کرنے والے تمام ہندوستانیوں کو اپنے مذہب اور مفاد کا احساس زندہ رکھنا لازم ہے اور انگریزوں کے تئیں اپنی وفاداری سے دست بردار ہو کر بادشاہی حکومت کا ساتھ دینا چاہیے اور انھیں فی الحال 200 اور 300 روپے فی ماہ تنخواہ حاصل ہوگی اور مستقبل میں اعلیٰ عہدوں کے مستحق ہوں گے......

شق IV— ''دست کاروں کی بابت''— یہ ظاہر ہے کہ یوروپی لوگوں کے ذریعہ ہندوستان میں برطانوی اشیا کے متعارف ہونے کے بعد بنکروں، سوتی کپڑے بنانے والوں، بڑھئی، لوہاروں اور جوتا سازوں وغیرہ کو بے روزگار کر دیا گیا ہے، ان کے پیشوں پر قبضہ جما لیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر قسم کے دیسی دست کار بھکاری کی حالت میں پہنچ گئے ہیں، لیکن بادشاہی حکومت کے تحت دیسی دست کاروں کو بادشاہوں، راجاؤں اور دولت مند لوگوں کی خدمت میں بلا شرکت غیرے روزگار دیا جائے گا اور اس سے بلا شبہ ان میں یقینی خوش حالی آئے گی لہٰذا ان کاریگروں کو انگریزوں کی خدمت سے دست بردار ہونا چاہیے......

شق V— ''پنڈتوں، فقرا اور دیگر ذی علم افراد کی بابت''— پنڈت اور فقرا حسب ترتیب ہندو اور مسلمان مذاہب کے سرپرست ہیں اور یوروپین دونوں مذاہب کے دشمن ہیں۔ چونکہ فی الحال مذہب کے واسطے ہی انگریزوں کے خلاف شدت سے جنگ جاری ہے لہٰذا پنڈتوں اور فقرا کا فرض ہے کہ خود کو میرے سامنے پیش کریں اور اس مقدس جنگ (جہاد) میں اپنی حصہ داری نبھائیں۔

اس اعلان میں برطانوی حکومت کے خلاف کون سے مسئلے اجاگر کیے گئے ہیں؟ ہر سماجی گروپ کے متعلق حصوں کو غور سے پڑھیے۔ اعلان کی زبان کی ضابطہ سازی پر دھیان دیجیے اور غور کیجیے کہ یہ اعلان کون سے مختلف النوع جذبات کو اپیل کر رہا ہے۔

ماخذ 6

سپاہی کیا سوچتے تھے؟ (What the sepoys thought?)

یہ باغی سپاہیوں کی عرضی میں سے ایک عرضی ہے جو ضائع ہونے سے باقی رہ گئی:

ایک صدی قبل انگریز ہندوستان میں وارد ہوئے اور بتدریج اپنی ملازمت میں فوجی نفریاں قائم کرنے لگے اور ہر ریاست کے آقا بن گئے۔ ہمارے اجداد نے ہمیشہ ان کی خدمت کی اور ہم بھی ان کی خدمت میں داخل ہو گئے...... خدا کی مہربانی سے اور ہماری مدد سے انگریزوں نے جس کو پسند کیا وہ مقام فتح کر لیا۔ اس کے لیے ہم میں سے ہزاروں ہندوستانی جوانوں کو قربانی دینی پڑی، لیکن ہم نے کبھی نہ کوئی معذرت کی یا بہانہ بنایا اور نہ ہی کبھی بغاوت کی......

لیکن 1857 میں انگریزوں نے یہ حکم جاری کیا کہ نئے کارتوس اور بندوقیں جو انگلینڈ سے یہاں پہنچی تھیں ہمیں دی جائیں گی۔ ان میں سے پہلی چیز یعنی کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی ملی ہوئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ گیہوں کے آٹے میں ہڈیوں کا پاؤڈر ملا کر کھلایا جا رہا تھا حتیٰ کہ یہ اشیا ہر ایک پیدل فوج، گھوڑ سوار اور توپ خانہ رجمنٹ میں تقسیم کر دی گئیں......

انھوں نے یہ کارتوس تھرڈ لائٹ کیویلری کے سواروں (گھوڑ سوار فوجی) کو دیے اور انھیں ان کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کا حکم دیا۔ فوجیوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ کبھی بھی ان کو دانتوں سے نہیں کاٹیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا مذہب اور عقیدہ تباہ ہو جائے گا...... اس

پر انگریز افسروں نے تین رجمنٹوں کے جوانوں کی پریڈ کرادی۔ 1400 انگریز فوجی اور یوروپین کی دیگر بٹالین کے فوجی اور گولا انداز گھوڑ سواروں نے ان کو گھیر لیا۔ ہر پیدل رجمنٹ کے سامنے چھ توپیں رکھ دی گئیں۔ یہ توپیں چھرّوں سے بھری ہوئی تھیں اور 84 نئے فوجیوں کو گرفتار کرلیا گیا اوران کو لوہے کی بیڑیوں میں ڈال کر جیل میں ڈال دیا گیا...... چھاؤنی کے سواروں کو اس وجہ سے جیل میں ڈال دیا گیا تھا تا کہ ہم خائف ہوکر نئے کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے لگیں۔ اس واسطے ہم اور ہمارے ملک کے لوگ ایک ساتھ متحد ہوکر اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے انگریزوں سے جنگ کریں۔ ہمیں دوسال تک جنگ جاری رکھنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ مذہب اور عقیدے کے سوال پر جو راجہ اور سردار ہمارے ساتھ تھے وہ ابھی تک ہمارے ساتھ ہیں اور تمام قسم کی تکالیف برداشت کی ہیں۔ ہم دوسال تک اس لیے لڑے تھے تا کہ ہمارا عقیدہ اور مذہب پراگندہ نہ ہو۔ اگر ایک ہندو یا مسلمان کا مذہب ضائع ہوگیا تو دنیا میں کیا باقی رہے گا؟

اس عرضی میں جو اسباب فوجی بغاوت کے لیے بیان کیے گئے ہیں ان کا موازنہ تعلقہ دار (ماخذ 3) کے ذریعہ بیان کیے گئے اسباب کے ساتھ کیجیے۔

3.2 ظلم وتعدی کی علامات کے خلاف
(Against the symbols of oppression)

ان اعلانات میں برطانوی حکومت (یا جسے باغی ''فرنگی راج'' کہتے تھے) سے وابستہ ہر چیز کو پوری طرح مسترد کردیا۔ انگریزوں کے ذریعہ کیے گئے ریاستوں کے الحاق کے لیے اور معاہدوں کو توڑنے کے لیے باغیوں نے انگریزوں کی ملامت کی۔ باغی لیڈروں کا کہنا تھا کہ انگریزوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

لوگوں کو اس بات پر غصہ تھا کہ کس طرح زمین مال گزاری تصفیوں نے چھوٹے اور بڑے دونوں طرح کے زمین مالکان کو بے دخل کردیا تھا اور غیر ملکی کاروبار نے دست کاروں اور بنکروں کو تباہی و بربادی کے غار میں دھکیل دیا تھا۔ برطانوی حکومت کے ہر پہلو پر حملہ کیا جاتا تھا۔ فرنگیوں پر طرز زندگی کو تباہ کرنے کا الزام لگایا جاتا تھا جس سے وہ مانوس تھے اور جسے عزیز رکھتے تھے۔ باغی اپنی اس دنیا کی بحالی چاہتے تھے۔

یہ اعلانات ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذات اور مذہب کو تباہ و برباد کرنے اور انھیں عیسائی بنانے کے عام خوف کو ظاہر کرتے تھے۔ یہ خوف اس زمانے میں گشت کرنے والی بہت سی افواہوں میں یقین کا نتیجہ تھا۔ لوگوں سے اصرار تھا کہ وہ مجتمع ہوجائیں اور اپنی طرز زندگی، مذہب، عزت اور شناخت کو بچانے کے لیے لڑیں۔ یہ جنگ ''وسیع عوامی بھلائی'' کی لڑائی تھی۔

بہت سے مقامات پر انگریزوں کے خلاف بغاوت ان تمام لوگوں پر حملے کی وسیع صورت اختیار کرلیتی تھی جو انگریزوں کے اتحادی یا مقامی طور پر ظالم کی شکل میں دیکھے جاتے تھے، اکثر باغی

شہر کے چند طبقے کو قصداً ذلیل کرنے کا موقع حاصل کر لیتے تھے۔ گاؤں میں انھوں نے مہاجنوں کے بہی کھاتوں کو جلایا اور ان کے گھروں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ یہ کوشش اس بات کی مظہر تھی کہ باغی روایتی نظام مراتب کو ختم کر دینا چاہتے تھے، باغی تمام ظالموں کے خلاف تھے۔ یہ کوشش ایک متبادل تصویر کی جھلک پیش کرتی ہے شاید اس میں ایک سے زیادہ مساوات میں یقین رکھنے والے سماج کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس طرح کی تصویر اعلانات میں واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی جن میں ''فرنگی راج'' کے خلاف تمام سماجی گروہوں کو متحد کرنا مطلوب تھا۔

3.3 متبادل سیاسی اقتدار کی تلاش
(The search for alternative power)

ایک دفعہ برطانوی حکومت گر گئی تو باغیوں نے دہلی، لکھنؤ اور کان پور جیسے مقامات پر ایک طرح کے اقتدار کے ڈھانچے اور نظم و نسق کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ بے شک یہ نظم و نسق ناپائیدار تھا لیکن یہ کوشش ظاہر کرتی ہے کہ باغی قیادت اٹھارھویں صدی کی انگریزوں سے قبل کی دنیا بحال کرنا چاہتی تھی اس لیے لیڈران نے ماضی کے درباری تمدن کی طرف رخ کیا۔ مختلف عہدوں پر تقرریاں کی گئیں۔ زمین مال گزاری کی وصولیابی اور فوجیوں کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے انتظامات کیے گئے۔ لوٹ مار اور غارت گری روکنے کے احکامات جاری کیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزوں کے خلاف لڑائی جاری رکھنے کے منصوبے بھی تیار کیے گئے۔ فوج میں کمان کی زنجیر یا سلسلہ قائم کیا گیا۔ ان تمام کوششوں میں باغی اٹھارھویں صدی کی مغل دنیا کی طرف پیچھے جا رہے تھے جو ایک ایسی دنیا تھی جو تمام چیزوں کا مظہر بن گئی تھی جس کو وہ کھو چکے تھے۔

باغیوں کے ذریعہ قائم انتظامی ڈھانچوں کا بنیادی مقصد جنگ کی ضروریات کو پورا کرنا تھا تاہم زیادہ تر معاملات میں یہ ڈھانچے انگریزوں کے کشت و خون کی کارروائی میں زندہ نہیں رہ سکتے تھے، لیکن اودھ میں جہاں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کافی طویل ہو گئی وہاں لکھنؤ کے دربار میں جوابی حملے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے اور 1857 کے آخری مہینوں اور 1858 کے ابتدائی حصے میں افسر شاہی نظام (درجہ بندی پر مبنی) قائم کیا گیا تھا۔

بحث کیجیے

آپ کے خیال میں، باغیوں کے نقطۂ نظر کو از سرِ نو تعمیر کرنے میں مؤرخین کو کون سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

4. انسداد (REPRESSION)

1857 سے متعلق ہمارے پاس جتنی بھی رودادیں ہیں ان تمام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انگریزوں کے لیے بغاوت کو دبانا آسان ثابت نہیں ہوا۔

شمالی ہند کو از سرِ نو تسخیر کرنے کے لیے فوجی دستوں کو روانہ کرنے سے قبل انگریزوں نے

بغاوت کوفرو کرنے کے لیے فوجیوں کی مدد کے واسطے قوانین کا مربوط سلسلہ منظور کیا۔ مئی اور جون 1857 میں منظور کیے گئے متعدد ضابطہ قوانین (acts) کے ذریعہ نہ صرف پورے شمالی ہند ... میں مارشل لا لگا دیا گیا بلکہ فوجی افسران اور یہاں تک کہ عام انگریزوں کو بھی ان ہندو... کو جن پر بغاوت کرنے کا شبہہ تھا سزا دینے کا اختیار دے دیا گیا۔ بالفاظ دیگر قانون اور مقدمہ کا عمل موقوف کر دیا گیا اور یہ سعی کی گئی تھی کہ بغاوت کی صرف ایک ہی سزا ہو سکتی تھی۔ موت۔

ان نئے مخصوص قوانین اور برطانیہ سے منگائی گئی امدادی فوج سے لیس انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے کا کام شروع کر دیا۔ باغیوں کی طرح وہ بھی دہلی کی علامتی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے لہٰذا انگریزوں نے دوطرفہ حملہ کیا۔ دہلی کو فتح کرنے کے لیے ایک فوج نے کلکتہ سے تو دوسری نے پنجاب کی طرف سے شمالی ہندوستان کی طرف کوچ کیا جو بڑے پیمانے پر پُرامن تھا۔ انگریزوں کی دہلی کو از سر نو فتح کرنے کی جو 1857 کی ابتدا میں سنجیدہ کوششیں شروع ہوئیں، آخر کار ستمبر کے اواخر میں شہر پر قبضہ کیا جا سکا۔ دونوں طرف سے زبردست جنگ اور نقصان ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ واقعتاً پورے شمالی ہند سے باغی دارالخلافہ کی حفاظت کرنے کے لیے دہلی میں آ گئے تھے۔

ماخذ 7

باغی اہل دیہات
(Villagers as rebels)

اودھ کے دیہی علاقے سے ایک افسر نے لکھا تھا:

اودھ کے لوگ شمالی ہند سے خبر رسانی کے رابطوں کو دبانے کے لیے بتدریج شدید دباؤ بنا رہے ہیں......اودھ کے لوگ دیہاتی ہیں......ان گاؤں کے لوگوں کو یوروپین نزدیک سے چھو بھی نہیں سکتے۔ وہ لوگ ان کے سامنے ایک دم بکھر جاتے ہیں اور پھر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ انتظامی عہدے داران نے ان گاؤں والوں کے متعلق اطلاع دی ہے کہ ان کی تعداد مع بندوقوں کے بہت زیادہ ہے۔

اس بیان کے مطابق گاؤں والوں کے خلاف کارروائی کرنے میں انگریزوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔
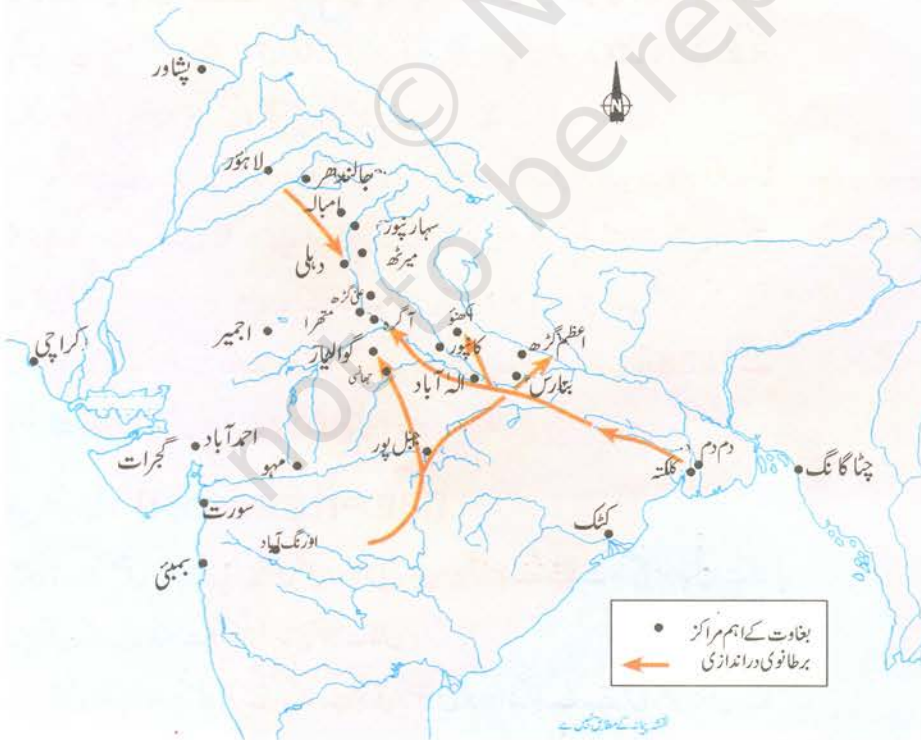
نقشہ 2
نقشے میں بغاوت کے اہم مراکز دکھائے گئے ہیں اور باغیوں کے خلاف انگریزوں کے حملے کے راستوں کو بھی دکھایا گیا ہے۔

شکل11.8
دھلی کی پہاڑیوں پر واقع ایک جامع مسجد،فیلس بی ریتو کے ذریعہ لیا گیا فوٹو گراف 58-1857۔
1857 کے بعد برطانوی فوٹوگرافروں نے غارت گری اور مسماری کی لاتعداد تصاویر کھینچی تھیں۔

گنگا کے میدان میں بھی انگریزوں کی از سرِنو فتح کا سلسلہ مدھم رہا۔ فوجوں کو ایک گاؤں کے بعد دوسرے گاؤں کو فتح کرنا تھا۔ دیہات اور اس کے اطراف کے لوگ پوری طرح دشمن تھے۔ جوں ہی انھوں نے اپنی بغاوت مخالف کارروائی شروع کی انگریزوں کو اندازہ ہو گیا کہ ان کا واسطہ صرف فوجی بغاوت سے ہی نہیں ہے بلکہ اس شورش سے ہے جس کو زبردست عوامی حمایت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر اودھ میں فارسیتھ (Forsyth) نامی انگریز افسر کا اندازہ تھا کہ تین چوتھائی بالغ مرد آبادی بغاوت میں شامل تھی۔ یہ علاقہ طویل لڑائی کے بعد 1858 میں انگریزوں کے کنٹرول میں آیا۔

انگریزوں نے بہت بڑے پیمانے پر فوجی طاقت کا استعمال کیا تھا۔ لیکن صرف یہ ہی ایک آلہ نہیں تھا جس کا انھوں نے استعمال کیا ہو۔ موجودہ اتر پردیش کے بڑے حصے میں زمین مالکان اور کسانوں نے مل کر انگریزوں سے متحدہ مزاحمت کی۔ انگریزوں نے اس اتحاد کو توڑنے کی کوشش میں بڑے زمین مالکان سے وعدہ کیا کہ ان کی جاگیریں واپس کر دی جائیں گی۔ باغی زمین مالکان کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا اور وفادار زمین مالکان کو انعامات دیے گئے۔ بہت سے زمین مالکان انگریزوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے یا وہ بھاگ کر نیپال چلے گئے جہاں وہ بیماری یا فاقہ زدگی سے مر گئے۔

شکل11.9
فیلس بی ریتو کے ذریعہ لیا گیا فوٹو گراف 1858
یہاں ہمیں ایک زمانے میں نواب واجد علی شاہ کے ذریعہ تعمیر کیے گئے عشرت باغ کے مسمار کھنڈرات میں چار یک وتنہا انسانی شبیہہ نظر آ رہی ہیں۔ 1857 میں اس مقام کے قابض 2000 سے زیادہ باغی سپاہیوں کو کیمپ بیل کی قیادت میں برطانوی فوجوں نے مار ڈالا۔ زمین پر بکھرے پڑے انسانی پنجر بغاوت کے بے نتیجہ ہونے کی سردوارننگ دے رہے ہیں۔

5. بغاوت کی تصاویر
(IMAGES OF THE REVOLT)

ہم اس بغاوت کے بارے میں باغیوں کی سرگرمیوں سے متعلق اوراس کے انسداد کے اقدامات کے متعلق جن پر بحث کررہے ہیں کیسے جان سکتے ہیں؟

باغیوں کے نقطۂ نظر کے تعلق سے ہمارے پاس بہت کم دستاویزات ہیں البتہ باغیوں کے چند اعلانات اور اشتہارات ہیں اوراس کے ساتھ ہی باغی لیڈران کے چند خطوط موجود ہیں، لیکن اب تک مورخین انگریزوں کے ذریعہ لکھی گئی روداد کی روشنی میں ہی باغیوں کی کارروائیوں پر بنیادی طور پر مسلسل بحث کرتے آرہے ہیں۔

بے شک سرکاری دستاویزات کثرت سے موجود ہیں جیسے نوآبادیاتی انتظام کاروں اورفوجی افراد نے اپنے خطوط، ڈائریوں، خودنوشت سوانح عمریوں اورسرکاری تاریخوں میں اپنے بیانات چھوڑے ہیں۔ غیر رسمی خطوط، رقعات (نوٹس)، حالت کی تشخیص اور پیش کی گئی رپورٹوں کے ذریعہ سرکاری میلان خاطر اورانگریزوں کے بدلتے رویے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بہت سے ریکارڈوں کو ''فوجی بغاوت کے ریکارڈ'' پرمبنی کئی جلدوں میں یکجا کیا جاچکا ہے۔ یہ دستاویزات ہمیں افسران کے خوف واضطراب نیز باغیوں کے تئیں اُن کے تصور کے متعلق بتاتی ہیں۔ برطانوی اخبارات ورسائل میں بغاوت کی جو کہانیاں شائع ہوئی ہیں اُن میں فوجی باغیوں کے تشدد کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں یہ کہانیاں عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرتی تھیں نیز انتقام اورجوابی کاروائی کے لیے اکساتی تھیں۔

انگریزوں اورہندوستانیوں کے ذریعہ تیارکردہ پینٹنگ، پنسل سے بنی ڈرائنگ، تیزابی نقش نگاری، پوسٹر، کارٹون اور بازار پرنٹس وغیرہ اس فوجی بغاوت کے اہم ریکارڈ ہیں۔ آیئے ان میں سے کچھ پرغورکریں اوردیکھیں کہ وہ ہمیں کیا بتاتی ہیں۔

5.1 نجات دہندوں کی ستائش (Celebrating the saviours)

برطانوی تصاویر شبیہوں کا ایک تنوع پیش کرتی ہیں جس کا مقصد مختلف طرح کے جذبات اور ردعمل کو برانگیختہ کرنا تھا۔ ان میں سے بعض میں انگریزوں کو بچانے اور باغیوں کو کچلنے والے انگریز ہیرو کی یادیں تازہ کی گئی ہیں۔ 1859 میں تھامس جونس بارکر کے ذریعہ بنائی گئی پینٹنگ ''ریلیف آف لکھنؤ'' (لکھنؤ کی امداد)، اس قسم کی ایک مثال ہے۔ جب باغی فوجوں نے لکھنؤ کا محاصرہ کرلیا تھا تو لکھنؤ کے کمشنر ہنری لارنس نے عیسائی آبادی کو مجتمع کیا اورانتہائی قلعہ بند ریزیڈنسی میں پناہ لی

شکل 11.10
تھومس جونس بارکر کے ذریعہ بنائی گئی "ریلیف آف لکھنؤ" نامی تصویر 1859

تھی۔ لارنس مارا گیا لیکن کرنل انگلس کی کمان کے تحت ریزیڈنسی محفوظ رہی۔ 25 ستمبر کو جیمس اوٹرام اور ہنری ہیولوک وہاں پہنچے، انھوں نے باغی فوجوں کا قلع قمع کر دیا اور برطانوی محافظ فوج کو کمک پہنچائی۔ 20 دن بعد کولن کیمپ بیل جو ہندوستان میں برطانوی افواج کا نیا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا، اپنی افواج کے ساتھ یہاں پہنچا اور برطانوی محافظ افواج کو محاصرہ سے آزاد کرایا۔ برطانوی بیانات میں لکھنؤ کا محاصرہ بقائے زندگی، بہادرانہ مزاحمت اور برطانوی حکومت کی قطعی فتح مندی کی کہانی بن گیا۔

بارکر کی پینٹنگ کیمپ بیل کے داخلہ کے لمحات کے جشن کو دکھاتی ہے۔ کینوس کے وسط میں برطانوی ہیرو کیمپ بیل، اوٹرام اور ہیولاک کی شبیہیں ہیں، ان کے اردگرد کھڑے لوگوں کے ہاتھوں کے اشارے کو دیکھنے پر تماشائی کی نگاہ تصویر کے مرکز کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ یہ ہیرو میدان میں کھڑے ہیں جہاں کافی اجالا ہے، آگے کی طرف پرچھائیں ہے اور پس منظر میں تباہ شدہ ریزیڈنسی دکھائی دیتی ہے۔ تصویر کے اگلے حصے میں پڑے مردہ زخمی لوگ، محاصرے کے دوران کی مصیبت کا ثبوت ہیں جبکہ میدان کے وسط میں گھوڑوں کی فتح یاب شبیہیں اس حقیقت پر زور دیتی ہیں کہ برطانوی اقتدار اور کنٹرول دوبارہ قائم ہو چکا ہے۔ اس نوعیت کی تصاویر سے انگریز عوام میں تسکین آمیزی پیدا ہوتی تھی نیز ان میں یہ شعور پیدا ہوتا تھا کہ پریشانی کا وقت قصہ پارینہ بن چکا ہے اور بغاوت ختم ہو چکی نیز انگریز فاتح بن چکے ہیں۔

5.2 انگریز خواتین اور برطانیہ کا وقار (English women and the honour of Britain)

اخباروں کی رپورٹیں عوام کے تخیل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ واقعات کے تئیں لوگوں کے جذبات اور رویے کو ایک شکل دیتی ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے خلاف ہونے والے تشدد کی کہانیوں سے مشتعل ہو کر بطور خاص برطانیہ میں انتقام لینے کے لیے عوامی مطالبہ ہونے لگا۔ انگریز حکومت سے معصوم خواتین کے وقار کی حفاظت اور بے یار و مددگار بچوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرنے لگے۔ صدمے اور مصیبت کی ان کی بصری نمائندگی کے ذریعہ آرٹسٹوں نے ان جذبات کو ظاہر کیا مزید برآں ایک شکل بھی دی۔

فوجی بغاوت کے دو سال بعد جوزف نوئل پیٹون نے ''ان میموریم'' (یادیں) نامی تصویر (تصویر 11.11) بنائی جس میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ انگریز عورتیں اور بچے گھبرائے ہوئے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں، بے یار و مددگار اور معصوم، بظاہر ناگزیر حالت میں — بے عزتی، تشدد

شکل 11.11
جوزف نوئل پیٹون کے ذریعہ 1859 میں بنائی گئی تصویر "ان میموریم"

اور موت کا انتظار کرتے ہوئے۔ ''ان میموریم'' میں خون آلود تشدد نظر نہیں آتا۔ اس کی طرف یہ تصویر صرف خیال دلاتی ہے، یہ تماش بین کے تخیل کو جوش میں لاتی ہے اور جنون کو اکسانے کے درپے نظر آتی ہے۔ یہ باغیوں کی نمائندگی ایک متشدد اور وحشی کے طور پر کرتی ہے اگرچہ وہ تصویر میں نظر نہیں آتے۔ پس منظر میں برطانوی مددگار فوج کو محافظ کے بطور آتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

شکل 11.12
کان پور میں مس وھیلر سپاہیوں سے اپنی حفاظت کرتے ہوئے۔

دیگر خاکوں اور تصاویر کے مجموعہ میں ہم کو عورتیں مختلف انداز میں نظر آتی ہیں۔ وہ بہادرانہ انداز میں باغیوں کے حملے سے خود کو بچاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ تصویر 11.12 کے، مرکز میں مس وھیلر ثابت قدمی کے ساتھ کھڑی ہیں اور اپنی عزت کی حفاظت کے لیے اکیلے ہی باغیوں پر جان لیوا حملہ کر رہی ہیں۔ اس طرح کی نمائندگی کرنے والی تمام تصاویر کی طرح یہاں بھی باغیوں کو جن بھوتوں کی طرح دکھایا گیا ہے۔ یہاں چار ہٹے کٹے آدمیوں کے ہاتھوں میں تلوار اور بندوق لیے ایک عورت پر حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہاں اپنی عزت اور زندگی کی بقا کے لیے ایک عورت کی جدوجہد کے ذریعہ فی الحقیقت ایک گہری مذہبی تعبیر کی نمائندگی کی گئی ہے۔ یہ عیسائیت کے وقار کی بقا کی جنگ ہے، تصویر میں فرش پر پڑی ہوئی کتاب بائبل ہے۔

شکل 11.13
جسٹس، پنچ، 12 ستمبر 1857 تصویر کے نیچے پینڈہ پر یہ پڑھا جاسکتا ہے'' کان پور میں ہونے والے وحشت ناک قتل عام کی خبر نے پورے انگلینڈ میں بدلہ لینے کے لیے سرکش خواہش اور آتشی غصہ کا طوفان پیدا کر دیا ہے۔''

5.3 انتقام اور بدلہ (Vengeance and retribution)

جوں جوں برطانیہ میں غصہ اور صدمے کی لہریں پھیلیں ویسے ہی بدلہ لینے کے، لیے مطالبہ بلند ہوتا گیا۔ بغاوت کے متعلق بصری تصاویر اور خبروں نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس میں انسداد اور انتقام دونوں کو واجب کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ یہ ایسا تھا گویا انصاف کے مطالبہ کے لیے برطانوی وقار اور اقتدار کو ملنے والے چیلنج کو بے رحمی سے کچلنا ضروری ہو۔ بغاوت سے خوفزدہ انگریزوں کو محسوس ہوا کہ انھیں اپنی ناقابل تسخیر شبیہہ کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ایسی ہی ایک شبیہہ (تصویر 11.13) میں ہمیں ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ڈھال لیے انصاف کی ایک

مثالی تصویر نظر آتی ہے۔ اس کا انداز حملہ آورانہ ہے، اس کے چہرے سے غصہ اور بدلے کے لیے خواہش ظاہر ہوتی ہے۔ وہ سپاہیوں کو اپنے پیروں سے روندرہی ہے جب کہ ہندوستانی اور بچوں کی بھیڑ خوف سے جھکی جارہی ہے۔

شکل 11.14
تصویر کے نیچے پینده پریہ پڑھا جاسکتا ھے "بنگال ٹائیگرسے برطانوی شیر کا انتقام" ،پنچ 1857 تصویر سے کیا خیال سامنے آتا ھے؟

شیراور چیتے کی تصویروں کے ذریعہ کیا ظاہر کیا گیا ہے؟ عورت اور بچے کی تصویر کیا بیان کرتی ہے؟

5.4 دہشت کا مظاہرہ (The performance of terror)

انتقام اور بدلے کا اصرار اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ باغیوں کو کتنے ظالمانہ طریقے سے پھانسیاں دی گئیں۔ انھیں توپوں سے اُڑادیا گیا یا پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔ ان کی پھانسی کی سزاؤں کی تصاویر وسیع پیمانے پر مقبول عام رسائل میں شائع کی گئیں۔
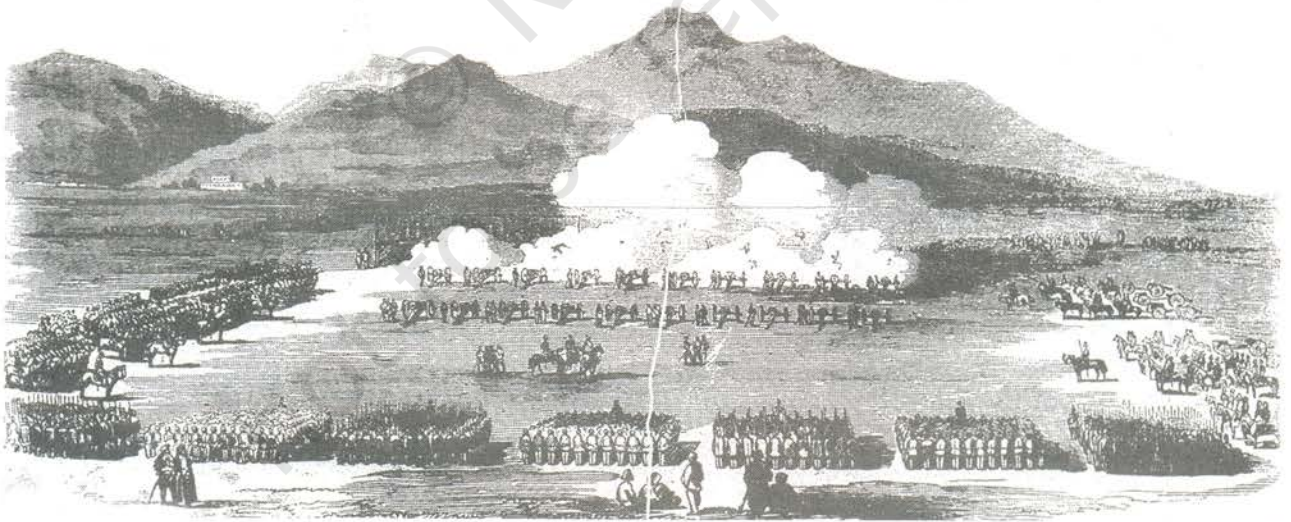
شکل 11.15
"پشاور میں فوجی باغیوں کی ہلاکت، توپ سے اڑاتے ہوئے۔" السٹریٹڈ لندن نیوز، 3 اکتوبر 1857
گردن ماری کے اس منظر میں ڈرامے کا اسٹیج دکھائی دیتا ہے جہاں ڈرامہ انجام دیا گیا— ظالمانہ اقتدار کا ایک ڈرامائی منظر، پورے منظر میں باوردی گھوڑسوار فوجی اور سپاہی غالب ہیں۔ انھیں اپنے ساتھی سپاہیوں کی گردن ماری دیکھنی ہے اور بغاوت کے آزردہ نتائج کا تجربہ کرنا ہے۔ برطانوی پریس میں لاتعداد دیگر تصاویر اور کارٹون بھی تھے جو ظالمانہ انسداد اور پرتشدد انتقامی کارروائی کی تصدیق کرتے ہیں۔
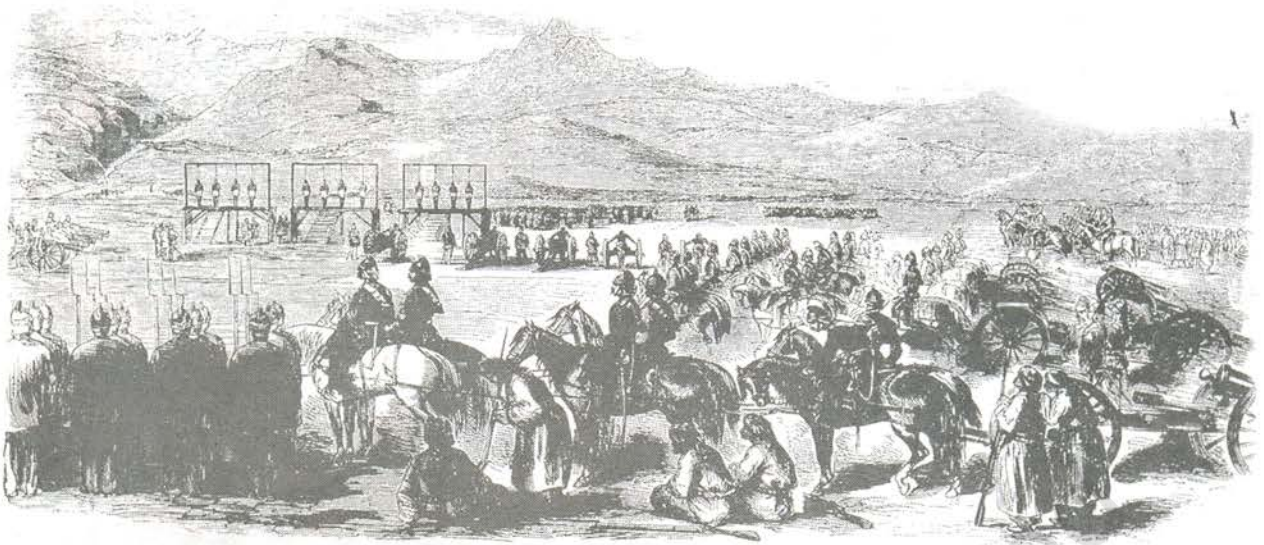
شکل 11.16

پشاور میں باغی سپاهیوں کی هلاکت، السٹریٹڈ لندن نیوز، 3 اکتوبر 1857

ہلاکت کے اس منظر میں 12 باغی ایک قطار میں لٹکے ہوئے ہیں اور چاروں جانب توپیں تعینات ہیں۔ کیا آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ معمول کی سزا نہیں ہے، یہ دہشت کا مظاہرہ ہے۔ اس کے ذریعہ لوگوں کے اندر خوف پیدا کرنا ہے کہ سزا کسی احاطہ بند جگہ پر احتیاط سے نہیں دی جا سکتی تھی اس کو ڈرامائی انداز میں کھلی جگہ پر پیش کرنا ضروری تھا۔

5.5 رحم کے لیے وقت نہیں (No time for clemency)

جب انتقام کے لیے شور و غوغا ہو رہا تھا اس وقت اعتدال پسندی کے لیے لوگ مضحکہ خیز بن کر رہ جاتے تھے۔ جب گورنر جنرل کننگ نے اعلان کیا کہ نرمی اور رحم دلی کے مظاہرے سے سپاہیوں کی وفاداری دوبارہ جیتنے میں مدد ملے گی۔ اس بات کے لیے برطانوی پریس میں اس کا مذاق اُڑایا گیا۔

ایک طنز و مزاح کے برطانوی رسالے پنچ (Punch) کے صفحات میں شائع ایک کارٹون میں کننگ کو ایک لچکدار (نیک) باپ کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ اس کا محافظ ہاتھ ایک سپاہی کے سر پر ہے جو ابھی تک ایک ہاتھ میں بے نیام تلوار اور دوسرے ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے ہے۔ دونوں سے خون ٹپک رہا ہے (تصویر 11.17)۔ یہ ایسے تصورات تھے جو اس وقت کی متعدد تصاویر میں بار بار آتے ہیں۔

THE CLEMENCY OF CANNING.

شکل 11.17

"کننگ کی نرم دلی"، پنچ، 24 اکتوبر 1857

کارٹون کے نیچے پینده میں آپ پڑھ سکتے ہیں "گورنر جنرل: خوب، پھر وہ اسے غلیظ بندوقوں سے نہیں اُڑائیں گے لیکن وہ ایک اچھا کم سن سپاہی بننے کا یقینی وعدہ کرے"۔

5.6 قوم پرست خیالی تصویر (Nationalist imageries)

بیسویں صدی میں قومی تحریک نے 1857 کے واقعات سے تحریک اخذ کی۔قومی تصورات کی ایک پوری دنیا بغاوت کے اردگرد بُن دی گئی۔اس کو پہلی جنگ آزادی کے طور پر بطور جشن منایا گیا۔جس میں ہندوستان کی عوام کے ہر طبقے کے لوگوں نے مل کر سامراجی حکومت کے خلاف لڑائی لڑی۔

تاریخی تحریروں کی طرح ہی آرٹ اورادب نے بھی 1857 کی یادکوزندہ رکھنے میں مدد کی۔ بغاوت کے لیڈران کو بہادر ہستیوں کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا جو ملک کو میدان جنگ کی طرف لے جارہے تھے۔لوگوں کوظالمانہ سامراجی حکومت کے خلاف راست باز برہمی کو بیدار کرنے کے لیے پیش کیا گیا۔ایک ہاتھ میں تلوار لیےاوردوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام پکڑے اپنے مادروطن کی آزادی کے لیےلڑائی لڑنے والی رانی کی بہادری کے متعلق اوالعزمانہ نظمیں لکھی گئیں۔جھانسی کی رانی کوایک ایسی طاقتور مردانہ شخصیت کے طور پر جودشمنوں کا تعاقب کرتے ہوئے، برطانوی فوجیوں کوقتل کرتے ہوئے اور مردانہ وار آخری دم تک لڑتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ہندوستان کے مختلف حصوں میں بچے سبھدرا کماری چوہان کا مصرعہ ''خوب لڑی مردانی وہ توجھانسی والی رانی تھی۔'' پڑھتے ہوئے بڑے ہورہے تھے۔مقبول عام تصویروں میں رانی لکشمی بائی کی عموماً جنگی لباس (زرہ پوش)، ہاتھ میں تلوار لیے،گھوڑے پرسوارتصویرکشی کی جاتی ہے—یہ ناانصافی اورغیرملکی حکومت کے خلاف مزاحمت کے مصمم ارادہ کی علامت ہے۔
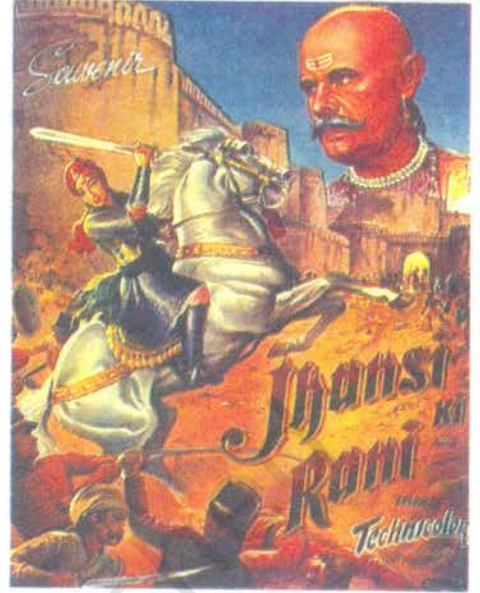
شکل 11.18
فلموں اور پوسٹروں نے رانی لکشمی بائی کی ایک طاقت ور مردانہ سورما کی شبیہ بنانے میں مدد کی

ان تصاویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بنانے والے جومصور تھے وہ ان واقعات کوکیا سمجھتے تھے؟ وہ کیا محسوس کرتے تھے اوران کے مدنظر کیا ذہن نشین کرانا تھا۔تصاویر اور کارٹون کے ذریعہ ہم عوام کے متعلق خیال کرسکتے ہیں جو ان تصاویر کو دیکھتے تھے اور تعریف وتنقید کرتے تھے اوران کی نقول کو خرید کراورازسرنو تیار کرواکراپنے گھروں میں رکھتے تھے۔

یہ تصاویر جس دور میں تیار کی گئیں۔اس وقت کے جذبات واحساسات کی ہی ترجمانی نہیں کررہی تھیں بلکہ انھوں نے جذباتی معیار کوبھی ایک شکل دی۔برطانیہ میں شائع تصاویر کے ذریعہ بھرساعوام باغیوں کے انسداد کی انتہائی ظالمانہ سزا کی مانگ کررہی تھی۔دوسری طرف بغاوت کے قوم پرست خیالی تصورات قوم پرست تخیل کونئی شکل دینے میں مدد کررہے تھے۔

بحث کیجیے

اس سیکشن میں دی گئیں تصاویر کے ہرجز کی جانچ کیجیے اور بحث کیجیے کہ فن کار کے تناظر کی شناخت کرنے میں آپ کس طرح کی اجازت دیتے ہیں۔

ٹائم لائن

1801	اودھ میں ویلزلی کے ذریعہ امدادی معاہدہ متعارف ہوا
1856	نواب واجد علی شاہ کو معزول کیا گیا؛ اودھ کا الحاق
1856-57	انگریزوں کے ذریعہ اودھ میں جامع مال گزاری بندوبست کا آغاز
1857	
10 مئی	میرٹھ میں فوجی بغاوت کا آغاز
11-12 مئی	دہلی شہر کی محافظ فوج کی بغاوت: بہادر شاہ ظفر کا برائے نام قیادت قبول کرنا
20-27 مئی	علی گڑھ، اٹاوہ، مین پوری، ایٹہ میں سپاہیوں کی بغاوت
30 مئی	لکھنؤ میں شورش
مئی-جون	فوجی بغاوت کا عوام کی عام بغاوت میں تبدیل ہونا
30 جون	چنہاٹ کی جنگ میں انگریزوں کی شکست
25 ستمبر	ہیولاک اور اولٹرام کی قیادت میں برطانوی افواج کا لکھنؤ ریزیڈنسی میں داخلہ
جولائی	جنگ میں شاہ مل کی موت
1858	
جون	جنگ میں رانی جھانسی کی موت

100 سے 150 لفظوں میں جواب دیجیے۔

1۔ بہت سے مقامات پر باغی سپاہیوں نے پرانے حکمرانوں سے بغاوت کی قیادت مہیا کرانے کے لیے کیوں اصرار کیا؟

2۔ ان شواہد کے بارے میں بحث کیجیے جو باغیوں کی طرف سے منصوبہ بندی اور ہم آہنگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

3۔ بحث کیجیے کہ کس حد تک مذہبی عقائد نے 1857 کے واقعات کو ایک شکل دی تھی؟

4۔ باغیوں کے درمیان اتحاد کو یقینی بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئیں؟

5۔ انگریزوں نے بغاوت و سرکشی کو کچلنے کے لیے کیا اقدام کیے؟

شکل 11.19
باغیوں کے چہرے

مندرجہ ذیل پر ایک مختصر مضمون (تقریباً 250 سے 300 پر مشتمل) لکھیے:

6۔ خاص طور پر اودھ میں بغاوت دور دور تک کیوں پھیلی ہوئی تھی؟ کسان، تعلقہ دار، اور زمین دار بغاوت میں شامل ہونے کے لیے کیوں آمادہ تھے؟

7۔ باغی کیا چاہتے تھے؟ مختلف سماجی گروہوں کی بصارت میں کس حد تک فرق تھا؟

8۔ 1857 کے متعلق بصری نمائندگی (تصویریں) ہمیں کیا بتاتی ہیں؟ مورخین ان تصاویر کا تجزیہ کس طرح کرتے ہیں؟

9۔ اس باب میں پیش گوئی سے بھی دو ماخذ، ایک تصویری اور ایک اصل کتابی متن کی جانچ کیجیے اور بحث کیجیے کہ یہ فاتح اور مفتوح کے نقطہ نظر کی کس طرح ترجمانی کرتے ہیں؟

نقشہ کا کام

10۔ ہندوستان کے نقشے پر کلکتہ (کولکاتہ) بمبئی (ممبئی) اور مدراس (چنئی) کو نشان زد کیجیے جو 1857 میں برطانوی اقتدار کے تین اہم مرکز تھے۔ نقشہ نمبر 1 اور 2 کی طرف رجوع کیجیے اور ان علاقوں کو نشان زد کیجیے جہاں بغاوت سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر تھی۔ یہ علاقے نوآبادیاتی شہروں سے کتنے قریب اور کتنے دور تھے؟

پروجیکٹ (کوئی ایک)

11۔ 1857 کی بغاوت کے لیڈروں میں سے کسی ایک کی سوانح عمری پڑھیے۔ سوانح نگار کے ذریعہ استعمال کیے گئے ماخذوں کا جائزہ لیجیے۔ کیا ان میں سرکاری رپورٹوں، اخباری بیانات، علاقائی زبان کی کہانیوں، بصری مواد یا کسی اور چیز کو شامل کیا گیا ہے۔ کیا سبھی ماخذ ایک جیسی بات کہتے ہیں یا ان میں اختلافات پائے جاتے ہیں؟ اپنے نتیجہ تحقیقات پر ایک رپورٹ تیار کیجیے۔

12۔ 1857 پر بنی کوئی ایک فلم دیکھیے اور بغاوت کو پیش کرنے کے طریقے کے متعلق لکھیے۔ اس میں انگریزوں، باغیوں اور ان لوگوں کو جو انگریزوں کے وفادار بنے رہے کی کس طرح تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ فلم کسانوں، شہری باشندوں، قبائلیوں، زمین داروں اور تعلقہ داروں کے متعلق کیا کہتی ہے؟ فلم کس قسم کے ردعمل کو ابھارنے کی کوشش کرتی ہے۔

مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

گوتم بھدرا، 1987،
فورری بیل آف ایٹین ففٹی سیون،
سب آلٹرن اسٹڈیز، IV
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی

رودرانگشو مکھر جی، 1984
اودھ ان ریوولٹ 58–1857
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی

تاپتی رائے، 2006
راج آف دی رانی،
پینگوئن، نئی دہلی

ایرک اسٹوکس، 1980 پیزینٹس اینڈ دی راج
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی

آپ مندرجہ ذیل ویب سائٹ پر رابطہ قائم کرسکتے ہیں:

http:// books.google.com
(انگریزوں کے ذریعہ تیار 1857 کی روداد کے لیے)
www.copsey-family.org/allenc/lakshmibai/links.html
(رانی لکشمی بائی کے خطوط کے لیے)

موضوع
بارہ

نوآبادیاتی شہر

شہرکاری، منصوبہ بندی اور فنِ تعمیر

اس باب میں ہم نوآبادیاتی ہندوستان میں شہرکاری کے عمل پر بحث، نوآبادیاتی شہروں کی ممتاز خصوصیات کی چھان بین اور ان کے اندر سماجی تبدیلیوں کی روش کو دیکھیں گے۔ اس ساتھ ہی مدراس (چنئی)، کلکتہ (کولکاتا) اور بمبئی (ممبئی) جیسے تین بڑے شہروں میں ترقی کے درجے کو نزدیک سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

یہ تینوں شہر بنیادی طور پر ماہی گیری اور کپڑا بنائی کے گاؤں تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی معاشی سرگرمیوں کے سبب یہ اہم تجارتی مراکز بن گئے۔ کمپنی کے ایجنٹ (گماشتے) 1639 میں مدراس اور 1690 میں کلکتہ میں آباد ہو گئے، بمبئی کو 1661 میں انگلینڈ کے بادشاہ نے کمپنی کو دے دیا تھا جس کو اس نے پرتگال کے بادشاہ سے اپنی بیوی کے جہیز کی صورت میں حاصل کیا تھا۔ کمپنی نے ان میں سے ہر ایک میں تجارتی اور انتظامی دفاتر قائم کیے۔

شکل 12.1
فورٹ سینٹ جارج کا جنوب مشرقی نظارہ، مدراس، تھامس اور ولیم ڈینیل کے ذریعہ تیار کردہ تصویر۔ اورینٹل سینری 1798 میں شائع ڈینیل کے ذریعہ بنائے گئے ایک خاکہ پر مبنی تصویر مال لے جاتے ہوئے یوروپی جہازوں کے افق میں نقطے نظر آرہے ہیں۔ پیش منظر میں ملکی کشتیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط تک یہ آبادیاں بڑے شہر بن گئے تھے، جہاں سے نئے حکمراں ملک کو کنٹرول کر رہے تھے۔ معاشی سرگرمیوں کو منضبط کرنے اور نئے حکمرانوں کے اقتدار کا مظاہرہ کرنے کے لیے ادارے قائم کیے گئے۔ ہندوستانیوں نے ان شہروں میں سیاسی غلبہ کے نئے طریقوں کا تجربہ کیا مداس، بمبئی اور کلکتہ کے خاکے (نقشے) ہندوستان کے پرانے شہروں سے کافی حد تک مختلف تھے۔ ان شہروں میں بنائی گئی عماتوں پر اپنے نوآبادیاتی اصل کے نشانات بنے تھے۔ عمارتیں کیا ظاہر کرتی ہیں اور فن تعمیر کیا ذہن نشین کرا سکتا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کے متعلق تاریخ کے طالب علم کو دریافت کی ضرورت ہے۔

یاد رکھیے کہ فن تعمیر پتھر، اینٹ، لکڑی یا پلاسٹر میں ہمارے خیالات کو ایک مخصوص شکل دینے میں مددگار ہوتا ہے۔ سرکاری آفیسر کے بنگلے اور امیر تاجر کے عالی شان مکان سے لے کر مزدور کے حقیر جھونپڑے تک عمارتیں سماجی تعلقات اور شناخت کو مختلف طریقوں سے ظاہر کرتی ہیں۔

1. نوآبادیاتی عہد سے پہلے قصبات اور شہر (Towns and Cities in Pre-colonial Times)

قبل اس کے کہ ہم نوآبادیاتی عہد میں شہروں کی نشوونما کی تحقیق کریں، برطانوی حکومت سے قبل کی صدیوں کے شہری مراکز پر نظر ڈالیں گے۔

1.1 قصبات کو ان کی شناخت کیسے دی گئی؟
(What gave towns their character?)

قصبوں کی تعریف اکثر شہری علاقوں کے مقابل کی جاتی ہے۔ یہ خاص قسم کی معاشی سرگرمیوں اور ثقافتوں کے نمائندہ بن کر سامنے آئے۔ دیہی علاقوں میں لوگ کاشت کاری، جنگل میں غذا کو جمع کرنے یا مویشی پالن کے ذریعہ گزر بسر کرتے تھے۔ اس کے برخلاف قصبات دست کاروں، تاجروں، انتظام کاروں اور حکمرانوں سے آباد تھے۔ قصبات کا دیہی آبادی پر تسلط ہوتا تھا اور وہ وزراعت سے حاصل زائد پیداوار اور ٹیکسوں پر پروان چڑھتے تھے۔ اکثر قصبات اور شہروں کی دیواروں کے ذریعہ قلعہ بندی کی جاتی تھی جو دیہی علاقوں سے ان کی علاحدگی کی علامت تھی۔

تاہم قصبوں اور دیہات کے درمیان علاحدگی سریع الحرکت تھی۔ کسان زیارت کے لیے طویل دوری تک سفر قصبوں سے گذرتے ہوئے کرتے تھے۔ قحط کے زمانہ کے دوران وہ قصبات میں یکجا ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انسانوں اور اشیا کا قصبات سے گاؤں کی طرف الٹا بہاؤ بھی

ماخذ 1

دیہی علاقوں کی طرف فرار (Escaping to the countryside)

1857 میں جب برطانوی فوجوں نے شہر پر قبضہ کر لیا تھا تو دہلی کے لوگ کیا سوچتے تھے اس کا تذکرہ مشہور شاعر مرزا غالب نے اس طرح کیا ہے:
دشمن کی سرزنش کرنے اور اسے ہانکنے سے قبل فاتحین (انگریزوں) نے سبھی سمتوں سے شہر کو تاخت وتاراج کر دیا۔ جو لوگ بھی سڑک پر پائے گئے انھیں کاٹ دیا گیا...... دو سے تین دن تک کشمیری گیٹ سے چاندنی چوک تک شہر کی ہر ایک سڑک جنگ کا میدان تھی۔ تین دروازے — اجمیری دروازہ ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ — ابھی تک باغیوں کے قبضے میں تھے...... اس کینہ پرور غصہ اور کینہ توز نفرت کے ننگے ناچ سے لوگوں کے چہرے کا رنگ غائب ہو گیا۔ مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی بھیڑ...... ان تین دروازوں سے بے تامل فرار ہو گئی۔ شہر کے باہر چھوٹے گاؤں اور درگاہوں میں پناہ حاصل کرنے لگی، وہ اپنی واپسی کے لیے ایسے ممکنہ مہربان وقت کے انتظار میں رہے جس میں وہ سانس لے سکیں۔

تھا۔ جب قصبات پر حملے ہوتے تو لوگ اکثر دیہی علاقوں میں پناہ حاصل کرتے تھے۔ تاجر اور پھیری والے قصبات سے اشیا لے جا کر گاؤں میں فروخت کرتے تھے اور بازاروں کی توسیع اور صَرف کے نئے نمونے پیدا ہوتے تھے۔

سولھویں اور سترھویں صدی کے دوران مغلوں کے ذریعہ تعمیر کردہ شہر اپنی آبادی کے اجتماع، اپنی عظیم الشان عمارتوں اور اپنے جاہ وجلال نیز اپنی خوشحالی کے لیے مشہور تھے۔ آگرہ، دہلی اور لاہور شاہی نظم ونسق اور کنٹرول کے اہم مراکز تھے۔ منصب دار اور جاگیردار کو جنھیں سلطنت کے مختلف حصوں میں وسیع زمینی قطعات تفویض کیے گئے تھے عموماً ان شہروں میں ذاتی مکانات تھے۔ اقتدار کے ان مراکز میں سطوت، امیر کے رتبہ کا مظہر تھی۔

یہاں بادشاہ اور امرا کی موجودگی کا مطلب وسیع طور پر خدمات فراہم کرنا تھا۔ دست کار امراطبقہ کے کنبے کے لیے مخصوص دست کاری اشیا بناتے تھے۔ شہری باشندوں اور فوج کے لیے دیہی علاقوں سے اناج شہر کے بازاروں میں لایا جاتا تھا۔ ریاست کا خزانہ بھی شاہی دارالخلافہ میں واقع تھا لہٰذا قلمرو کی مال گزاری بھی پابندی کے ساتھ یہاں آتی رہتی تھی۔ بادشاہ ایک قلعہ بند محل میں رہتا تھا اور شہر ایک دیوار کے ذریعہ احاطہ بند ہوتا تھا جو مختلف دروازوں کے ذریعہ داخلہ اور اخراج کے ساتھ منضبط کیا جاتا تھا۔ ان شہروں کے اندر باغات، مساجد، منادر، مقبرے، کالج، بازار اور کارواں سرائے ہوتی تھیں۔ شہر کے نقطہ ماسکہ کی واضح معین سمت محل اور جامع مسجد کی طرف ہوتی تھی۔

جنوبی ہند کے شہروں جیسے مدورائی اور کانچی پورم کا بنیادی مرکز مندر تھا۔ یہ شہر اہم تجارتی مراکز بھی تھے۔ مذہبی تہوار اکثر میلوں کے ساتھ ایک ہی وقت میں واقع ہوتے تھے۔ عموماً حکمراں

شکل 12.2
1857 میں شاہ جہان آباد (دہلی)
1857 کے بعد شہر کے چاروں طرف کی دیوار کو منہدم کر دیا گیا۔ لال قلعہ دریا کی طرف بنا ہے۔
دائیں طرف فاصلے پر ابھری ہوئی سطح پر برطانوی بستیوں اور چھاؤنی کو دیکھ سکتے ہیں۔

مذہبی اداروں کا سب سے اعلیٰ عہدہ دار اور اصل سرپرست ہوتا تھا۔ سماج اور شہر میں دیگر گروہوں اور طبقوں کا مقام حکمراں کے ساتھ ان کے رشتے یا تعلق سے متعین ہوتا تھا۔

عہد وسطیٰ کے شہروں میں حکمراں پیچیدہ طبقے کے ذریعہ تسلط والے سماجی نظام میں ہر فرد سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ اسے سماج میں اپنا مقام معلوم ہو۔ شمالی ہند میں اس نظام کو قائم رکھنے کا کام شاہی افسر کا تھا جسے کوتوال کہا جاتا تھا۔ وہ بیرونی امور پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ امن عام بنائے رکھتا تھا۔

1.2 اٹھارھویں صدی میں ہونے والی تبدیلیاں

(Changes in the eighteenth century)

اٹھارھویں صدی میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ دوبارہ سیاسی وتجارتی صف بندی کے ساتھ پرانے شہر زوال پذیر ہوگئے اور نئے شہروں کی نشوونما ہونے لگی۔ مغل اقتدار کی بتدریج شکست وریخت کے سبب ان کے اقتدار کے ساتھ مربوط شہروں کی موت ہوگئی۔ مغل راجدھانیوں، دہلی اور آگرہ نے اپنا اقتدار گنوادیا۔ نئی علاقائی طاقتوں کی نشوونما علاقائی راجدھانیوں — لکھنؤ، حیدرآباد، سری رنگاپٹنم، پونہ (موجودہ پونے)، ناگپور، بڑودہ (موجودہ ودوڈرا) اور تنجور (موجودہ تھنجاور) کی بڑھتی اہمیت سے ظاہر ہوئی۔ تاجر، منتظم، دست کار اور دیگر لوگ پرانے مغل مراکز سے ان نئی راجدھانیوں کی طرف کام اور سرپرستی کی تلاش میں ہجرت کر گئے۔ نئی ریاستوں کے درمیان مسلسل جنگوں کا مطلب تھا کہ کرائے کے سپاہیوں کو تیار روزگار ملیں۔ ممتاز افراد اور شمالی ہندوستان میں مغل حکومت سے وابستہ افسران نے بھی اس موقع کا استعمال ''قصبہ اور گنج'' جیسی نئی شہری بستیاں وجود میں لانے کے لیے کیا تاہم سیاسی لامرکزیت کے اثرات غیر یکساں تھے۔ کئی مقامات پر معاشی سرگرمیوں کی تجدید ہوئی تو بعض دیگر مقامات پر جنگ، لوٹ مار اور سیاسی غیر یقینی معاشی زوال کا آغاز بنی۔

تجارتی نیٹ ورک میں تبدیلیاں شہری مراکز کی تاریخ میں منعکس ہوئیں۔ یوروپی تجارتی کمپنیوں نے ابتدائی مغل عہد میں ہی مختلف مقامات پر، پرتگالیوں نے 1570 میں پنجی میں، 1605 میں ڈچوں نے سولی پٹنم میں، 1639 میں مدراس میں انگریزوں نے اور فرانسیسیوں نے 1673 میں پانڈیچری میں اساس قائم کر لی تھی۔ تجارتی سرگرمیوں کی توسیع کے ساتھ ہی ان تجارتی مراکز کے اردگرد

دہلی کا کوتوال
(The kotwal of Delhi)

کیا آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لعل نہرو کے دادا گنگادھر نہرو 1857 کی بغاوت سے پہلے دہلی کے کوتوال تھے؟ مزید تفصیل کے لیے جواہر لعل نہرو کی آپ بیتی (خودنوشت) پڑھیے۔

قصبہ دیہی علاقے میں ایک چھوٹا شہر ہوتا ہے جو اکثر مقامی ممتاز افراد کا مرکز ہوتا ہے۔
گنج ایک چھوٹی مستقل بازار سے منسوب ہے۔ قصبہ اور گنج دونوں میں کپڑے، پھل، سبزیاں اور دودھ مصنوعات کا کاروبار ہوتا تھا۔ یہ ممتاز وامرا خاندان اور فوج کو اشیا فراہم کراتے تھے۔

شکل 12.3
دریا کی طرف سے گوا شہر کا ایک منظر، گریٹ 1812

شہرنشو ونما پانے لگے۔اٹھارھویں صدی کے آخر تک ایشیا میں زمین پر مبنی سلطنتوں کا قیام طاقتور سمندر پر مبنی یوروپی سلطنتوں نے لے لیا۔بین الاقوامی تجارت،تجارتی نظریہ زراور سرمایہ داری کی طاقتیں سماج کی ماہیئت کو معین کررہی تھیں۔

اٹھارھویں صدی کے وسط سے تبدیلی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔تجارتی مراکز جیسے سورت، مسولی پٹنم اور ڈھاکہ جن کی نشو ونما سترھویں صدی میں ہوئی تھی،جب زوال پذیر ہوئے تو تجارتی سرگرمیاں بھی دیگر مقامات پر منتقل ہوگئیں۔1757 میں پلاسی کی جنگ کے بعد جونہی انگریزوں نے بتدریج سیاسی کنٹرول حاصل کیا اور انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت میں توسیع ہوئی ویسے ہی مدراس،کلکتہ اور بمبئی جیسے بندرگاہی شہر نئی معاشی راجدھانیوں کی شکل میں تیزی سے ظہور میں آئے۔یہ نوآبادیاتی نظم ونسق اور سیاسی اقتدار کے مرکز بھی بن گئے۔نئی عمارتیں اور ادارے ارتقا پذیر ہوئے اور شہری مقامات کو نئے انداز میں منظم کیا گیا۔نئے پیشے ارتقا پذیر ہوئے اور لوگوں کے انبوہ ان نوآبادیاتی شہروں کی طرف آنے لگے۔تقریباً 1800 تک یہ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کے بڑے شہر تھے۔

شہروں کے نام (Names of cities)

مدراس،بمبئی اور کلکتہ کے نام ان گاؤں کے انگریزی بنائے گئے نام میں جہاں انگریزوں نے سب سے پہلے تجارتی چوکیاں قائم کی تھیں۔اب انھیں چنئی،ممبئی اور کولکاتہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

بحث کیجیے

آپ جس قصبہ،شہر یا گاؤں میں رہتے ہیں وہاں کی کون سی عمارت،ادارہ یا مقام اصل مرکزی نقطہ ہے؟اس کی تاریخ کا پتہ لگائیے اور معلوم کیجیے کہ یہ کب تعمیر ہوا۔اس کو کیوں تعمیر کیا گیا، یہ کون سے امور انجام دیتا تھا اور کیا اس کے امور میں کوئی تبدیلی آئی؟

2. نوآبادیاتی شہروں کے متعلق تحقیقاتی نتیجہ (FINDING OUT ABOUT COLONIAL CITIES)

2.1 نوآبادیاتی دستاویزات اور شہری تاریخ (Colonial records and urban history)

نوآبادیاتی حکومت اعداد وشمار کے ماحصل پر مبنی تھی۔انگریز اپنے تجارتی امور کو منضبط کرنے کے لیے اپنی تجارتی سرگرمیوں کی تفصیلی دستاویزات رکھتے تھے۔ارتقا پذیر شہروں میں زندگی کی روش پر نظر رکھنے کے لیے وہ باقاعدہ پابندی سے سروے کرتے،اعداد وشمار یکجا کرتے اور مختلف طرح کی سرکاری رپورٹیں شائع کرتے تھے۔

ابتدائی سالوں سے ہی نوآبادیاتی حکومت نقشہ تیار کرنے کے لیے پرجوش نظر آئی،وہ محسوس کرتی تھی کہ بَرّی مناظر کو سمجھنے اور جغرافیائی حالت کو جاننے کے لیے اچھے نقشے بنانے ضروری تھے۔اس سے علاقے پر اچھی طرح سے کنٹرول کرنے کی گنجائش ہوگی۔جب شہر بڑھنا شروع ہوگئے تو نہ صرف یہ کہ ان کے ارتقا کا منصوبہ تیار کرنے کے لیے بلکہ تجارت کو ترقی دینے اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے بھی نقشے تیار کیے جانے لگے۔شہروں کے نقشے پہاڑیوں،ندیوں اور

سبزہ زاروں کے محل وقوع کے متعلق بھی اطلاعات دیتے ہیں۔ یہ تمام باتیں حفاظتی مقاصد اورتعمیرات کی منصوبہ بندی کے لیے نہایت اہم تھیں۔ یہ گھاٹوں، ٹھوسپن (کثافت) مکانوں کی ماہیئت اور سڑکوں کا خاکہ دکھاتے تھے جس کا استعمال تجارتی امکانات کی گنجائش اور محصول بندی کی حکمت عملی کے لیے کیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی کے آخر سے انگریزوں نے میونسپل ٹیکس کی سالانہ وصولیابی کے ذریعہ شہروں کا بندوبست کرنے کے لیے پیسہ جمع کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ ٹکراؤ سے بچنے کے لیے انھوں نے ذمہ داریاں منتخب ہندوستانی نمائندوں کو سونپ دیں۔ کچھ حد تک عوامی نمائندگی کے ساتھ میونسپل کارپوریشن جیسے اداروں کا مطلب یہ تھا کہ پانی کی فراہمی، نالے نالیوں کا نظام، سڑکوں کی تعمیر اور عوامی صحت جیسی ضروری خدمات کا انتظام ہو۔ اس کی سرگرمیوں سے پوری طرح سے نئے ریکارڈوں کے مجموعے وجود میں آئے جن کو میونسپل کارپوریشن کے ریکارڈ روم میں سنبھال کر رکھا جانے لگا۔

شہروں کی نشوونما پر نظر رکھنے کے لیے پابندی کے ساتھ لوگوں کو شمار کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط تک مختلف علاقوں میں بہت سی مقامی مردم شماریاں کی جاچکی تھیں۔ 1872 میں کل ہند مردم شماری کی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد 1881 سے دہ سالہ (ہر دس سال میں ہونے والی) مردم شماری ایک باقاعدہ خصوصیت بن گئی۔ ہندوستان میں شہرکاری کا مطالبہ کرنے کے لیے مردم شماری کے اعداد و شمار کا یہ مجموعہ ایک قیمتی ماخذ ہے۔

ان رپورٹوں پر نظر ڈالنے پر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے پاس تاریخی تبدیلی کو ناپنے کے لیے ٹھوس اعداد و شمار موجود ہیں۔ بیماریوں اور اموات پر مبنی جدول کے نہ ختم ہونے والے صفحات یا ان کی عمر، جنس، ذات اور پیشے کے مطابق لوگوں کو شمار کرنے کے سبب اعداد و شمار کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہوتا ہے جس سے پختگی اور واقعیت کا فریب پیدا ہوتا ہے تاہم مورخین نے پایا کہ یہ اعداد و شمار گمراہ کرسکتے ہیں۔ ان کا استعمال کرنے سے قبل ہمیں یہ سمجھنا ضروری

شکل 12.4

بمبئی کا ایک پرانا نقشہ

دائرے میں نشان زد کیا گیا علاقہ ''کیسل'' جو علاقہ بندوبستی کا حصہ تھا۔ نقطوں والے علاقے سات جزیروں کو دکھا رہے ہیں جو سمندر پاٹ کر زمین تیار کرنے کے منصوبہ کے ذریعہ بتدریج متحد کردیے گئے تھے۔
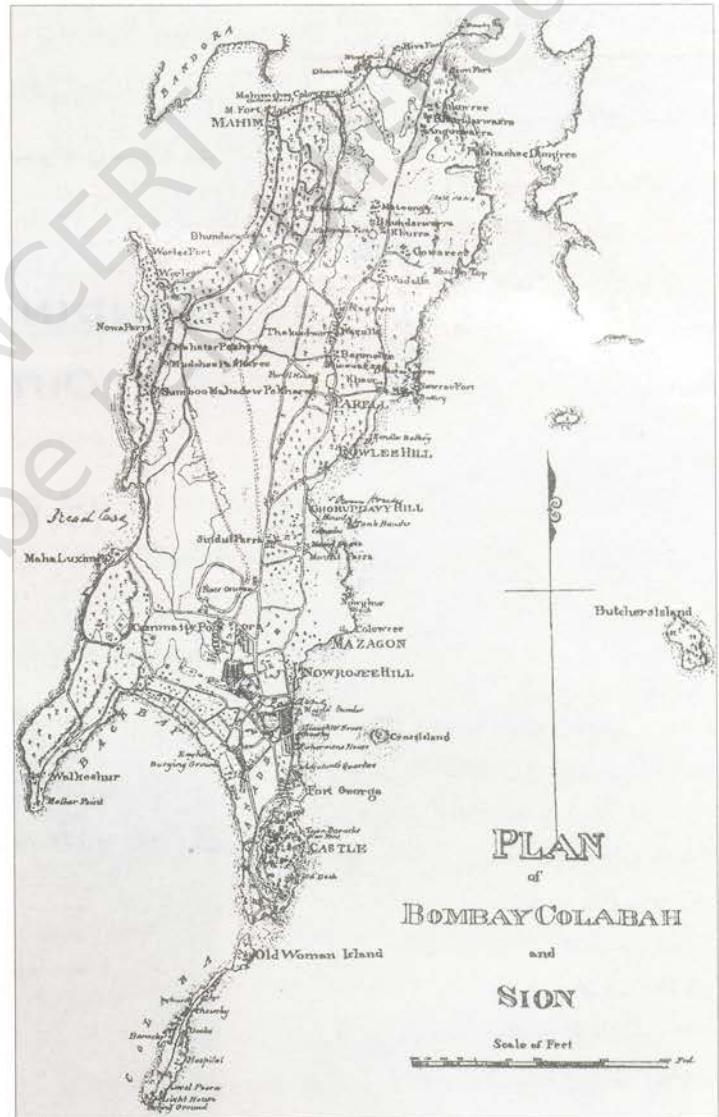
ہے کہ یہ اعداد و شمار کس نے جمع کیے اور انھیں کیوں اور کیسے اکٹھا کیا گیا تھا۔ ہمیں یہ جاننا بھی لازمی ہے کہ کس چیز کی پیائش کی گئی اور کس کی نہیں کی گئی۔

مثال کے طور پر مردم شماری کا طریق عمل ایک ایسا ذریعہ تھا جس کے ذریعہ آبادی کے متعلق سماجی اعداد و شمار کو آسان اعداد و شمار میں تبدیل کر دیا گیا لیکن یہ ابہام کے ساتھ پیچیدہ عمل تھا۔ مردم شماری کے کمشنروں نے آبادی کے مختلف طبقات کی درجہ بندی کرنے کے لیے الگ الگ زمرے مقرر کیے۔ یہ درجہ بندی اکثر بے قاعدہ ہوتی تھی اور لوگوں کے سریع الحرکت ہونے نیز ایک دوسرے کو پکڑنے میں ناکام تھی۔ ایک شخص جو دست کار اور تاجر دونوں ہو اس کی درجہ بندی کس طرح ہوگی؟ ایک شخص جو خود اپنی زمین پر کھیتی کرتا ہو اور پیداوار کو گاڑی پر لاد کر شہر لے جاتا ہو اس کو کس طرح شمار کیا جائے گا؟ کیا وہ ایک کاشت کار ہے یا ایک تاجر۔

اکثر لوگ خود بھی مردم شماری افسران کو تعاون دینے سے انکار کر دیتے تھے یا ٹالنے والے جوابات دیتے تھے۔ اگرچہ طویل عرصے تک لوگ مردم شماری کے عمل کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے کیونکہ انھیں لگتا تھا کہ نئے ٹیکسوں کو نافذ کرنے کے لیے یہ تفتیشی کا عمل انجام دیا جا رہا ہے۔ اعلیٰ ذات کے افراد بھی اپنے گھرانے کی خواتین سے متعلق کسی بھی طرح کی معلومات دینے کے روادار نہ تھے۔ عورتوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ گھر کے اندر کی دنیا کا الگ حصہ ہیں اور عوامی نظروں کا یا تفتیش کا موضوع نہیں بن سکتیں تھیں۔

مردم شماری افسران نے یہ بھی دیکھا کہ لوگ ایسی شناختوں کا دعویٰ کرتے تھے جو اعلیٰ حیثیت سے وابستہ تھیں۔ مثال کے طور پر شہروں میں ایسے لوگ بھی تھے جو پھیری لگانے والے تھے اور عمومی اشیا فروخت کرنے کے لیے حرکت کرتے تھے اگرچہ دیگر موسموں میں وہ معمولی مزدوری کے ذریعہ اپنی زندگی گزارتے تھے۔ اکثر ایسے لوگ مردم شماری افسران (شمار کنندہ) کے سامنے خود کو ایک تاجر بتاتے تھے، مزدور نہیں، کیونکہ وہ تجارت کو ایک معزز سرگرمی سمجھتے تھے۔

اسی طرح موت اور بیماریوں کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنا بھی مشکل تھا۔ مثلاً تمام اموات کا اندراج نہیں کرایا جاتا تھا اور بیمار ہونے کی اطلاع بھی ہمیشہ نہیں لی جاتی تھی اور نہ ہی لائسنس یافتہ ڈاکٹر کے ذریعہ علاج کرایا جاتا تھا۔ ایسے ہی بیماری یا موت کے معاملوں کا بالکل صحیح حساب لگانا کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟

چنانچہ مورخین کو مردم شماری جیسے ماخذوں کا استعمال بڑی احتیاط کے ساتھ کرنا پڑتا ہے، اپنے ذہن میں ممکنہ تعصّبات کو رکھتے ہوئے دوبارہ حساب لگانا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ

نقشے کیا ظاہر کرتے ہیں اور کیا مخفی رکھتے ہیں؟
(What maps reveal and conceal?)

سروے کے طریقوں کا ارتقا صحیح سائنسی آلات اور برطانوی شاہی ضروریات تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ نقشے بڑی احتیاط کے ساتھ تیار کیے گئے ہیں۔ 1878 میں سروے آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ تیار کیے گئے نقشے ہمیں خاص اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں انگریز حکمرانوں کے تعصبات بھی منعکس ہوتے ہیں۔ شہر میں غریبوں کی بڑی بستیوں کو نقشے پر نشان زد نہیں کیا گیا کیونکہ حکمرانوں کو وہ غیر اہم نظر آتی تھیں۔ نتیجتاً یہ مان لیا گیا تھا کہ نقشے پر یہ خالی جگہ دیگر ترقیاتی اسکیموں کے لیے دستیاب ہے۔ جب ان اسکیموں پر عمل درآمد کیا گیا تو وہاں سے غربا کو بے دخل کر دیا گیا۔

ہند سے کیا بات نہیں بتا رہے ہیں۔ تاہم مردم شماری، سروے کے نقشے اور میونسپلٹی جیسے اداروں کے ریکارڈوں کی مدد سے نوآبادیاتی شہروں کا قبل نوآبادیاتی شہروں کے مقابلے میں زیادہ تفصیل سے مطالعہ کرنا ممکن ہے۔

2.2 تبدیلی کے رجحانات (Trends of change)

مردم شماری کا احتیاط سے مطالعہ کرنے سے بعض مسحور کرنے والے رجحانات ظاہر ہوئے۔ 1800 کے بعد ہندوستان میں شہر کاری کی رفتار سست تھی۔ انیسویں صدی سے بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک ہندوستان کی کل آبادی میں شہری آبادی کا تناسب بہت ہی کم تھا اور یہ جامد رہا تصویر 12.5 سے واضح ہوجاتا ہے۔ 1900 اور 1940 کے 40 سالوں کے درمیان شہری آبادی کل آبادی کی 10 فی صد سے بڑھ کر تقریباً 13 فی صد ہوگئی۔

پائیداری کی اس تصویر کے تحت مختلف علاقوں میں شہری ارتقا کے نمونوں میں معنی خیز اختلافات موجود تھے۔ چھوٹے قصبوں کے پاس معاشی طور پر ترقی کرنے کا بہت کم موقع تھا۔ دوسری طرف کلکتہ، بمبئی اور مدراس نے تیزی سے ترقی کی اور جلد ہی وسیع شہر بن گئے۔ بالفاظ دیگر نئے تجارتی اور انتظامی مراکز کے طور پر ان تین شہروں کی نشوونما دوسرے موجود شہری مراکز کی تذلیل یعنی کمزور کرکے ہوئی تھی۔

نوآبادیاتی معیشت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ہندوستانی برآمد مصنوعات جیسے سوتی کپڑوں کے لیے جمع کردہ اشیا کے ڈپو کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے بعد یہ رجحان مخالف ہوگیا تو یہ شہر برطانوی کارخانوں میں بنی مصنوعات کے داخلے کا مرکز بن گئے اور ہندوستان سے تیار مصنوعات کے بجائے خام مال کی برآمد ہونے لگی۔ اس معاشی سرگرمی کی نوعیت کی وجہ سے یہ نوآبادیاتی شہر ہندوستان کے روایتی قصبات اور شہروں کے مقابلے تیزی سے بدل گئے۔

1853 میں ریلوے کی شروعات کا مطلب ان قصبات کی قسمت میں تبدیلی آنا تھا۔ معاشی سرگرمی بتدریج روایتی قصبات سے منتقل ہونے لگی جو قدیم شاہراہوں اور دریاؤں کے متوازی واقع تھے۔ ہر ریلوے اسٹیشن خام مال جمع کرنے کا ڈپو اور درآمدی اشیا کی تقسیم کا مرکز بن گیا۔ مثال کے طور پر گنگا کے کنارے واقع مرزاپور دکن سے کپاس اور سوتی اشیا کے جمع کرنے کا ایک خاص مرکز تھا جو بمبئی تک جانے والی ریلوے لائن بننے کے بعد زوال پذیر ہوگیا (دیکھیے باب 10، تصویر 10.18 اور 10.19)۔ ریلوے نیٹ ورک کی توسیع کے ساتھ ریلوے

ہندوستان میں شہر کاری

1891-1941

سال	کل آبادی میں شہری آبادی کا تناسب
1891	9.4
1901	10.0
1911	9.4
1921	10.2
1931	11.1
1941	12.8

شکل 12.5

بحث کیجیے......

شماریاتی اعداد و شمار یا شہر کے نقشوں میں سے کسی ایک کا مطالعہ کیجیے۔ اور پتہ لگائیے کہ اسے کون جمع کر رہا تھا اور یہ کیوں جمع کیے گئے۔ اس طرح کے مجموعے میں کس طرح کے تعصبات کا امکان ہے؟ کس قسم کی معلومات اس میں خارج ہیں؟ معلوم کیجیے کہ یہ نقشے کیوں تیار کیے گئے اور کیا اس میں شہر کے تمام حصوں کی مساوی طور پر تفصیل پیش کی گئی ہے؟

ورکشاپ اور ریلوے کالونیاں بھی قائم ہوئیں۔ جمال پور، والٹیر ... ے شہر بھی ارتقاپذیر ہوئے۔

شکل 12.6
فورٹ علاقے میں بوھرہ بازار، بمبئی 1885
جوں جوں بمبئی ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ فورٹ علاقے میں بھی بھیڑ بڑھتی گئی۔ تاجر، دکاندار اور ملازمت پیشہ گروہ اس علاقے میں آنے لگے یہاں بہت سے بازار قائم ہوئے اور اونچی عمارتیں بننے لگیں۔ مجمع سے پریشان انگریزوں نے فورٹ کے شمالی حصے سے ہندوستانیوں کو دھکیلنے کی کئی دفعہ کوشش کی جہاں مقامی جماعتیں آباد تھیں۔

3. نئے شہر کیسے تھے؟ (What Were the New Towns Like?)

3.1 بندرگاہیں، قلعے اور خدمات کے مراکز (Ports, forts and centres for services)

اٹھارھویں صدی تک مدراس، کلکتہ اور بمبئی اہم بندرگاہیں بن گئے۔ یہاں کی بستیاں اشیا جمع کرنے کے سہل الحصول مراکز کے طور پر سامنے آئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فیکٹریاں (تجارتی دفاتر) یہیں پر تعمیر کیں اور یوروپی کمپنیوں کے درمیان مقابلہ آرائی کی وجہ سے حفاظت کے مقصد سے ان بستیوں کی قلعہ بندی کی۔ مدراس میں فورٹ سینٹ جارج، کلکتہ میں فورٹ ولیم اور بمبئی میں فورٹ، برطانوی بستیوں کے طور پر نشان زد کیے گئے۔ یوروپی تاجروں کے ساتھ معاشی لین دین کرنے والے ہندوستانی تاجر، دست کار اور دیگر مزدوران قلعوں کے باہر اپنی بستیوں میں رہتے تھے۔ اس طرح ابتدا سے ہی یوروپین

شکل 12.7
کولکاتہ میں 'اولڈ فورٹ گھاٹ'، تھامس اور ولیم ڈینیل کے ذریعہ بنائی گئی تصویر 1787،
اولڈ فورٹ ساحل پر واقع تھا۔ کمپنی کا مال یہاں حاصل کیا جاتا تھا۔ مقامی لوگ مسلسل اس گھاٹ کا استعمال غسل کے مقصد سے کرتے تھے۔
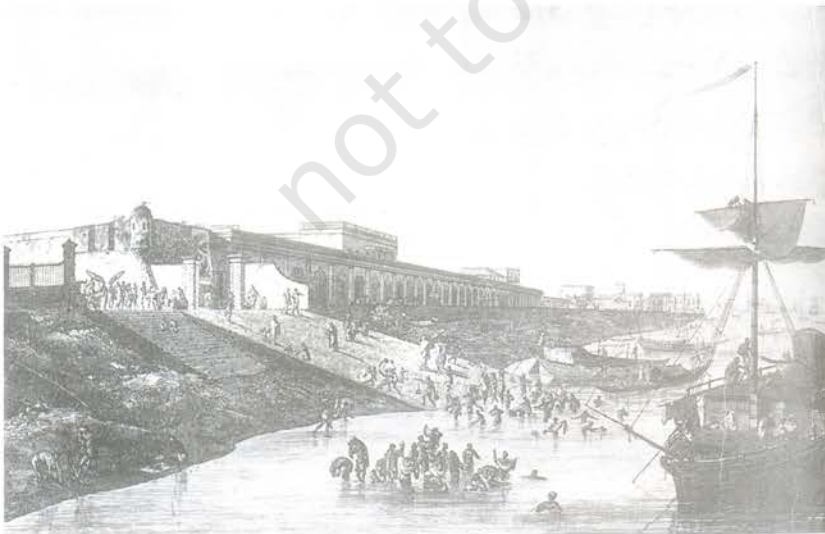
اور ہندوستانیوں کے لیے علاحدہ کوارٹر (مکان) بنائے گئے جن کو ہم عصر تحریروں میں ''وائٹ ٹاؤن White Town'' اور ''بلیک ٹاؤن Black Town'' کے نام سے معنون کیا گیا۔ انگریزوں کا سیاسی طاقت پر قبضہ کرنے کے بعد یہ نسلی امتیاز اور بھی تیز ہو گیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں ریولے کے وسیع تر ہوتے نیٹ ورک نے ان شہروں کو ہندوستان کے دیگر خطّوں کے ساتھ مربوط کر دیا۔ اس کے نتیجے میں جہاں سے خام مل اور مزدور آتے تھے وہاں سے ایسے دیہی اور مضافاتی علاقے بھی ان بندرگاہی شہروں سے مربوط ہو گئے۔ چونکہ خام مال درآمد کے لیے ان شہروں میں آتا تھا اور یہاں ارزاں مزدور بکثرت دستیاب تھے اس لیے یہاں جدید فیکٹریاں قائم کرنا آسان تھا۔ 1850 کی دہائی کے بعد ہندوستانی تاجروں اور مہم حضرات نے بمبئی میں سوتی کپڑا مل کی قائم اور کلکتہ کے قرب و جوار کے علاقے میں یوروپی نجی ملکیت والی جوٹ مل بھی قائم کی گئی۔ یہ ہندوستان میں جدید صنعتی نشوونما کا آغاز تھا۔

تاہم کلکتہ، بمبئی اور مدراس انگلینڈ کی صنعتوں کے لیے خام مال کی سپلائی کرتے تھے۔ چونکہ یہ سرمایہ داری جیسی جدید معاشی قوتوں کی بدولت ظہور پذیر ہو چکے تھے لیکن ان کی معیشت بنیادی طور پر فیکٹری پیداوار پر منحصر نہ تھی۔ ان شہروں کی مزدور طبقہ کی آبادی کی اکثریت اس حلقہ سے وابستہ تھی جسے ماہرین معاشیات تیسرا شعبہ (Tertiary Sector) کے نام سے درجہ بند کرتے ہیں۔ یہاں پر صحیح معنی میں صرف دو صنعتی شہر: کان پور جو چمڑے، اونی اور سوتی کپڑوں کے لیے خاص تھا اور جمشید پور اسٹیل (اسپات) کے لیے خاص تھے۔ ہندوستان کبھی ایک جدید صنعتی ملک نہیں بن پایا کیونکہ امتیاز پر مبنی نوآبادیاتی پالیسیوں نے صنعتی ارتقا کی سطح کو محدود رکھا۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی نشوونما بڑے شہروں کی طرح تو ہوئی لیکن اس سے نوآبادیاتی ہندوستان کی کل معیشت میں کوئی ڈرامائی افزائش نہیں ہوئی۔

3.2 ایک نیا شہری ماحول (A new urban milieu)

نوآبادیاتی شہر نئے حکمرانوں کے تاجرانہ تمدن کی ترجمانی کرتے تھے۔ سیاسی اقتدار اور سرپرستی، ہندوستانی حکمرانوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ ترجمان، بچولیے، تاجر اور رسدرساں جیسے کام کرنے والے ہندوستانی بھی ان نئے شہروں میں اپنا اہم مقام رکھتے تھے۔ ندی یا سمندر کے کنارے معاشی سرگرمیوں نے گودیوں اور گھاٹوں کے ارتقا کو فروغ دیا۔ سمندر اور دریاؤں کے کنارے گودام، تجارتی دفاتر، جہاز رانی صنعت کے لیے بیمہ ایجنسیاں، نقل و حمل کے ڈپو اور بینکنگ ادارہ قائم ہونے لگے۔ مزید برآں کمپنی کے انتظامی صدر دفاتر اندرون ملک بنائے گئے۔ کلکتہ میں واقع رائٹرس بلڈنگ اسی طرح کا ایک دفتر تھی۔ قلعہ کے بیرونی اطراف میں یوروپی تاجروں اور ایجنٹوں نے یوروپی طرز کے محل نما مکان تعمیر کر لیے۔ بعض نے شہری مضافاتی علاقے میں پائیں باغ والے مکان (Garden houses) تعمیر کیے۔

آیونک (ionic) قدیم یونانی فن تعمیر کے تین نظم و ترتیب (تنظیمی نظام) میں سے ایک نظم ہے جب کہ دیگر ڈورک (Doric) اور کورنتھین (Corinthian) ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت جو ہر نظم کو ممیز کرتی تھی وہ ستونوں کے سر پرستون کا طرز تھی۔ ان شکلوں کو نشاۃ ثانیہ اور فن تعمیر کی جدید کلاسیکل شکلوں میں از سر نو موافق کیا گیا۔

Doric capital

Ionic capital

Corinthian capital

حکمراں کے ممتاز طبقہ کے لیے نسلی تفریق پر مبنی کلب، ریس کورس (...) اور تھیٹر بھی تعمیر کیے گئے۔

شکل 12.8
دی اولڈ کورٹ ھائوس اینڈ رائٹرس بلڈنگ، تھامس اور ولیم ڈینیل کے ذریعہ بنائی گئی تصویر 1786
دائیں جانب کورٹ ہاؤس مع سقف راہ داری اور آیونک ستون جو 1792 میں منہدم ہوگیا۔ دوسری عمارت رائٹرس بلڈنگ ہے جہاں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین (رائٹرس کے نام سے معروف) قیام کرتے تھے۔ بعد میں اسے گورنمنٹ آفس بنادیا گیا۔

شکل 12.9
چورنگی میں نئی عمارت، تھامس اور ولیم ڈینیل کے ذریعہ بنائی تصویر 1787
میدان کے مشرقی کنارے پر انگریزوں کے ذاتی مکان اٹھارھویں صدی کے آخر میں بننے لگے تھے۔ زیادہ تر مکان پلاڈین طرز کے تھے جن میں گرمیوں کی شدت سے بچنے کے لیے ستونوں والے برآمدے بنائے گئے تھے۔

مالدار ہندوستانی ایجنٹوں اور بچولیوں نے بازار کے قرب وجوار میں بلیک ٹاؤن میں روایتی کھلے صحن نما مکانات تعمیر کیے تھے۔ انھوں نے مستقبل میں سرمایہ کاری کے لیے شہر میں زمین کے وسیع قطعات خرید لیے تھے۔ اپنے انگریز آقاؤں کو متاثر کرنے کے لیے تیوہاروں کے زمانے میں فراخ دل پارٹیاں (دعوتیں) منعقد کرتے تھے۔ سماج میں اپنا رتبہ قائم کرنے کے لیے ان لوگوں نے مندر بھی تعمیر کرائے تھے۔ غریب مزدور طبقے کے افراد اپنے یوروپی اور ہندوستانی آقاؤں کے لیے خانساماں، پالکی اُٹھانے والے، سائیس، چوکیدار، حمال اور تعمیراتی وگودی کے مزدور کی حیثیت سے مختلف قسم کی خدمات مہیا کراتے تھے۔ وہ شہر کے مختلف حصوں میں عارضی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔

انیسویں صدی کے وسط میں نوآبادیاتی شہروں کی نوعیت میں مزید تبدیلی آئی۔ 1857 کی بغاوت کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کا رویہ بغاوت کے مسلسل خوف سے طے ہونے لگا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ شہروں کے بہتر انداز پر حفاظت کرنے کی ضرورت ہے اور سفید لوگوں کو 'دیسی' باشندوں کے خطرے سے دور زیادہ محفوظ اور علاحدہ بستیوں میں رہنا چاہیے۔ پرانے قصبوں کے اطراف کی چراگاہی زمینوں اور کھیتوں کو صاف کر دیا گیا اور نئے شہری علاقے ''سول لائنس'' کے نام سے قائم کیے گئے۔ سفید لوگوں (انگریزوں) نے سول لائنس میں رہنا شروع کر دیا۔ وہ چھاؤنیوں کے علاقے جہاں ہندوستانی فوجی یوروپیوں کی کمان میں رہتے تھے، انھیں بھی بطور محفوظ بستیوں کی شکل میں ارتقا پذیر کیا گیا۔ یہ علاقے ہندوستانی شہروں سے الگ ہونے کے باوجود وابستہ تھے۔ کشادہ سڑکیں، وسیع باغات میں تعمیر بنگلے، فوجی بیرکیں، پریڈ کا میدان اور چرچ کا مطلب یوروپین کے لیے ایک محفوظ جائے پناہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ہندوستانی شہروں کی گھنی آبادی کے مقابلے ایک منظم شہری زندگی کا نمونہ بھی تھے۔

شکل 12.10

ماربل پیلیس، کلکتہ

یہ نئے شہری ممتاز طبقہ سے وابستہ ایک ہندوستانی اہل خانہ کے ذریعہ بنوائی گئی خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک تھی۔

شکل 12.11

حت پوربازار، چارلس ڈی اولے کی تیار کردہ تصویر

چت پور بازار کلکتہ میں بلیک ٹاؤن اور وائٹ ٹاؤن کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں مختلف طرح کے مکانات کو دیکھیے: ایک طرف دولت مند زمین داروں کی اینٹوں سے بنی عمارت ہے تو دوسری جانب پھوس سے بنی غربا کی جھونپڑیاں تصویر میں نظر آرہی ہیں۔ مندر کو انگریز بلیک پگوڈا (سیاہ مخروطی شکل) کہتے تھے، جس کو یہاں رہنے والے گووندرام مترنامی ایک زمین دار نے تعمیر کروایا تھا یہاں تک کہ نسلی تفاخر کی زبان کے پیرایہ میں نام بھی اکثر سیاہی میں رنگے ہوتے تھے۔

تصویر 12.8، 12.9 اور 12.11 کو دیکھیے۔ سڑکوں پر ہونے والی سرگرمیوں پر دھیان دیجیے۔ یہ سرگرمیاں اٹھارھویں صدی کے آخر میں کلکتہ کی سڑکوں پر سماجی زندگی کے متعلق ہمیں کیا بتاتی ہیں؟

انگریزوں کے لیے، ''بلیک'' علاقے نہ صرف بدنظمی اور سیاسی انتشار کا مظہر لیے ہوئے تھے بلکہ غلاظت و بیماری کا بھی مظہر تھے۔ کافی عرصہ تک انگریزوں کی بنیادی دلچسپی ''وائٹ'' علاقوں میں صفائی اور حفظانِ صحت بنائے رکھنے میں تھی، لیکن جب ہیضہ اور پلیگ جیسی وبائی بیماریاں پھیلیں اور ہزاروں لوگ مارے گئے تو نوآبادیاتی افسران کو محسوس ہوا کہ کچرے اور گندے پانی کی نکاسی نیز عوامی صحت کے تئیں سخت اقدامات کی ضرورت ہے۔ ان کو خوف تھا کہ یہ بیماریاں بلیک ٹاؤن سے وہائٹ ٹاؤن میں بھی پھیل جائیں گی۔ 1860 کی دہائی سے صفائی ستھرائی سے متعلق سخت انتظامی اقدامات کا نفاذ کیا گیا اور ہندوستانی شہروں میں تعمیراتی سرگرمیوں کو منضبط کیا گیا۔ اسی زمانے میں زمین دوز پائپ کے ذریعہ پانی کی سپلائی اور گندے پانی کی نکاسی نیز نالیوں کا نظام بھی قائم کیا گیا۔ اس طرح ہندوستانی شہروں کو منضبط کرنے کے لیے صفائی ستھرائی چوکسی بھی ایک دوسرا طریقہ کار بن گیا۔

3.3 پہلے ہل اسٹیشن (The first hill stations)

چھاؤنیوں کی طرح ہل اسٹیشن (پہاڑ پر سرکاری پڑاؤ) بھی نوآبادیاتی شہری ارتقا کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ ہل اسٹیشنوں کی بنیاد ڈالنا اور ترتیب بنیادی طور پر برطانوی افواج کی ضروریات سے وابستہ تھی۔ سملہ (موجودہ شملہ) کی بنیاد گورکھا جنگ (16–1815) کے دوران پڑی۔ 1818 کی اینگلو مراٹھا جنگ، انگریزوں کی ماؤنٹ آبو میں دلچسپی کا سبب بنی اور دارجلنگ سکم کے حکمرانوں سے 1835 میں زبردستی چھین لیا گیا۔ ہل اسٹیشن فوجیوں کے ٹھہرنے، سرحدوں کی نگرانی اور دشمن حکمرانوں کے خلاف کارروائیوں کے خلاف جنگی حکمت عملی کے مقامات بن گئے۔

ہندوستانی پہاڑوں کی معتدل اور ٹھنڈی آب و ہوا کو نفع بخش طور پر دیکھا جاتا تھا، خاص طور پر جب سے انگریزوں نے گرم موسم کو وبائی امراض کے ساتھ جوڑا تھا۔ انھیں ہیضہ اور ملیریا کا از حد خوف تھا اور وہ فوجیوں کو ان بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ فوج کی غالب موجودگی کے سبب یہ اسٹیشن پہاڑوں میں چھاؤنی کی ایک نئی قسم بن گئے۔ ان ہل اسٹیشنوں کو سینی ٹوریم (اقامتی دارالشفا) کی شکل میں بھی ارتقا پذیر کیا گیا یعنی وہ مقامات جہاں فوجیوں کو آرام کرنے اور بیماریوں سے صحت یاب ہونے کے لیے بھیجا جا سکتا تھا۔

شکل 12.12
ابتدائی بیسویں صدی کے شملہ میں ایک مثالی نوآبادیاتی مکان۔
غالباً یہ سرجان مارشل کی رہائش گاہ تھی۔

چونکہ ہل اسٹیشنوں کی آب و ہوا یوروپ کی ٹھنڈی آب و ہوا سے تقریباً ملتی جلتی تھی اس لیے یہ نئے حکمرانوں کے لیے پرکشش منزل بن گئے۔ گرمیوں کے مہینوں میں ہل اسٹیشنوں کی طرف نقل مکانی وائسرائے کا معمول بن گیا۔ 1864 میں وائسرائے جان لارنس نے سرکاری طور پر اپنی کونسل شملہ میں منتقل کرلی، اس طرح گرمی کے موسم میں راجدھانیوں کی منتقلی کے معمول پر مہر لگ

شکل 12.13
منالی کے قریب ایک گاؤں، ہماچل پردیش
جب انگریزوں نے ہل اسٹیشنوں پر نوآبادیاتی فن تعمیر کو متعارف کرایا تب بھی مقامی آبادی اکثر پہلے کی طرح ہی رہتی رہی۔

گئی۔ شملہ ہندوستانی فوج کے کمانڈر ان چیف (سالار اعظم) کی سرکاری رہائش بھی بن گیا۔

ہل اسٹیشنوں میں برطانوی اور دوسرے یوروپین گھر کی یاد دلانے والی بستیاں دوبارہ بنانا چاہتے تھے۔ عمارتیں دانستہ طور پر یوروپی طرز کی تعمیر کی گئیں۔ ذاتی مکانوں کے بعد ایک دوسرے سے الگ نمونے کے ولا (دیہی قیام گاہ) اور کاٹیج (چھوٹے مکان) باغات کے درمیان بنائے گئے۔ انگریزی چرچ اور تعلیمی ادارے انگریز تصورات کی نمائندگی کرتے تھے حتی کہ خوش باشی کی سرگرمیاں بھی انگریز ثقافتی روایات سے تشکیل یافتہ تھیں۔ چنانچہ سماجی دعوتیں، چائے پارٹیاں، پکنک، تفریحی تقریب یا میلے، گھوڑ دوڑ (ریس) اور تھیٹر دیکھنے جانا جیسے معمول ہل اسٹیشنوں میں نوآبادیاتی افسران کے درمیان مشترک بن گئے۔ ریلوے کی شروعات ہونے سے ہل اسٹیشن بشمول ہندوستانیوں کے بہت سے لوگوں کے لیے زیادہ قابل رسائی ہو گئے۔ اعلیٰ اور متوسط درجہ کے ہندوستانی جیسے مہاراجہ، وکلا اور تجار وغیرہ ان اسٹیشنوں کی طرف کھنچے چلے آنے لگے کیونکہ وہ یہاں آنے کے متحمل تھے اور حکمراں انگریز ممتاز طبقے سے نزدیکی قربت کے متمنی تھے۔

ہل اسٹیشن نوآبادیاتی معیشت کے لیے بہت اہم تھے۔ قرب وجوار کے علاقوں میں چائے اور کافی کی پودکاری کرنے سے میدانی علاقوں سے بڑی تعداد میں مہاجر مزدور آنا شروع ہو گئے جس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہل اسٹیشن زیادہ عرصہ تک ہندوستان میں یوروپی لوگوں کے لیے استثنائی طور پر نسلی محصورہ (بستی) باقی نہیں رہ گئے تھے۔

3.4 نئے شہروں میں سماجی زندگی

(Social life in the new cities)

ہندوستانی آبادی کے لیے نئے شہر حیرت انگیز مقامات تھے جہاں زندگی تیز دوڑتی نظر آتی تھی۔ یہاں خوشحالی اور غربت کے درمیان ڈرامائی فرق تھا۔

گھوڑا گاڑی جیسی نقل وحمل کی نئی سہولیات اور بعد میں ٹرام نیز بسوں کا مطلب یہ تھا کہ لوگ شہری مرکز سے دور جا کر بھی رہ سکتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ کام کرنے اور رہائش کی جگہ دونوں بتدریج الگ ہوتی گئی۔ گھر سے دفتر یا فیکٹری تک کا سفر کرنا پوری طرح ایک نئے قسم کا تجربہ تھا۔ پرانے شہروں سے باہم مربوط اور مانوسیت کا شعور بھی باقی نہیں رہا۔

مثال کے طور پر عوامی پارک، تھیٹر اور بیسویں صدی میں سینما ہال جیسے عوامی مقامات کی تعمیر نے تفریح اور سماجی تفاعل کی حد درجہ دلچسپی کی حامل نئی شکلیں مہیا کرائیں تھیں۔

شکل 12.14
کلکتہ میں سڑک پر چلتی ہوئی ٹرام

شہروں کے اندر نئے سماجی گروہ کی تشکیل ہوئی اور لوگوں کی پرانی شناخت کی اہمیت نہ رہی۔ تمام طبقات کے افراد بڑے شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ کلرک، استاد، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر اور محاسب کی مانگ میں اضافہ ہوا جس کے نتیجے میں ''متوسط'' طبقہ میں بھی ترقی ہوئی۔ اسکول، کالج اور لائبریری جیسے نئے تعلیمی ادارے تک ان کی رسائی تھی۔ تعلیم یافتہ افراد ہونے کے ناطے سماج اور حکومت کے متعلق وہ اپنی آرا اخبارات، رسائل اور عوامی جلسوں میں پیش کر سکتے تھے۔ اس طرح بحث ومباحثہ اور بات چیت کا ایک نیا عوامی حلقہ ظہور میں آیا۔

سماجی رسم ورواج، قاعدے وقانون اور معمولات پر سوالات اٹھنے لگے۔ یہ سماجی تبدیلیاں آسانی کے ساتھ واقع نہیں ہوئیں۔ مثال کے طور پر شہروں میں خواتین کے لیے نئے مواقع مہیا تھے جب کہ متوسط طبقے کی خواتین رسائل، خودنوشت سوانح عمریوں اور کتابوں کے ذریعہ خود کو متعارف کرانے کی جستجو کر رہی تھیں۔ روایتی سرقبیلی طرز عمل کو تبدیل کرنے کی ان کوششوں سے بہت سے افراد ناراض تھے۔ قدامت پرست افراد خوفزدہ تھے کہ عورتوں کی تعلیم دنیا کو تہہ وبالا کر کے رکھ دے گی اور پورے سماجی نظم کی بنیاد خطرے میں پڑ جائے گی حتی کہ وہ مصلح جو عورتوں کی تعلیم کے حمایتی تھے وہ بھی عورتوں کو بنیادی طور پر ماں، بیوی کی شکل میں دیکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی رہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ عوامی مقامات پر عورتیں زیادہ دکھائی دینے لگیں۔ وہ شہر کے نئے پیشوں میں جیسے گھریلو ملازمہ اور فیکٹری مزدور، معلّمہ، تھیٹر اور فلم کی اداکاراؤں کی شکل میں داخل ہونے لگیں۔ طویل عرصہ تک خواتین جو گھروں سے باہر نکل کر عوامی حلقوں میں جارہی تھیں سماجی تنقید کا ہدف بنی رہیں۔

شہروں کے اندر غریب مزدور یا کاری گر طبقہ ایک دیگر نیا طبقہ تھا۔ روزگار کی امید میں دیہی علاقوں سے مفلس و نادار لوگ انبوہ کی شکل میں شہروں کی طرف آرہے تھے۔ کچھ لوگ شہروں کو روزگار کے مواقع کے مقامات کی شکل میں دیکھتے تھے۔ دیگر کچھ لوگ ایک مختلف طرز زندگی کی جاذبیت سے راغب ہو رہے تھے کچھ لوگ چیزوں کو دیکھنے کی خواہش میں جو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھیں تھیں کھنچ رہے تھے۔ شہروں میں معاش کی قیمت کو انتہائی حد تک کم کرنے کی غرض سے زیادہ تر مرد مہاجرین اپنی فیملیوں کو اپنے آبائی گاؤوں میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ شہر میں زندگی ایک جدوجہد تھی نوکری غیر یقینی تھی، کھانا مہنگا تھا اور قیام کرنے کی جگہ کا خرچ برداشت کرنا مشکل امر تھا۔ تاہم غربا اکثر اوقات اپنا ایک زندہ شہری تمدن وجود میں لے آئے تھے۔ وہ مذہبی

امار کتھا (میری کہانی)
(Amar Katha (My Story))

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں بنودینی داسی (1863-1941) بنگالی تھیٹر میں پیش رو شخصیت تھیں اور ڈرامہ نویس وہدایت کار گریش چند گھوش (1844-1912) کے ساتھ کام کیا۔ کلکتہ میں اسٹا تھیٹر (1883) کو قائم کرنے میں ان کا اہم رول تھا جو آگے چل کر ڈرامہ وفلم سازی کے لیے ایک مشہور مرکز بن گیا۔ 1910 اور 1913 کے درمیان ''امار کتھا'' (میری کہانی) کے عنوان سے انھوں نے قسط وار اپنی سوانح عمری تحریر کی۔ انھوں نے سماج میں عورتوں کے مسائل پر مبنی تمثیلی کردار ادا کیے۔ ایک اداکارہ، ادارہ کی معمار اور مصنفہ جسے مختلف دائروں میں کام کرنے کے سبب ہوئے ایک ماہر پیشہ ور تھیں لیکن اس زمانے کے سرقبیلی سماج نے عوامی حلقوں میں ان کی مثبت موجودگی کی مذمت کی۔

شکل 12.15
انیسویں صدی کے آخر کی کالی گھاٹ پینٹنگ۔
خواتین طاقت کے متعلق مردوں کی تشویش کا اظہار اکثر ایک جادوگر عورت کی تصویر کے ذریعہ کیا جاتا تھا جو اس کو بھیڑ بنادیتی تھی۔ جوں جوں عورتیں تعلیم یافتہ ہونا شروع ہوئیں وہ اپنے گھروں کی گوشہ گیری سے باہر نکلنے لگیں اس طرح مقبول عام تصاویر میں عورتوں کی ایسی تصاویر کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔

تہواروں، تماشہ (لوک تھیٹر) اور سوانگ (طنزیہ) میں پر جوش حصہ لیتے تھے جن میں اکثر ان کے ہندوستانی اور یوروپی آقاؤں کے باطل دعویٰ کا مذاق اُڑایا جاتا تھا۔

بحث کیجیے..........

آپ کی رہائش گاہ سے سب سے قریب ریلوے اسٹیشن کون سا ہے؟ معلوم کیجیے کہ وہ کب تعمیر کیا گیا اور کیا اسے اشیا کی مال برداری یا لوگوں کی آمد و رفت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ بزرگ لوگوں سے معلوم کیجیے کہ وہ اس اسٹیشن کے متعلق کیا جانتے ہیں۔ کیا آپ اکثر اسٹیشن پر جاتے ہیں؟ کیسے اور کیوں؟

ماخذ 2

غریب مہاجرین کی نظر میں
(Through the eyes of poor migrants)

یہ عوامی نغمہ (سوانگ) ابتدائی بیسویں صدی میں جیلا پاڑہ (مچھواروں کے کوارٹر) کے باشندوں کے درمیان کافی مقبول تھا:

دل میں ایک بھاؤنا سے کلکتہ میں آیا	دل میں ایک امنگ لیے میں کلکتہ آیا
کیسن کیسن مجاہم ہیا دیکھن پایا	کیسی کیسی دلفریب چیزیں یہاں دیکھنے کو ملیں
اری سماج، برہما سماج، گرجا، مجد	آریہ سماج، برہموں سماج، چرچ اور مسجد
ایک لوٹا میں ملتا دودھ، پانی، سب چیز	ایک ہی برتن میں سب کچھ مل سکتا ہے۔ جیسے دودھ، پانی اور سب چیزیں
چھوٹا بڑا آدمی سب، باہر کر کے دات	ہر چھوٹے اور بڑے اپنے اپنے دانت دکھاتے ہیں
چھاپڑ مار کے بولتا ہے، انگریجی میں بات	اور فراٹے دار انگریزی بولتے ہیں

4. نسلی علاحدگی کا عمل، شہری منصوبہ بندی اور فن تعمیر (SEGREGATION, TOWN PLANNING AND ARCHITECTURE)

مدراس، کلکتہ اور بمبئی (MADRAS, CALCUTTA AND BOMBAY)

مدراس، کلکتہ اور بمبئی نو آبادیاتی ہندوستان کے بڑے شہروں میں بتدریج ارتقا پذیر ہو گئے۔ ان شہروں کی کچھ ممتاز خصوصیات کا تجزیہ ہم سابقہ حصوں میں کر چکے ہیں یہاں اب ہم ہر شہر کی خصوصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

4.1 مدراس میں آبادکاری اور نسلی علاحدگی کا عمل

(Settlement and segregation in Madras)

کمپنی نے اپنی تجارتی سرگرمیاں سب سے پہلے مغربی ساحل پر سورت کی عرصہ سے قائم شدہ بندرگاہ پر ترتیب دیں۔ اس کے بعد کپڑوں کی تلاش میں انگریز سوداگر مشرقی ساحل تک آنے لگے۔ 1639 میں انھوں نے مدراس پٹم میں ایک تجارتی چوکی تشکیل دی۔ اس بستی کو مقامی طور پر چینا پٹنم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کمپنی نے یہاں آبادکاری کا حق مقامی تیلگوز مین داروں، کالا ہستی کے نائکوں سے خریدلیا جو اس علاقے میں تجارتی سرگرمی کی حمایت کے بے حد مشتاق تھے۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ رقابت (63-1746) کے سبب انگریزوں کو مدراس کی قلعہ بندی کرنی پڑی اور اپنے نمائندوں کو سیاسی اور انتظامی امور کے اختیارات سونپ دیے۔ 1761 میں فرانسیسیوں کی شکست کے ساتھ مدراس زیادہ محفوظ ہوگیا اور ایک اہم تجارتی مرکز کے طور پر نمو پذیر ہونا شروع ہوا۔ یہاں انگریزوں کی فوقیت اور ہندوستانی تاجروں کی ماتحت حیثیت زیادہ واضح دکھائی دیتی تھی۔

فورٹ سینٹ جارج وہائٹ ٹاؤن کا مرکز بن گیا جہاں زیادہ تر یوروپی لوگ رہتے تھے۔ دیواروں اور فصیلی برجوں نے اسے نمایاں گھیرابندی بنادیا تھا۔ قلعے کے اندر رہنے کی اجازت رنگ اور مذہب سے طے ہوتی تھی۔ کمپنی اپنے ملازمین کو کسی ہندوستانی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ انگریزوں کے علاوہ ڈچوں اور پرتگالیوں کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت تھی کیونکہ یہ یوروپی اور عیسائی تھے۔ انتظامی اور عدلیہ نظام بھی سفید آبادی کی طرفداری کرتا تھا۔ کم تعداد میں ہونے کے باوجود یوروپی حکمراں تھے اور مدراس کا ارتقا شہر میں سفید اقلیت کی آسانی اور ضروریات کو سامنے رکھ کر کیا گیا۔

بلیک ٹاؤن قلعے کے بیرونی اطراف ترقی پذیر رہا۔ اس کو سیدھی قطاروں میں تعمیر کیا گیا جو نوآبادیاتی شہروں کی خصوصیت تھی۔ تاہم 1700 کی دہائی کے وسط میں اسے مسمار کردیا گیا۔ کیونکہ قلعہ کے اطراف کے علاقے کو صاف کرکے محفوظ حلقہ بنایا گیا تھا۔ ایک نئے بلیک ٹاؤن کو شمال میں آگے کی طرف ارتقا پذیر کیا گیا۔ یہاں بنکروں، دست کاروں، بچولیوں اور ترجمانوں کے مکان تھے جو کمپنی کی تجارت میں نہایت اہم کردار ادا کرتے تھے۔

شکل12.16

مدراس کا نقشہ

سینٹ جارج فورٹ کے اطراف میں وہائٹ ٹاؤن بائیں جانب اوردائیں جانب پرانا بلیک ٹاؤن۔فورٹ سینٹ جارج دائرہ میں نشان زد ہے۔

توجہ دیجیے کہ بلیک ٹاؤن کس طرح تعمیر کیا گیا۔

شکل12.17

بلیک ٹاؤن کا ایک حصہ،مدراس،تھامس اورولیم ڈینیل کی بنائی ہوئی تصویر۔ڈینیل کی ڈرائننگ پر مبنی اورینٹل سینری میں شائع تصویر1798

اس تصویر میں آپ جو کھلی جگہ دیکھ رہے ہیں وہ پرانے بلیک ٹاؤن کومسمار کر کے تیار کی گئی تھی۔بنیادی طور پراسے گولہ باری کے مقصد سے صاف کیا گیا تھا۔بعد میں اس کھلے میدان کی ہرے علاقے (میدان) کے طور پر دیکھ بھال کی گئی۔خط افق پر نئے بلیک ٹاؤن کا ایک حصہ بھی دیکھا جا سکتا ہے جو قلعے سے دور وجود میں آیا تھا۔

اپنے مندر اور بازار کے اردگرد تعمیر رہائشی مکان کے ساتھ نیا بلیک ٹاؤن روایتی ہندوستانی شہروں کے مشابہ تھا۔ بستی کے درمیان ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آڑی ترچھی تنگ گلیاں تھیں۔ یہاں واضح قابل شناخت ذات کے لوگوں کے محلے تھے۔ بنکروں کے علاقے کا مطلب چنٹا دری پیٹ تھا۔ واشر مین پیٹ رنگ سازوں اور کپڑے سفید کرنے والوں (دھوبی) کی کالونی تھی۔ رویا پورم عیسائی ملاحوں کی بستی تھی جو کمپنی کے لیے کام کرتے تھے۔

پیٹ ایک تامل لفظ ہے، جس کے معنی بستی کے ہیں جب کہ پورم لفظ گاؤں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

عمدہ مواقع پیدا کرکے اور مختلف جماعتوں کے لیے جگہ مہیا کرا کے اطراف کے بہت سارے گاؤں کو ملا کر مدراس کو بنایا گیا۔ بہت سے معاشی امور کی انجام دہی کرنے والی مختلف جماعتیں آئیں اور مدراس میں آباد ہوگئیں۔ دو بھاشی ایسے ہندوستانی تھے جو دو زبانیں بول سکتے تھے یعنی مقامی زبان اور انگریزی۔ وہ ایجنٹ اور سوداگر کی شکل میں کام کرتے تھے اور ہندوستانی سماج نیز انگریزوں کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کرتے تھے۔ وہ دولت حاصل کرنے کے لیے حکومت میں اپنی مراعات یافتہ پوزیشن استعمال کرتے تھے۔ بلیک ٹاؤن میں فلاحی کاموں اور مندروں کی سرپرستی کرنے سے سماج میں ان کی طاقتور پوزیشن قائم ہوگئی تھی۔

ابتدا میں کمپنی میں ملازمت پانے والے ویلاروں نے اجارہ داری قائم کرلی۔ یہ ایک مقامی ذات تھی جس نے برطانوی حکمرانوں کے ذریعہ مہیا کیے گئے نئے مواقع کا فائدہ اٹھایا۔ انیسویں صدی میں انگریزی تعلیم کی وسعت کے ساتھ برہمنوں نے انتظامیہ میں مساوی پوزیشن پانے کے لیے مقابلہ آرائی شروع کردی۔ ایک طاقتور تجارتی گروہ تیلگو کوماٹیوں کا تھا جو شہر میں اناج کی تجارت پر کنٹرول رکھتا تھا۔ اٹھارھویں صدی سے گجراتی مہاجن (بینکر) بھی یہاں موجود تھے جبکہ پیریار اور وینیار غریب مزدور طبقے کی تشکیل کرتے تھے۔ ارکاٹ کے نواب کے قریب واقع ٹریلی کین (Triplicance) میں آباد ہوگئے جو ایک بڑی مسلم بستی کا مرکز بن گیا تھا۔ اس سے پہلے مائلا پور اور ٹریلی کین ہندو مذہبی مرکز تھے جو برہمنوں کے کنٹرول میں تھے۔ سان تھوم کیتھڈرل کے ساتھ رومن کیتھولک طبقے کا مرکز تھا۔ یہ تمام بستیاں مدراس شہر کا حصہ بن گئیں۔ اس طرح بہت سے گاؤں کو ملا لینے کے بعد مدراس ایک وسیع گراں اور کم گھنی آبادی والا شہر بن گیا جس پر یوروپی سیاحوں کی توجہ بھی مرکوز ہوئی اور سرکاری افسران نے بھی اس پر رائے زنی کی۔

شکل 12.18
یونامالی روڈ پر بنا ہوا ایک گارڈن ہاؤس

جوں جوں انگریزوں نے اپنی طاقت مستحکم کی یوروپین باشندے قلعے سے باہر نکلنے لگے۔ باغیچہ مکان (گارڈن ہاؤس) سب سے پہلے ماؤنٹ روڈ اور پوامالی روڈ— دواہم سڑکوں پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بننا شروع ہوگئے، یہ قلعے سے چھاؤنی تک جانے والی سڑک تھی۔ دولت مند ہندوستانی بھی انگریزوں کی طرح رہنے لگے جس کے نتیجے میں مدراس کے مرکز کے اطراف میں واقع گاؤں کی جگہ بہت سے نئے شہری مضافاتی علاقے پیدا ہوگئے۔ یہ اس لیے ممکن ہوسکا کیونکہ دولت مند لوگ نقل وحمل کا خرچ برداشت کر سکتے تھے۔ غریب لوگ اپنے کام کرنے کی جگہ کے نزدیک گاؤں میں آباد ہوگئے۔ مدراس کی بتدریج شہرکاری کا مطلب یہ تھا کہ ان گاؤں کے درمیان والا علاقہ شہر کے اندر آ گیا تھا جس کے نتیجے میں مدراس ایک نیم دیہی شہر نظر آنے لگا۔

ماخذ 3

ایک دیہی شہر؟ (A rural city?)

1908 کے اپیریل گزیٹیر سے مدراس کے ضمن میں یہ اقتباس پڑھیے:

بہتر یوروپین مکان کمپاؤنڈ کے وسط میں تعمیر کیے جاتے تھے جو تقریباً پارکوں جیسا وقار حاصل کر لیتے اور ان کے درمیان لگ بھگ دیہی فیشن کی طرح دھان کے کھیت آتے جاتے رہتے۔ حتی کہ بلیک ٹاؤن اور ٹرپلی کین جیسی زیادہ گھنی فعال آبادی والے علاقے میں بھی ایسا اژدحام کم پایا جاتا تھا جیسا کہ بہت سے دیگر شہروں میں پایا جاتا ہے......

رپورٹ میں لکھے ہوئے بیانات سے اکثر رپورٹ لکھنے والے کے نئے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس بیان میں کس قسم کے شہری علاقے پر رپورٹر خوشی کا اظہار کرتا ہے اور کسی قسم کے علاقے پر تحقیر کا اظہار کرتا ہے؟ کیا آپ ان خیالات سے اتفاق کرتے ہیں؟

4.2 کلکتہ کی شہری منصوبہ بندی (Town planning in Calcutta)

جدید شہری منصوبہ بندی کی شروعات نوآبادیاتی شہروں میں ہوئی۔ یہ ضرورت مکمل شہری علاقے کا خاکہ تیار کرنے اور شہری زمین کے استعمال کے مقررہ ضابطہ کے لیے تھی۔ منصوبہ بندی عموماً اس بات سے محرک ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ شہر کیسا نظر آئے گا، اس کو کس طرح ارتقا پذیر کیا جائے اور کن طریقوں سے علاقوں کو منظم اور ترتیب دیا جائے۔ شہری زندگی اور وہاں کے علاقوں پر ریاست کی طاقت کو مان کر مشق کی جاتی تھی، اس سے ارتقا کے نظریہ کی ترجمانی ہوتی تھی۔

انگریزوں نے بنگال میں اپنی حکمرانی کے ابتدائی سالوں سے ہی شہری منصوبہ بندی کا کام خود اپنے ہاتھوں میں کیوں لیا اس کے بہت سے اسباب تھے۔ ایک فوری وجہ حفاظت تھی۔ 1756 میں بنگال کے نواب سراج الدولہ نے کلکتہ پر حملہ کیا اور چھوٹے قلعہ جس کو انگریز تاجروں نے گودام کے لیے تعمیر کیا تھا، تباہ کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز تاجر مسلسل نواب کی خودمختاری پر سوال اٹھا رہے تھے۔ وہ سرحدی ٹیکس ادا کرنے میں تذبذب کا شکار تھے اسی لیے نواب کی شرائط پر تعمیل کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ اپنی شرائط پر کام کرنے کی امید رکھتے تھے۔ جبکہ سراج الدولہ اپنی مختارکاری کو منوانا چاہتا تھا۔

بعدازاں 1757 میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا جس پر آسانی سے حملہ نہ کیا جا سکے۔ کلکتہ کی نشوونما تین گاؤں جنھیں ستانتی، کولکاتا اور گووند پور کہا جاتا تھا، کو ملا کر ہوئی۔ کمپنی نے جنوب بعید میں واقع گاؤں

گووند پور کی جگہ کو صاف کرنے کے لیے یہاں کے تاجروں اور بنکروں کو اس جگہ کو چھوڑ دینے کے لیے کہا۔ نئے قلعہ ولیم کے اطراف ایک بڑی کشادہ جگہ خالی چھوڑ دی گئی جو مقامی طور پر میدان یا ''گڑ یرمٹھ'' کے نام سے معروف تھی یہ اس لیے کیا گیا کیونکہ اگر دشمن فوج قلعہ کی طرف آگے بڑھے تو اس کے خلاف گولہ باری کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ ایک دفعہ جب انگریزوں کو کلکتہ میں اپنی مستقل موجودگی کے متعلق پختہ یقین ہو گیا تو وہ قلعہ کے باہر نکلنے لگے اور میدان کے بیرونی حاشیہ کے ساتھ ساتھ رہائشی عمارت بنانی شروع کر دیں۔ اس طرح کلکتہ میں انگریزوں کی بستیاں بتدریج ایک واضح شکل اختیار کرنے لگیں۔ قلعہ کے اردگرد کی وسیع کشادہ جگہ (جو ابھی تک موجود ہے) ایک امتیازی جگہ بن گئی۔ منصوبہ بندی کے حوالے سے کلکتہ میں یہ پہلا اہم شہر تھا۔

کلکتہ میں شہری منصوبہ بندی کی تاریخ بلاشبہ فورٹ ولیم کی عمارت اور میدان کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ 1798 میں لارڈ ویلزلی گورنر جنرل بنا۔ اس نے کلکتہ میں اپنے لیے ایک بڑا محل ''گورنمنٹ ہاؤس''، تعمیر کیا۔ یہ عمارت انگریزوں کے اقتدار کی متوقع ترسیل تھی۔ وہ ہندوستانی آبادی والے شہر کے حصے کے اژدحام، معمول سے زیادہ ہریالی، گندے تالابوں، بدبو اور گندے پانی کی نکاسی کی خستہ حالت کے متعلق پُرتشویش تھا۔ ان حالات سے انگریز فکرمند تھے کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ ایک وقت میں مرطوب نشیبی علاقوں والی زمین اور ٹھہرے پانی کے تالابوں سے نکلنے والی زہریلی گیس بہت سی بیماریوں کا سبب ہوتی ہے۔ منطقہ حارہ کے موسمی حالات کو خود غیر صحت مند

گولہ باری کی جگہ یا راستہ
(The line of fire)

یہ دلچسپ ہے کہ کلکتہ کے لیے جو نمونہ تیار کیا گیا وہ دیگر بہت سے شہروں میں بھی دوہرایا گیا۔ 1857 کی بغاوت کے دوران بہت سے شہر باغیوں کی محفوظ جائے پناہ بن گئے۔ ان کی فتح کے بعد انگریز ان مقامات کو خود اپنے لیے محفوظ بنانے لگے۔ مثال کے طور پر دہلی میں انھوں نے لال قلعہ پر قبضہ کیا اور یہاں ایک فوج تعینات کر دی۔ پھر انھوں نے قلعے کے نزدیک بنی ہوئی عمارات کو منہدم کر دیا اور ہندوستانی محلوں اور قلعے کے درمیان ایک وسیع وعریض خالی جگہ بنائی۔ اس کے لیے دلیل وہی دی گئی جو سو سال قبل کلکتہ میں دی گئی تھی: پیش بندی کے مدنظر اگر شہر کے لوگ پھر سے ایک مرتبہ فرنگی راج کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں تو ان پر راست گولہ باری کے لیے مناسب کشادہ جگہ ہونا ضروری تھی۔

شکل 12.19

گورنمنٹ ھائوس، کلکتہ۔ چارلس ڈی اوئلی کی بنائی تصویر 1848

گورنر جنرل کی رہائش گاہ، گورنمنٹ ہاؤس، جس کو ویلزلی نے برطانوی راج کی جاہ وجلال کی علامت کے طور پر تعمیر کروایا تھا۔

شکل 12.20

کولکاتہ میں چت پور روڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک بازار

شہروں کی مقامی جماعتوں کے لیے بازار تجارتی اور سماجی مبادلے کی جگہ تھی۔ یوروپ کے لوگ بازار کو دیکھ کر مسحور ہوتے تھے لیکن اس کو اژدحام سے پُر اور گندی جگہ کے طور پر بھی دیکھتے تھے۔

اور ناتواں کرنے والے حالات کے طور پر بھی دیکھا جاتا تھا۔ شہر میں کھلی جگہیں پیدا کر کے شہر کے ماحول کو صحت مند بنانا ہی واحد راستہ تھا۔ 1803 میں شہری منصوبہ بندی کی ضرورت کے لیے لارڈ ویلزلی نے ایک انتظامی حکم جاری کیا اور اس مقصد کے لیے مختلف کمیٹیاں قائم کیں۔ بہت سے بازاروں، گھاٹوں، قبرستانوں اور دباغ خانوں کو صاف کیا گیا یا ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد سے ''عوامی صحت'' کا تصور ایک ایسا خیال بن گیا جس کا شہر کی صفائی اور شہری منصوبہ بندی میں اعلان کیا گیا۔

ویلزلی کے جانے کے بعد شہری منصوبہ بندی کا کام حکومت کی مدد سے لاٹری کمیٹی (1817) کے ذریعہ جاری رہا۔ لاٹری کمیٹی کا نام اس لیے پڑا کیونکہ شہر کی اصلاح کے لیے رقم عوام میں لاٹری بیچ کر فراہم کی جاتی تھی۔ بالفاظ دیگر انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں شہر کی ترقی کے لیے رقم فراہم کرنا عوامی ذہن (فلاحی) کے شہریوں کی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا نہ کہ صرف حکومت کی۔ لاٹری کمیٹی نے شہر کا ایک نیا نقشہ بنوایا جس سے کلکتہ کی ایک جامع تصویر سامنے آسکے۔ کمیٹی کی اہم سرگرمیوں میں سے ایک شہر کے ہندوستانی آبادی والے حصوں میں سڑکوں کی تعمیر تھی اور ندی کنارے سے ''غیر قانونی قبضے'' صاف کرنا تھا۔ کلکتہ کے ہندوستانی آبادی والے علاقوں کو صاف کرنے کی مہم میں کمیٹی نے بہت سی جھونپڑیوں کو ہٹا دیا اور غریب مزدور طبقے کو وہاں سے بے دخل کر دیا اور انھیں کلکتہ کے قرب وجوار کے علاقے کی طرف دھکیل دیا گیا۔

آئندہ کچھ دہائیوں میں وبائی امراض کے خطرہ سے شہری منصوبہ بندی کو مزید قوت ملی۔ 1817 میں ہیضہ پھیلنا شروع ہوا اور 1896 میں پلیگ پھیل گیا۔ تاہم میڈیکل سائنس کے ذریعہ بھی ان بیماریوں کی وجہ ثابت نہیں ہوسکی۔ حکومت نے اس وقت کے مقبول نظریہ

ماخذ 4

''ہر قسم کی زحمت وتکلیف کے لیے مقررہ ضابطے''
("For the regulation of nuisances of every description")

انیسویں صدی کی ابتدا تک انگریز یہ محسوس کرنے لگے کہ سماجی زندگی کے سبھی پہلوؤں کو منضبط کرنے کے لیے مستقل اور عوامی قانون تشکیل دینا ضروری ہیں حتی کہ نجی عمارات اور عوامی سڑکوں کی تعمیر بھی واضح معیاری قوانین کے مطابق ہونا ضروری تھی۔ ویلزلی نے اپنے کلکتہ منٹ (Culcatta Munute)(1803) میں لکھا تھا:

> یہ سرکار کا بنیادی فرض ہے کہ وہ سڑکیں، گلیاں، نالیاں اور پانی کے نظم میں اصلاح کے لیے ایک جامع نظام بنا کر اور مکانات کی تعمیر وتقسیم اور عوامی عمارات کے لیے مستقل قانون و ضابطے متعین کر کے اور ہر قسم کی زحمت وتکلیف کے لیے مقررہ ضابطے بنا کر وہ اس بڑے شہر کے باشندوں کے لیے صحت، تحفظ اور سہولت مہیا کرائے۔

بودوباش کے حالات اور بیماری کے پھیلنے کے درمیان ایک راست تعلق ہوتا ہے، کی بنیاد پر عمل جاری رکھا۔ اس طرح کے خیالات کو دوار یکاناتھ ٹیگور اور رستم جی کوواس جی جیسے ذی قدر لوگوں کی حمایت ملی جو محسوس کرتے تھے کہ کلکتہ کو مزید صحت مند بنانا ضروری ہے، گھنی آبادی والے علاقوں کو گندے علاقوں کے طور پر دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ ہوا کی گردش میں راست طور پر سورج کی روشنی میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ اس وجہ سے مزدور طبقے کی جھونپڑیوں یا ''بستیوں'' کو انہدام کا ہدف بنایا گیا۔ شہر کے غریب لوگوں یعنی مزدوروں، پھیری والے، دست کاروں، جمالوں اور بے روزگاروں کو ایک بار پھر طاقت کے ذریعہ شہر کے دور کے حصوں میں دھکیل دیا گیا۔ بار بار آگ لگنے کے سبب عمارتی تعمیر کے سخت ضابطے بنے، مثال کے طور پر 1836 میں پھوس کے جھونپڑی بنانے پر پابندی لگادی گئی اور اینٹ کی بنی ہوئی چھت کو واجب التعمیل قرار دیا گیا۔

ویلزلی نے حکومت کے فرائض کی کس طرح توضیح کی ہے؟ اس حصہ کو پڑھیے اور بحث کیجیے کہ اگر ان خیالات کو نافذ کیا جاتا تو ان سے شہر میں آباد ہندوستانیوں پر کیا اثر پڑتا۔

بستی (بنگالی اور ہندی میں) کے حقیقی معنی محلّہ یا چھوٹی آبادی تھا تاہم انگریزوں نے اس لفظ کا مفہوم محدود کردیا اور اس کے معنی غریبوں کی وقتی یا عارضی جھونپڑیوں کے لیے مراد لیے جانے لگے۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگریزوں کے دستاویزات میں ''بستی''، گندی پسماندہ بستی بن گیا۔

انیسویں صدی کے آخر تک شہر میں سرکاری دخل اندازی مزید سخت ہوگئی۔ وہ دن جاچکے تھے جب شہری منصوبہ بندی کو حکومت اور باشندوں کے ذریعہ مشترکہ کام کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اس کے بجائے حکومت نے بشمول مالی وسائل شہری منصوبہ بندی کی تمام پیش قدمی کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس عمدہ موقع کا استعمال زیادہ جھونپڑیوں کو صاف کرنے کے لیے کیا گیا اور دوسرے علاقوں کی قیمت پر شہر کے انگریز آبادی والے حصوں کو ترقی دی گئی۔ ''صحت مند'' اور ''غیر صحت مند'' کی نئی تقسیم کے ذریعہ ''وہائٹ ٹاؤن'' اور ''بلیک ٹاؤن'' والے نسلی امتیاز پر وجود پذیر تقسیم کو مزید تقویت ملی۔ میونسپلٹی میں موجود ہندوستانی نمائندوں نے شہر کے یوروپین آبادی والے حصوں کی ترقی کے تئیں انگریزوں کے جانب دارانہ تعصب کے خلاف احتجاج کیا۔ ان سرکاری پالیسیوں کے خلاف عوام کے احتجاج نے ہندوستانیوں کے اندر نوآبادیاتی مخالف جذبات اور قوم پرستی کو تقویت دی۔

اپنی ترقی پذیر سلطنت کے ساتھ انگریز کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسے شہروں کو مرعوب کن شاہی راجدھانیوں میں تبدیل کرنے کے میلان کو ترقی دینے لگے۔ اس صورت حال سے شہروں کے جاہ وجلال اور شاہی اقتدار کے اختیار کی ترجمانی ہوتی تھی۔ شہری منصوبہ بندی میں ہر اس چیز کی نمائندگی کی گئی جن کے لیے انگریز دعویٰ کرتے تھے:

شکل 12.21
جے اے ایچ شالج کے ذریعہ بنائے گئے منصوبہ سے (1825)۔ لاٹری کمیٹی اصلاحات کے بعد کلکتہ میں یوروپین ٹاؤن کا ایک حصہ آپ کمپاؤنڈ (احاطہ) کے ساتھ یوروپی مکانات کو دیکھ سکتے ہیں۔

شکل 12.22
کلکتہ میں ایک بستی

عقلی نظم وترتیب، نہایت محتاط بجا آوری اور مغربی جمالیاتی نصب العین۔ شہروں کا صاف ستھرا اور منظم ومنصوبہ بند اور خوب صورت ہونا ضروری تھا۔

4.3 بمبئی میں فن تعمیر

(Architecture in Bombay)

اگر اس شاہی بصیرت کو حقیقت آفریں بنانے کا ایک طریقہ شہری منصوبہ بندی کے ذریعہ تھا تو دوسرا طریقہ شہروں میں تزئین کاری کے ساتھ شاندار عمارتوں کی تعمیر کے حوالے سے تھا۔ شہروں میں بشمول قلعے، سرکاری آفس، تعلیمی ادارے، مذہبی عمارتیں، یادگاری مینار، تجارتی ڈپو یا حتی کہ گودی اور پل جیسی عمارتیں بھی ہوسکتی تھیں۔ گوکہ بنیادی طور پر یہ عمارتیں دفاع، نظم ونسق اور تجارت جیسے امور کی ضروریات کو انجام دیتی تھیں۔ یہ شاذ و نادر ہی سادہ عمارتیں ہوتی تھیں۔ اکثر ان عمارتوں کا مطلب شاہی اقتدار، قوم پرستی اور مذہبی وقار جیسے تصورات کی نمائندگی تھا۔ آیئے دیکھیں کہ بمبئی کے معاملے میں اس تصور کو کس طرح نمونہ بنا کر دکھایا گیا ہے۔

بمبئی ابتدائی طور پر سات جزیروں پر مشتمل تھا۔ جوں جوں آبادی بڑھی زیادہ جگہ پیدا کرنے کے لیے جزیروں کو آپس میں جوڑ دیا گیا اور یہ بتدریج ایک بڑے شہر میں مل گئے۔ بمبئی نوآبادیاتی ہندوستان کی تجارتی راجدھانی تھا۔ مغربی ساحل پر اولین بندرگاہ ہونے کے سبب یہ بین الاقوامی تجارت کا مرکز تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستان کی نصف درآمد برآمد بمبئی کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اس تجارت کی سب اہم شے افیم تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی چین کو برآمد کرتی تھی۔ ہندوستانی تاجر اور ثالثی اس کو سپلائی کرتے تھے اور اس کی تجارت میں حصہ لیتے تھے اور انھوں نے بمبئی کی معیشت کو مالوا، راجستھان اور سندھ سے مربوط کرنے میں مدد کی تھی جہاں افیم پیدا ہوتی تھی۔ کمپنی کے ساتھ یہ اشتراک منافع بخش تھا اور یہ ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کی نشوونما کا سبب بنا۔ بمبئی کے سرمایہ دار، پارسی، مارواڑی، کونکنی مسلم، گجراتی، بنیا، بوہرہ، یہودی اور آرمنیائی جیسے متنوع جماعتوں سے آگے آئے۔

جیسا کہ آپ نے (باب 10) پڑھا جب 1861 میں امریکی خانہ جنگی شروع ہوئی تو جنوبی امریکہ سے آنے والی کپاس بین الاقوامی مارکیٹ میں آنا بند ہوگئی۔ یہ ہندوستانی کپاس کے مطالبہ میں ابال کا سبب بنا جو بنیادی طور پر دکن کے علاقے میں پیدا کی جاتی تھی۔ ایک بار پھر

ہندوستانی تاجروں اور ثالثوں کے لیے زبردست منافع کمانے کا ایک موقع ملا۔ 1869 میں سوئز نہر کو کھول دیا گیا اور اس سے عالمی معیشت کے ساتھ بمبئی کے رابطے مزید مضبوط ہوئے۔ بمبئی کی حکومت اور ہندوستانی تاجروں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بمبئی کو Urbs Prima in Indis ایک (لاطینی محاورہ) جس کے معنی ہندوستان کا سب سے اہم شہر قرار دیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک بمبئی میں ہندوستانی تاجر کاٹن مل (سوتی کپڑے کی مل) جیسی نئی مہم جوئی میں اپنی دولت کی سرمایہ کاری کر رہے تھے۔ اور ساتھ ہی شہر میں عمارتی سرگرمیوں کی بھی سرپرستی کر رہے تھے۔

جوں ہی بمبئی کی معیشت نے ترقی کی، انیسویں صدی کے وسط سے ریلوے اور جہاز رانی کی توسیع اور انتظامی ڈھانچہ بنانے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ اس وقت بہت سے نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ یہ عمارتیں حکمرانوں کے اعتماد و یقین اور ثقافت کی ترجمانی کرتی تھیں جس کا طرز تعمیر عموماً یوروپی طرز کا تھا۔ اس یوروپی طرز کی درآمدگی میں شاہی بصارت کی ترجمانی کئی طریقوں سے ہوتی تھی۔ اولاً ایک بیگانہ ملک میں معروف زمینی منظر تخلیق کرنے اور اسی طرح نوآبادیات میں گھر جیسا محسوس کرنے کی انگریزوں کی خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ دوم انگریزوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یوروپی طرز ان کی فوقیت، اقتدار اور مختار کاری کی عمدہ علامت ہوگی۔ سوم، وہ سوچتے تھے کہ یوروپی طرز کی عمارتوں سے نوآبادیاتی آقاؤں اور ان کی ہندوستانی رعیت کے بیچ فرق اور فاصلہ واضح نظر آئے۔

ابتدائی مرحلے میں یہ عمارتیں روایتی ہندوستانی عمارتوں کے ساتھ عجیب نظر آتی تھیں۔ بتدریج ہندوستانی بھی یوروپی طرز تعمیر کے عادی ہوگئے اور اپنے لیے بھی ایسی عمارتیں بنانے لگے۔ انگریزوں نے بھی اپنی ضروریات کے موافق کچھ ہندوستانی طرزوں کو اپنالیا۔ اس کی ایک مثال بنگلے ہیں جو بمبئی اور پورے ملک میں سرکاری افسران کے ذریعہ مستعمل تھے۔ انگریزی نام Bunglow بنگلہ سے مشتق ہے یعنی ایک روایتی بنگالی پھوس کی جھونپڑی۔ نوآبادیاتی بنگلہ ایک وسیع زمین پر بنا ہوتا تھا جو تخلیہ (privacy) کو یقینی بناتا تھا اور اطراف کی ہندوستانی دنیا سے ایک فاصلے کو نشان زد کرتا تھا۔ روایتی ڈھلواں چھت اور چاروں طرف تعمیر برآمدہ (veranda) گرمی کے مہینوں میں بنگلے کو سرد رکھتا تھا۔ اس کے احاطے میں کسی بڑے آدمی کے گھریلو نوکروں

شکل 12.23
بمبئی میں بنا ہوا ایک بنگلہ انیسویں صدی

کے لیے علاحدہ کوارٹر ہوتے تھے۔سول لائنز میں تعمیر اس طرح کے بنگلے بلا شرکت غیرے نسلی تعصب کا محصورہ بن گئے جن میں حکمراں جماعتیں ہندوستانی لوگوں کے ساتھ روزانہ کے تعلقات کے بغیر خود کفیل زندگی جی سکتے تھے۔

عوامی عمارتوں میں تین کشادہ تعمیراتی طرز کا استعمال کیا جاتا تھا۔ان میں سے دو طرز انگلینڈ میں رائج وضع سے راست طور پر درآمد کیے گئے۔پہلی طرز کو جدید کلاسیکل (Neo-Classical) کہا جاتا تھا۔ اقلیدس (Geometrical) ساخت پرمبنی تعمیر کے ساتھ سامنے کی طرف اونچے ستونوں کی تعمیر اس کی خصوصیت تھی۔ بنیادی طور پر یہ طرز قدیم روم کی نمائندہ عمارتوں سے اخذ کی گئی تھی اور بعد میں یوروپی نشاۃ ثانیہ کے دوران اس کو نئے سرے سے مطابقت پیدا کر کے مقبول بنایا گیا۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے لیے اسے خاص طور پر مناسب سمجھا جاتا تھا۔انگریزوں کا تصور تھا کہ جس طرز سے شاہی روم کا جاہ وجلال ظاہر ہوتا ہے اس کو شاہی ہندوستان کے وقار کا اظہار بھی بنایا جا سکتا ہے۔اس فن تعمیر کا مخرج بحیرۂ روم ہونے کے سبب اس کو منطقہ حارہ کے موسم کے موزوں بھی سمجھا جاتا تھا۔ بمبئی کا ٹاؤن ہال (تصویر 12.24) 1833 میں اسی طرز پر تعمیر ہوا تھا۔ 1860 کی دہائی میں کپاس میں آئی تیزی کے زمانے میں تعمیر تجارتی عمارتوں کا دیگر گروپ ایلفنسٹن سرکل تھا بعد میں اس کا ہارنیمان سرکل (Horniman Circle) نام ایک انگریز ایڈیٹر جو ہندوستانی قوم پرستوں کی جرات مندانہ حمایت کرتے تھے کے نام پر پڑا۔ یہ عمارت اٹلی کے عمارتی نمونے سے تحریک یافتہ تھی۔زمینی سطح پر مسقّف راہ داریاں (coverd arcades) کا اختراعی استعمال دکانداروں اور پیدل چلنے والوں کو بمبئی کی جھلستی دھوپ اور بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا گیا تھا۔

شکل 12.24
بمبئی کا ٹاؤن ہال جس میں اب ایشیاٹک سوسائٹی آف بامبے کا دفتر ہے۔

ایک دیگر طرز جس کا وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا نیو گوتھک (Neo-Gothic) تھی۔ اونچی ڈھلواں چھتیں۔نوک دار محرابیں اور جزویات کے ساتھ سجاوٹ اس طرز کی خصوصیت تھی۔ گوتھک طرز کی جڑیں خاص طور پر چرچ عمارتوں سے وابستہ تھیں جو عہد وسطیٰ کے دوران شمالی یوروپ میں تعمیر کیے گئے تھے۔انگلینڈ میں نیو گوتھک طرز کی تجدید انیسویں صدی کے وسط میں ہوئی۔ یہ وہی وقت تھا جب حکومت بمبئی میں بنیادی ڈھانچہ تعمیر کر رہی تھی اور اس کے لیے بمبئی میں

ڈھلوان چھتوں (Pitched roof) کو بیان کرنے کے لیے آرکیٹک (ماہر فن تعمیرات) سلامی دار چھت اصطلاح (Pitched roof) کا استعمال کرتے ہیں۔ابتدائی بیسویں صدی سے بنگلوں میں سلامی دار چھتوں یعنی ڈھلواں چھتوں کا رواج کم ہو گیا تھا گو کہ عام منصوبہ بندی ویسی ہی رہی۔

شکل 12.25
ایلفنسٹن سرکل
گریکورومن فن تعمیر سے اخذ شدہ ستونوں اور محرابوں پر دھیان دیجیے۔

اسی طرز کو نئے طور پر استعمال کیا گیا۔ سیکریٹریٹ، بمبئی یونیورسٹی اور ہائی کورٹ جیسی مرعوب کن عمارتوں کا گروپ سمندر کے کنارے اسی طرز میں تعمیر کیا گیا۔

ان میں سے کچھ عمارتوں کے لیے ہندوستانیوں نے رقم دی۔ یونیورسٹی ہال سرکوواس جی جہاں گیر ریڈی منی کے ذریعہ عطیہ دی گئی رقم سے تعمیر ہوا جو ایک دولت مند پارسی تاجر تھے۔اسی طرح یونیورسٹی لائبریری کا گھنٹہ گھر پریم چندرائے چند بینکر (مہاجن) کے ذریعہ دی گئی رقم سے تعمیر ہوا اور اس کا نام ان کے والد کے نام پر راجابائی ٹاور رکھا گیا۔ ہندوستانی تاجر نیو گوتھک طرز اپنانے میں خوشی محسوس کرتے تھے چونکہ ان کا ماننا تھا کہ انگریزوں کے ذریعہ لائے گئے بہت سے تصورات کی طرح عمارتی طرز بھی ترقی پسند تھا اور اس کے ذریعہ بمبئی کو ایک جدید شہر بنانے میں مدد ملے گی۔

شکل 12.26
ایچ. سینٹ کلیئرولکنس کے ذریعہ ڈیزائن کیا گیا۔ بامبے سیکریٹریٹ دی بلڈر، 20 نومبر 1857 سے لی گئی قلمی تصویر۔

شکل 12.27
وکٹوریہ ٹرمینس ریلوے اسٹیشن
ایف.ڈبلیو اسٹیون کے ذریعہ ڈیزائن کردہ
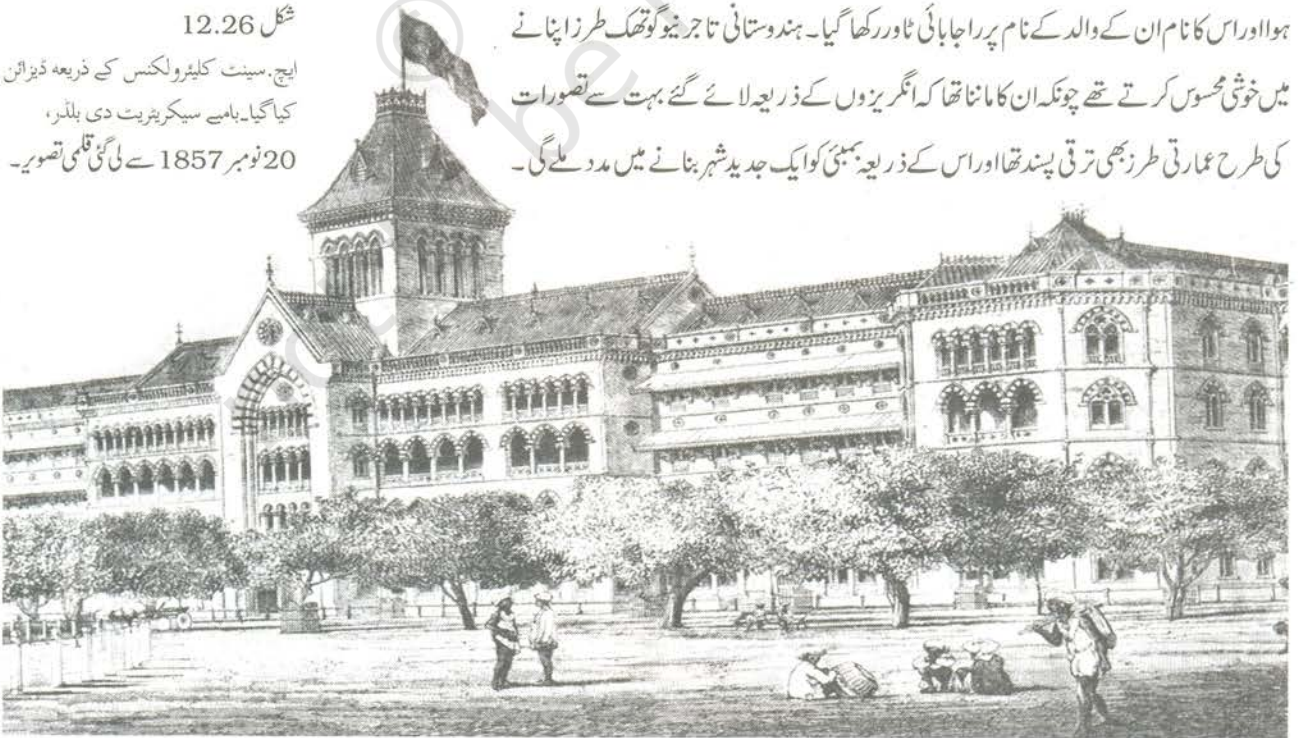
تاہم نیو گوتھک طرز کی سب سے قابل دید مثال وکٹوریہ ٹرمینس ہے جو گریٹ انڈین پیننِ سولر ریلوے کمپنی کا اسٹیشن اور صدر دفتر ہوا کرتا تھا۔ انگریزوں نے شہروں میں ریلوے اسٹیشنوں کے ڈیزائن اور تعمیر میں کافی سرمایہ کاری کی تھی کیونکہ وہ ایک کل ہند ریلوے نیٹ ورک کی کامیابی کے ساتھ تعمیر پر فخر کرتے تھے۔ایک گروپ کی طرح سینٹرل بمبئی کے آسمانی پس منظر میں ان عمارتوں کا غلبہ تھا اور یکساں نیو گوتھک طرز شہر کو ایک ممتاز انفرادیت عطا کرتا تھا۔

بیسویں صدی کی شروعات میں ایک نیا مخلوط الاصل فن تعمیر ارتقا پذیر ہوا جو ہندوستانی اور یوروپی طرز کے عناصر کو ملانے سے بنا تھا۔اس کو انڈو سارا سینک (Indo–Saracenic) کہا گیا۔لفظ ''انڈو'' ہندو کے لیے علامتی تھا اور ''سارا سین'' کی اصطلاح یوروپی لوگ مسلمانوں کی عرفیت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ہندوستان میں عہد وسطیٰ کی عمارتیں اپنے گنبدوں، چھتریوں، جالیوں، محرابوں وغیرہ کے ساتھ اس طرز کے لیے محرک بنیں۔عوامی فن تعمیر یوروپی اور ہندوستانی طرز کے انضمام کے ذریعہ انگریز یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ ہندوستان کے جائز حکمراں ہیں۔

شکل 12.28
مدراس لاکورٹس
جب بمبئی گوتھک طرز کی تجدید کاری کا بنیادی مرکز بنا ہوا تھا تب مدراس میں انڈو سارسینک طرز فروغ پا رہا تھا۔لاکورٹس کی عمارت کا ڈیزائن ایک بار پھر گوتھک طرز کے ساتھ پٹھان عناصر کا اتحاد تھا۔

اس طرز کی سب سے مشہور مثال گیٹ وے آف انڈیا ہے جو 1911 میں بادشاہ جارج پنجم اور رانی میری کے استقبال کے لیے روایتی گجراتی طرز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ صنعت کار جمشید جی ٹاٹا نے تاج محل ہوٹل اسی طرز میں تعمیر کروایا۔ مزید برآں یہ عمارت ہندوستانی مہم جوئی کی علامت تھی اور یہ عمارت انگریزوں کے ذریعہ پرورش یافتہ مختص نسلی تعصب پر مبنی کلبوں اور ہوٹلوں کے لیے ایک چیلنج بھی بن گئی۔

شکل 12.29
میونسپل کارپوریشن بلڈنگ، بمبئی۔ 1888 میں ایف. ڈبلیو. اسٹیون کے ذریعہ ڈیزائن کردہ
گوتھک اور مشرقی ڈیزائن کے امتزاج کا مشاہدہ کیجیے۔

ممبئی کے زیادہ تر ''ہندوستانی'' علاقوں میں عمارتی تعمیر اور سجاوٹ میں روایتی طرز کا غلبہ تھا۔ شہر میں جگہ کی کمیابی اور بھیڑ ایک یگانہ قسم کی عمارتوں کی تعمیر کا سبب بنی جس کو ''چال'' (Chawl) کہا گیا۔ یہ کئی منزلہ عمارتیں ایک کمرے والے مکان، درمیان میں کھلے صحن کے چاروں طرف طویل کھلی راہ داری کے ساتھ تعمیر کی جاتی تھیں۔ اس طرح کی عمارتوں میں بہت سارے خاندان رہتے تھے۔ مشترکہ جگہ میں شراکت داری ان میں محلہ کی شناخت اور اتحاد یکجہتی کی نشو ونما میں معاون ثابت ہوئی۔

5. عمارتیں اور طرز تعمیر ہمیں کیا بتاتے ہیں؟
(WHAT BUILDINGSAND ARCHIECTURAL STYLES TELL US?)

فن تعمیر اس زمانے میں رائج جمالیاتی تصورات اور ان کے اندر تنوع کی ترجمانی کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، عمارتیں ان کے تعمیر کرنے والے کسی بصارت کا بھی اظہار کرتی ہیں۔ حکمراں عمارتوں کے ذریعہ اپنی طاقت واقتدار کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک خاص عہد کے فن تعمیر کو دیکھ کر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت طاقت واقتدار کو کس طرح خیال کیا جاتا تھا اور عمارتیں نیز ان سے منسوب اینٹوں اور پتھروں، ستونوں اور محرابوں، آسمان چھوتے گنبدوں یا محرابی چھتوں کے ذریعہ کس طرح اس کا اظہار کیا گیا۔

شکل 12.30
بمبئی کی ایک چال

فن تعمیر سے صرف رائج طریقہ کار کی ہی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ وہ طریقہ کار کو قالب عطا کرتی ہیں، طرز کو مقبول بناتی ہیں اور ثقافت کا خاکہ بھی متعین کرتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ بہت سے ہندوستانیوں نے فن تعمیر کی بابت یوروپی طرز کو جدیدیت اور تہذیب کی علامت مانتے ہوئے اس طرز کو اپنانا شروع کر دیا لیکن تمام ہندوستانی اس طرح نہیں سوچتے تھے، بہت سے ہندوستانیوں نے یوروپی تصورات کو خارج کر دیا اور دیسی طرز کو قائم رکھنے کی کوشش کی، دیگر لوگوں نے مغرب سے درآمد یقینی عناصر کو قبول کر لیا جس کو وہ جدید کے طور پر دیکھتے تھے اور ان کو مقامی روایات سے اخذ شدہ عناصر کے ساتھ باہم ملا دیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر سے ہم دیکھتے ہیں کہ جو طریقہ کار نوآبادیاتی تصورات سے مختلف تھے ان کے علاقائی اور قومی طریقہ کار کے مطابق توضیح کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح ثقافتی آویزش کے وسیع طریق عمل کے ذریعہ طرز بدلتی اور ارتقا پذیر ہوتی گئی۔ تاہم فن تعمیر کو دیکھتے ہوئے تنوع کی شکلوں کو بھی سمجھ سکتے ہیں جن میں شاہی اور قومی نیز قومی اور علاقائی / مقامی کے درمیان ثقافتی آویزش اور سیاسی ٹکراؤ ظاہر ہو کر اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔

بحث کیجیے

ایک تاریخی عمارت کا انتخاب کیجیے جو آپ کو پسند ہو۔ اس کے فن تعمیر کی خصوصیات کی فہرست بنائیے اور اس کے طرز تعمیر کے متعلق دریافت کیجیے اور اس کے لیے وہ خاص طرز کیوں مستعار لی معلوم کیجیے۔

ٹائم لائن

1500-1700	ہندوستان میں یوروپی تجارتی کمپنیاں اپنی بنیادیں قائم کرنے لگیں: 1510 میں پرتگالیوں نے پنجی میں 1605 میں ڈچوں نے مسولی پٹنم میں، انگریزوں نے 1639 میں مدراس میں، 1661 میں بمبئی میں اور 1690 میں کلکتہ میں، 1673 میں فرانسیسیوں نے پانڈیچری میں
1757	پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی فیصلہ کن فتح: انگریز بنگال کے حکمراں بن گئے
1773	ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ کلکتہ میں سپریم کورٹ کا قیام
1803	کلکتہ شہر کی اصلاح پر لارڈ ویلزلی کے تحریر کردہ انتظامی حکم (Minute)
1818	دکن پر انگریزوں کا قبضہ: بمبئی کا اس نئے صوبہ کی راجدھانی بننا
1853	بمبئی سے تھانے تک ریلوے کا آغاز
1857	بمبئی میں پہلی سوت کاتنے (spinning) اور کپڑا بننے (weaving) کی مل کا قیام
1857	بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں یونیورسٹیوں کا قیام
1870	میونسپلٹی میں انتخاب شدہ نمائندوں کی شروعات
1881	مدراس بندرگاہ (Harbour) کی تکمیل
1896	بمبئی کے واٹسنز ہوٹل میں پہلی فلم کی نمائش
1896	بڑے شہروں میں پلیگ پھیلنے کی شروعات
1911	کلکتہ سے راجدھانی کا دہلی منتقل ہونا

100 سے 150 لفظوں میں جواب دیجیے۔

1۔ نوآبادیاتی تناظر میں شہرکاری کے نمونوں کی ازسرنو تعمیر میں مردم شماری کے اعداد و شمار کس حد تک فائدہ مند ہیں؟

2۔ ''وہائٹ'' اور ''بلیک'' ٹاؤن اصطلاحات کی کیا اہمیت تھی؟

3۔ ذی قدر ہندوستانی تاجروں نے خود کو نوآبادیاتی شہروں میں کس طرح قائم کیا؟

4۔ مدافعت اور صحت کے تعلق سے کلکتہ کو کس طرح کی شکل دی گئی؟ تجزیہ کیجیے۔

5۔ وہ مختلف نوآبادیاتی فن تعمیر کے طرز کیا ہیں جن کو بمبئی شہر میں دیکھ سکتے ہیں؟

مندرجہ ذیل پر ایک مختصر مضمون (250 سے 300 الفاظ پر مشتمل) لکھیے۔

6۔ اٹھارھویں صدی کے دوران شہری مراکز کی تغیر کلی کس طرح ہوئی؟

7۔ عوامی مقامات کی نئی اقسام کون سی تھیں جو نوآبادیاتی شہروں میں ظہور پذیر ہوئیں؟ وہ کون سے امور انجام دیتے تھے؟

8۔ انیسویں صدی میں شہری منصوبہ بندی کو متاثر کرنے والے اندیشے کون سے تھے؟

9۔ نئے شہروں میں سماجی رشتوں کی کس حد تک تغیر کلی ہوئی؟

نقشہ کا کام

10۔ ہندوستان کے نقشے پر اہم ندیوں اور پہاڑی سلسلوں کے محل وقوع کو نشان زد کیجیے۔ بشمول بمبئی، کلکتہ اور مدراس، اس باب میں مذکور 10 شہروں کو نشان زد کیجیے اور ان میں سے کسی دو شہروں (ایک نوآبادیاتی اور ایک قبل نوآبادیاتی شہر) کے متعلق مختصر نوٹ تیار کیجیے کہ انیسویں صدی میں ان کی اہمیت کیوں تبدیل ہوگئی۔

پروجیکٹ (کوئی ایک)

11۔ آپ نے بڑے نوآبادیاتی شہروں کے متعلق پڑھا ہے۔ کسی ایک چھوٹے شہر کا انتخاب کیجیے جو طویل تاریخ رکھتا ہے۔ یہ ایک مندر شہر، بازار شہر، انتظامی مرکز، ایک زیادتی مرکز یا ان کا ایک آمیزہ ہوسکتا ہے۔ دریافت کیجیے کہ یہ شہر کس طرح قائم ہوا، کب یہ ترقی پذیر ہوا اور جدید عہد کے دوران اس کی تاریخ کس طرح تبدیل ہوئی۔

12۔ اپنے شہر یا گاؤں میں پانچ قسم کی عمارتوں کا انتخاب کیجیے۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق دریافت کیجیے کہ یہ کب تعمیر ہوئیں، کس طرح ان کو منصوبہ بند کیا گیا، ان کی تعمیر کے لیے وسائل کس طرح حاصل کیے گئے اور ان کی تعمیر میں کتنا عرصہ لگا۔ عمارتوں کی تعمیری خصوصیات کیا بیان کرتی ہیں؟

مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

سبیا ساچی بھٹا چاریہ، 1990
آدھونک بھارت کاآرتھک اِتیھاس،
راج کمل پرکاشن، دہلی

نارما ایونسن، 1989
دی انڈین میٹروپولیس: اے ویو ٹوورڈ دی ویسٹ
آکسفورڈ یونیورسٹی، پریس، دہلی

نارائنی گپتا، 1981
دھلی بیٹوین ٹو امپائرز 1931–1803
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی

گیون ہیم بلی اور برٹن اسٹین
ٹائونس اینڈ سٹیز' پتن رائے چودھری اور عرفان حبیب کی مرتب کردہ۔ دی کیمبرج اکنامک ہسٹری آف انڈیا جلد اول، 1984 اور ینگل لاگ مین اور کیمبرج یونیورسٹی پریس، دہلی

اینتھونی کنگ، 1976
کولونیل اربن ڈیولپمنٹ: کلچر، سوشل پاور اینڈ انوائرمنٹ
روٹلیج اینڈ کیگن پول، لندن

تھامس آرمیٹ کاف، 1989
این امپریل ویژن: انڈیان آرکیٹیکچر اینڈ بریٹینز راج
فیبر اینڈ فیبر، لندن

لیوس ممفورڈ، 1961
دی سٹی اِن ہسٹری: اٹز اوریجینز،
اٹز ٹرانسفارمیشن اینڈ اٹز پروس پیکٹس۔
سیکر اینڈ وار برگ، لندن

5282CH13

مہاتما گاندھی اور قومی تحریک

سول نافرمانی اور اس سے آگے

قوم پرستی کی تاریخ میں اکثر فرد واحد کو قوم کی تعمیر کے ساتھ شناخت کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم گیری بالڈی کو اٹلی کی تعمیر کے ساتھ، جارج واشنگٹن کو امریکہ کی جنگ آزادی کے ساتھ اور ہو چی من کو نوآبادیاتی حکومت سے ویتنام کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں، چنانچہ گاندھی جی کو ہندوستانی قوم کا 'بابا' (باپو) مانا گیا ہے۔

گاندھی جی جس حد تک جدجہد آزادی میں حصہ لینے والے تمام لیڈروں میں سب سے زیادہ مؤثر اور قابل تعظیم ہیں اس طرح یہ امتیاز بے محل نہیں ہے۔ تاہم واشنگٹن یا ہو چی من کی طرح مہاتما گاندھی کا سیاسی سفر اسی سماج نے تشکیل دیا جس میں وہ رہتے تھے۔ فرد واحد کے بجائے عظیم لوگ نہ صرف تاریخ بناتے ہیں بلکہ خود بھی تاریخ کے ذریعہ بنائے جاتے ہیں۔

اس باب میں 1948-1915 کے دوران ہندوستان میں گاندھی جی کی سرگرمیوں کا تجزیہ کیا جائے گا۔ یہ باب ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات کے ساتھ ان کے جوابی عمل اور عوامی جدوجہد (جو ان سے محرک تھی اور جس کی انھوں نے قیادت کی تھی) کی تحقیق کرتا ہے۔ یہ باب طلبہ کے سامنے مختلف قسم کے ماخذ جس کو مؤرخین ایک لیڈر کے سیاسی سفر اور سماجی تحریکوں (جس سے وہ وابستہ تھے) کی تعمیر نو کے لیے استعمال کرتے ہیں پیش کرتا ہے۔

شکل 13.1
مارچ 1930 میں نمک کے لیے سفر شروع کرنے سے پہلے سابرمتی ندی کے کنارے عوام گاندھی جی کی تقریر سنتے ہوئے

1. خود کو اعلان کرتا ایک لیڈر
(A LEADER ANNOUNCES HIMSELF)

موہن داس کرم چند گاندھی دو دہائی تک دیارِ غیر میں رہنے کے بعد جنوری 1915 میں اپنے مادرِ وطن واپس ہوئے۔ ان سالوں کا زائد حصہ انھوں نے جنوبی افریقہ میں گزارا جہاں وہ ایک وکیل کی حیثیت سے گئے تھے اور آگے چل کر وہ اس ریاست کی ہندوستانی جماعت کے لیڈر بن گئے۔ جیسا کہ مورخ چندرن دیونیسن نے تبصرہ کیا ہے کہ جنوبی افریقہ نے ہی گاندھی جی کو ''مہاتما'' بنایا۔ مہاتما گاندھی نے پہلی بار جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کے طور پر معروف احتجاج ''عدم تشدد'' کی ممتاز تکنیک کو بتدریج آگے بڑھایا۔ پہلی بار مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کو فروغ دیا اور اعلیٰ ذات کے ہندوستانیوں کو نیچی ذات کے لوگوں اور عورتوں کے لیے ان کے امتیازی سلوک یعنی امتیاز پر مبنی سلوک کے لیے خبردار کیا۔

1915 میں جب مہاتما گاندھی ہندوستان واپس آئے تو اس وقت کا ہندستان 1893 میں ان کی روانگی کے مقابلے میں خاصا مختلف تھا اگرچہ ابھی تک یہ انگریزوں کی نوآبادیات تھا مگر سیاسی شعور و ادراک کے معاملے میں کافی سرگرم تھا۔ زیادہ تر بڑے شہروں اور قصبوں میں انڈین نیشنل کانگریس کی شاخیں موجود تھیں۔ 07-1905 کی سودیشی تحریک کے ذریعہ اس نے بڑے پیمانے پر متوسط طبقے کے درمیان اپنی اپیل کو وسعت دی۔ اس تحریک نے اعلیٰ قسم کے لیڈروں کو تیار کیا۔ ان میں مہاراشٹرا کے بال گنگادھر تلک، بنگال کے بپن چندر پال اور پنجاب کے لالہ لاجپت رائے خاص تھے۔ یہ تینوں لال، بال، پال کے نام سے معروف تھے۔ ان تینوں کی یہ قربت ان کی جدوجہد کے کل ہند کردار کی ترسیل تھی۔ چونکہ ان کے سکونت پذیر صوبے ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع تھے اس لیے ان لیڈروں نے جہاں نوآبادیاتی حکمرانی کی جنگجویانہ (تشدد پسندانہ) مخالفت کی وکالت کی وہیں ''اعتدال پسندوں'' کا ایک گروہ تھا جو زیادہ مؤثر اور بتدریج کوشش کے طریقہ کار کو ترجیح دیتا تھا۔ ان اعتدال پسندوں میں گاندھی جی کے معتبر سیاسی صلاح کار گوپال کرشن گوکھلے کے ساتھ محمد علی جناح بھی تھے جو گاندھی جی کی طرح گجرات نژاد کے لندن میں ایک تربیت یافتہ وکیل تھے۔

شکل 13.2
مہاتما گاندھی جوہانسبرگ جنوبی افریقہ میں، فروری 1908

گوکھلے کے مشورہ پر گاندھی جی نے ایک سال برطانوی ہندوستان کا دورہ کرنے میں گزارا تاکہ وہ یہاں کی زمین اور لوگوں کے بارے میں جان سکیں۔ فروری 1916 میں بنارس ہندو یونیوسٹی کی افتتاحی تقریب میں عوام کے سامنے آئے۔ اس موقع پر مدعوافراد میں شہزادے اور انسان دوست جنھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے قیام میں عطیات کا تعاون دیا تھا موجود تھے۔ اس تقریب میں اینی بیسنٹ جیسے کانگریس کے اہم لیڈران بھی موجود تھے۔ ان اعلی مرتبہ لوگوں کے مقابلے میں گاندھی جی نسبتاً غیر معروف شخص تھے۔ انھیں یہاں ہندوستان کے اندر ان کے مرتبہ کی وجہ سے نہیں بلکہ جنوبی افریقہ میں ان کے کام کی بنیاد پر مدعو کیا گیا تھا۔

جب گاندھی جی کی تقریر کرنے کی باری آئی تو انھوں نے غریب مزدور طبقے کی طرف دلچسپی کے فقدان کے لیے ہندوستانی ممتاز طبقہ کو موردالزام ٹھہرایا۔ انھوں نے کہا کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کا افتتاح (قیام) یقیناً بہت شاندار مظاہرہ ہے لیکن ''سجے سنورے اشرافیہ طبقہ'' کی موجودگی اور لاکھوں غریب ہندوستانیوں کی جو یہاں موجود نہیں ہیں کے درمیان فرق فکرمندی کا باعث ہے۔ انھوں نے مراعات یافتہ مدعولوگوں سے کہا کہ ہندوستان کے لیے نجات اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ آپ خود کو ان زیورات وجواہرات سے آزادانہ کرلیں اور ان کو ہندوستان میں اپنے ہم وطنوں کی فلاح کے لیے خیال کریں۔ وہ کہتے گئے کہ ہمارے لیے اپنی حکومت کے ذی شعور وجود کے تب تک کوئی معنی نہیں ہو سکتے جب تک ہم کسانوں سے ان کی محنت کے تقریباً پورے حاصل کا خود یا دیگر لوگوں کو لے لینے کی اجازت دیتے رہیں گے۔ ہماری نجات صرف کسانوں کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے۔ نہ تو وکیل نہ ہی ڈاکٹر اور نہ ہی مالدار زمین دار اُسے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

شکل 13.3
گاندھی جی کراچی میں، مارچ 1916

بنارس ہندو یونیورسٹی کا افتتاح (قیام) ایک جشن کا موقع تھا کیونکہ ہندوستانی دولت اور ہندوستانیوں کی پیش قدمی کے ذریعہ تقویت پذیر ایک قوم پرست یونیورسٹی کا قیام ایک علامت تھا لیکن گاندھی جی نے خود کو مبارک باد دینے کی آواز (سر) کے بجائے لوگوں کو ان کسانوں اور مزدوروں کی یاددہانی کرائیں جو ہندوستانی آبادی کی اکثریت کو تشکیل دینے کے باوجود حاضرین میں سے نمائندگی نہ کر سکتے تھے۔

ایک سطح پر فروری 1916 میں گاندھی جی کی تقریر فقط حقیقت کا رسمی اظہار تھا۔ بالفاظ دیگر ہندوستانی قوم پرستی ایک ممتاز طبقہ کا مظہر تھی جو وکیلوں ،ڈاکٹروں اور زمین داروں کے ذہن کی اختراع تھا لیکن ایک دوسری سطح پر یہ عزم کا رسمی اظہار بھی تھا۔ گاندھی جی کا یہ پہلا عوامی اعلان ہندوستان قوم پرستی کو سارے ہندوستانی عوام کی زیادہ مناسب طور سے نمائندگی تخلیق کرنے کی خواہش کا اظہار بھی تھا۔ اسی سال کے آخری مہینے میں گاندھی جی کو ضابطوں کو عملی شکل میں پیش کرنے کا موقع ملا۔ دسمبر 1916 میں لکھنو میں منعقد سالانہ کانگریس میں چمپارن بہار سے آنے والے ایک کسان نے انھیں نیل کے انگریز کاشت کاروں کے ذریعہ کسانوں کے ساتھ کیے جانے والے ظالمانہ برتاؤ کے متعلق بتایا۔

بحث کیجیے ......

1915 سے قبل ہندوستان میں قومی تحریک کے متعلق مزید تحقیق کیجیے اور دیکھیے کہ کیا مہاتما گاندھی کا تبصرہ انصاف پر مبنی ہے۔

2. عدم تعاون کی تحریک کا فائدہ اور نقصان

(The Making and Unmaking of Non-cooperation)

1917 میں گاندھی جی کا زیادہ تر وقت چمپارن میں قبضہ املاک کی شرائط سے کسانوں کے تحفظ کے ساتھ اپنی پسند کی فصلوں کی کاشت کاری کی آزادی حاصل کرنے کی کوششوں میں گزرا۔ آئندہ سال 1918 میں گاندھی جی اپنی آبائی ریاست گجرات میں دو مہموں میں شریک رہے۔ پہلی انھوں نے احمد آباد میں مزدوروں کے ایک جھگڑے میں دخل اندازی کی اور کپڑے کی ملوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کے لیے بہتر کام کے حالات کا جائزہ لیا اس کے بعد انھوں نے کھیڑا میں کسانوں کی فصل خراب ہونے پر ریاست سے کسانوں کے ٹیکس کو معاف کرنے کی درخواست کی۔

چمپارن، احمد آباد اور کھیڑا میں کی گئی پیش قدمیوں سے گاندھی جی ایک ایسے قوم پرست کی حیثیت سے ابھرے جن میں غریب لوگوں کے لیے گہری ہمدردی تھی۔ یہ تمام مقامی جدو جہد تھی جس کے بعد 1919 میں نوآبادیاتی حکمرانوں نے گاندھی جی کے سامنے میں ایک ایسا قضیہ ڈال دیا جس کے ذریعہ وہ اچھی خاصی تحریک تشکیل دے سکتے تھے۔ 18-1914 کی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے پریس پر احتساب (سنسر شپ) کا آغاز کر دیا اور بغیر کسی عدالتی کاروائی کے حراست میں رکھنے کی اجازت دے دی۔ سر سڈنی رولٹ کی قیادت میں بنی کمیٹی کی سفارش پر ان اقدامات کو جاری رکھا گیا۔ اس کے جواب میں گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک گیر مہم چلانے کے لیے کہا۔ شمالی اور مغربی ہند کے قصبوں میں چاروں طرف ''بند'' کی آواز کے جواب میں دکانوں اور اسکولوں کے بند ہونے سے زندگی ٹھہر سی گئی۔ پنجاب میں خاص طور پر شدید احتجاج

ہوئے جہاں کے بہت سے افراد نے انگریزوں کی طرف سے جنگ میں خدمات انجام دی تھیں اور اپنی خدمات کے عوض وہ انعام کی امید کر رہے تھے۔ اس کے بجائے انھیں رولٹ ایکٹ دیا گیا۔ گاندھی جی کو اس وقت حراست میں لے لیا گیا جب وہ پنجاب جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ اہم مقامی کانگریسیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ صوبہ کی حالت بتدریج کشیدہ ہوتی گئی اور اپریل 1919 میں امرتسر میں حالات ساز ہو گئے جب انگریز بریگیڈیر نے ایک قوم پرست جلسے پر فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جلیاں والا باغ قتل عام کے نام سے معروف اس حادثہ میں چار سو بھی زیادہ افراد مارے گئے۔

یہ رولٹ ستیہ گرہ ہی تھا جس نے گاندھی جی کو حقیقت میں ایک قومی لیڈر بنایا۔ اس کامیابی سے حوصلہ پا کر گاندھی جی نے انگریز حکومت کے خلاف ''عدم تعاون'' کی مہم کے لیے ان سے مطالبہ کیا۔ جو ہندوستانی نوآبادیت کو ختم کرنے کے خواہشمند تھے ان سے کہا گیا کہ وہ اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں میں نہ جائیں اور ٹیکس بھی ادا نہ کریں۔ مختصراً انھوں نے سبھی سے انگریز حکومت کے ساتھ تمام طرح کی وابستگی سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہونے کے لیے عمل پیرا ہونے کے لیے کہا اور یہ بھی بات زور دے کر کہی کہ اگر عدم تعاون پر مؤثر ڈھنگ سے عمل درآمد ہوا تو ہندوستان ایک سال کے اندر سوراج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اپنی جدوجہد کو مزید وسعت دیتے ہوئے انھوں نے خلافت تحریک کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ حال ہی میں ترکی حکمراں کمال اتاترک کی کے ذریعہ ختم کی گئی یہ خلافت اتحاد اسلامی کا مظہر تھی جس کو یہ تحریک بحال کرانا چاہتی تھی۔

خلافت تحریک کیا تھی؟
(What was the Khilafat Movement?)

خلافت تحریک (1920-1919) محمد علی اور شوکت علی کی قیادت میں چلائی گئی ہندوستانی مسلمانوں کی ایک تحریک تھی جس کے مندرجہ ذیل مطالبے تھے۔ سابقہ عثمانی سلطنت کے مسلم مقامات مقدسہ پر ترکی سلطان یا خلیفہ کا کنٹرول بنا رہنا چاہیے۔ جزیرۃ العرب (عربیہ، سیریا، عراق، فلسطین) مسلم خودمختاری کے تحت حسب سابق رہیں اور خلیفہ کے پاس حسب ضرورت علاقے چھوڑے جائیں تاکہ وہ مذہب اسلام کا دفاع کرنے کے قابل ہو۔ کانگریس نے اس تحریک کی حمایت کی اور مہاتما گاندھی نے اس کو عدم تعاون تحریک کے ساتھ باہم جوڑنے کی کوشش کی۔

2.1 ایک عوامی تحریک کی تیاری
(Knitting a popular movement)

گاندھی جی کو امید تھی کہ عدم تعاون تحریک کو خلافت تحریک کے ساتھ ملانے سے ہندوستان کی دو بڑی مذہبی قومیں ہندو اور مسلمان مل کر نوآبادیاتی حکومت کو ختم کر سکتے ہیں۔ ان تحریکوں نے یقیناً ایک عوامی کارروائی کے جذبہ کو بندھن سے آزاد کر دیا جو نوآبادیاتی ہندوستان میں قطعی طور پر انوکھی بات تھی۔

طلبہ نے حکومت کے ذریعہ چلائے جانے والے اسکول اور کالجوں میں جانا موقوف کر دیا۔ وکیلوں نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ بہت سے شہروں اور قصبوں میں مزدور طبقہ ہڑتال پر چلا گیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1921 میں 396 ہڑتالیں ہوئیں جن میں 6,00,000 مزدور شامل ہوئے تھے اور 70 لاکھ کام کے دنوں کا نقصان ہوا۔ دیہی علاقوں میں بھی غیظ و غضب کے ساتھ بے اطمینانی موجود تھی۔ شمالی آندھر پردیش اکے پہاڑی قبائل نے جنگل قوانین

شکل 13.4
عدم تعاون تحریک جولائی 1922
غیر ملکی کپڑوں کو جمع کیا جارہا ہے تاکہ ان کو آگ میں جلایا جاسکے۔

کی خلاف ورزی کی۔اودھ میں کسانوں نے محصول ادا نہیں کیے۔کمایوں کے کسانوں نے نوآبادیاتی افسران کا سامان ڈھونے سے انکار کر دیا۔یہ احتجاجی تحریکیں بسا اوقات مقامی قوم پرست قیادت کی سرتابی کرتے ہوئے عمل میں آئیں۔کسانوں،مزدوروں اور دیگر نے اس کی اپنے طور پر ترجمانی کی اور نوآبادیاتی حکومت کے ساتھ عدم تعاون اور تحکمانہ ہدایت کی پیروی کے بجائے اپنے مفاد کے طریقوں پر عمل کیا۔

گاندھی جی کے امریکی سوانح نگار لوئس فشر کے مطابق عدم تعاون، ہندوستان اور گاندھی جی کی زندگی میں ایک عہد ساز نام بن گیا۔یہ امن کے نقطہ نظر سے منفی لیکن ذی اثر اعتبار سے مثبت تھا۔اس کے لیے انحراف، نفس کشی اور ضبط نفس لازمی تھا۔یہ اپنی حکومت کے لیے ایک تربیت تھی۔1857 کی بغاوت کے بعد پہلی مرتبہ عدم تعاون تحریک کے نتیجے میں انگریزی حکومت کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔اس کے بعد فروری 1922 میں کسانوں کے ایک گروہ نے متحدہ صوبہ جات (موجودہ اترپردیش اور اترانچل) میں چوری چورا جیسے چھوٹے گاؤں میں ایک پولس اسٹیشن پر حملہ کرکے آگ لگا دی۔ بہت سے کانسٹیبل اس آتشزدگی میں ہلاک ہوگئے۔تشدد کی اس کارروائی کی وجہ سے گاندھی جی کو فوراً یہ تحریک منسوخ کرنی پڑی۔انھوں نے زور دے کر کہا کہ ”کسی بھی طرح کی اشتعال انگیزی کو انسانوں کے ظالمانہ قتل کے لیے جو لاچار حالت میں پہنچے ہوئے ہوں اور جو تقریباً خود بھیڑ کے رحم وکرم پر ہوں امکانی طور پر جائز نہیں کہا جاسکتا ہے۔

عدم تعاون تحریک کے دوران ہزاروں ہندوستانیوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔خود گاندھی جی کو حکومت کے خلاف اشتعال انگیزی کے الزام میں مارچ 1922 میں گرفتار کرلیا گیا۔اس عدالتی کارروائی کی صدارت کرنے والے جج جسٹس سی۔این بروم فیلڈ نے انھیں سزا سناتے ہوئے ایک غیر معمولی تقریر کی۔جج نے تبصرہ کیا کہ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا کہ میں نے اب تک جن کی تفتیش کی ہے یا تفتیش کروں گا۔آپ کسی بھی شخص سے مختلف زمرے کے ہیں۔اس حقیقت کو نظر انداز کرنا ناممکن ہوگا کہ آپ اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی نظر میں ایک عظیم محبّ وطن اور لیڈر

ہیں۔حتیٰ کہ سیاست میں جولوگ آپ سے مختلف ہیں وہ بھی آپ کو اعلیٰ نصب العین یہاں تک کہ آپ کو پاک ومقدس زندگی والے فرد کے طور پر دیکھتے ہیں۔ چونکہ گاندھی جی نے قانون کی خلاف ورزی کی تھی اس لیے عدالت کے لیے ان کو چھ سال کے لیے جیل کی سزا سنائی جانی ناگزیر تھی، لیکن جج بروم فیلڈ نے کہا ''اگر ہندوستان میں واقع ہونے والے واقعات کے سبب حکومت کے لیے آپ کی سزا کے ان سالوں میں کمی کرنا اور رہا کرنا ممکن ہوا تو اس بات سے مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص خوش نہ ہوگا۔

2.2 عوام کے لیڈر (A people's leader)

1922 تک گاندھی جی نے ہندوستانی قوم پرستی کی کایا پلٹ کر دی تھی۔ اس لحاظ سے فروری 1916 میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں اپنی تقریر میں کیے گئے وعدہ کو پورا کیا۔ اب یہ تحریک دانشوروں اور پیشہ وروں کی تحریک نہیں تھی کیونکہ لاکھوں کی تعداد میں کسانوں، مزدوروں اور دست کاروں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے گاندھی جی کو نہایت تعظیم وتکریم کی نظر سے دیکھتے ہوئے انھیں اپنا ''مہاتما'' قرار دیا۔ انھوں نے اس حقیقت کی قدر کی کہ وہ ان کی طرح ہی کپڑے پہنتے تھے، ان کی طرح رہتے تھے اور ان کی زبان بولتے تھے۔ دوسرے لیڈروں کی طرح وہ عام خلقت سے فاصلے پر کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ ان سے ہمدردی رکھتے تھے حتیٰ کہ ان کے ساتھ اپنی شناخت قائم کرتے تھے۔

یہ شناخت ان کے کپڑوں میں نمایاں طور پر منعکس ہوتی تھی۔ حالانکہ دیگر قوم پرست لیڈران رسمی طور پر مغربی طرز کے سوٹ یا ہندوستانی بند گلے کے کپڑے پہنتے تھے۔ گاندھی جی لوگوں کے درمیان ایک عام دھوتی میں جاتے تھے۔ اس دوران گاندھی جی ہر دن کا کچھ حصہ چرخہ چلا کر گزارتے تھے اور دیگر قوم پرستوں کو بھی ایسا کرنے کے لیے انھوں نے حوصلہ افزائی کی۔ سوٹ کاتنے کے عمل نے گاندھی جی کو روایتی ذات پات کے نظام کے اندر رائج ذہنی محنت مشقت اور جسمانی محنت کی دیوار کو توڑنے کی اجازت دی۔

مؤرخ شاہد ہیں کہ پرکشش مطالعہ میں مقامی پریس میں پہنچائی گئی رپورٹوں اور افواہوں کے ذریعہ مشرقی اتر پردیش کے کسانوں کے درمیان مہاتما گاندھی کی شبیہہ کو تلاش کیا گیا ہے۔ فروری 1921 میں اس علاقے کی سیاحت کے دوران ہر جگہ مجمع نے عزت کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔

ماخذ 1

چرخہ

مہاتما گاندھی جدید عہد کے شدید نقاد تھے جس میں مشینوں نے انسانوں کو غلام بنا کر محنت کو بے دخل کر دیا تھا۔ وہ چرخہ کو انسانی سماج کے ایک ایسے مظہر کے طور پر دیکھتے تھے جس میں مشینوں اور ٹیکنالوجی کی ستائش نہیں کی جائے گی۔ مزید برآں چرخہ غریب لوگوں کو اضافی آمدنی فراہم کر سکتا تھا اور انھیں خود کفیل بنا سکتا تھا۔

میرا احتجاج مشینوں کے لیے خبط سے ہے۔ یہ خبط ان مشینوں کے لیے ہے جنھیں محنت بچانے والی مشین کہا جاتا ہے۔ لوگ اس وقت تک محنت بچاتے رہیں گے جب تک ہزاروں افراد بغیر کام کے اور بھوک سے مرنے کے لیے کھلی سڑک پر نہ پھینک دیے جائیں۔ میں بنی نوع انسانی کے کسی ایک حصہ کے لیے نہیں بلکہ سبھی کے لیے وقت اور محنت بچانا چاہتا ہوں میں دولت کی یکجا فراہمی، کچھ ہی لوگوں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ سبھی کے ہاتھوں میں کرنا چاہتا ہوں۔

ینگ انڈیا، 13 نومبر 1924

کھدر تمام مشینوں کو تباہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ یہ اس کے استعمال کو منضبط کرتی ہے اور اس کی کمزور ترقی پر نظر رکھتی ہے۔ یہ مشینوں کا استعمال انتہائی غریب لوگوں کے لیے ان کی اپنی جھونپڑی میں کرتی ہے۔ پہیہ اپنے آپ میں ہی مشین کا ایک نفیس حصہ ہے۔

ینگ انڈیا 17 مارچ 1927

شکل 13.5

شکل 13.5

مہاتما گاندھی چرخہ کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کی دائمی مثال بن گئے۔

1921 میں جنوبی ہندوستان کے سفر کے دوران گاندھی جی نے اپنا سر منڈوا دیا اور غربا کے ساتھ اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے دھوتی زیب تن کر لی۔ ان کی یہ نئی صورت زہد اور ترک کا مظہر بھی بن گئی اور یہ خصوصیات ایسی تھیں جن کو گاندھی جی جدید دنیا کے صارفین کے حامی تمدن کی مخالفت کے لیے عزت دیتے تھے۔

گاندھی کی تقریروں کے دوران کیسا ماحول ہوتا تھا اس کے متعلق گورکھپور کے ایک ہندی اخبار نے یہ رپورٹ لکھی:

بھٹنی میں گاندھی جی نے مقامی لوگوں سے خطاب کیا اور اس کے بعد ٹرین گورکھپور کے لیے روانہ ہوئی۔ نون کھار، دیوریا، گوری بازار، چوری چورا اور کوسمہی اسٹیشنوں پر 15,000 سے 20,000 سے کم لوگ نہیں تھے......... مہاتما جی، کوسمہی کے منظر دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے اور اس حقیقت کے باوجود کہ یہ اسٹیشن جنگل کے وسط میں واقع تھا یہاں 10,000 سے کم لوگ نہ تھے کچھ لوگ ان کی محبت میں مغلوب روتے ہوئے دکھائی دیے۔ دیوریا پر لوگ گاندھی جی کو بھینٹ (عطیہ) دینا چاہتے تھے لیکن انھوں نے اسے ان سے گورکھپور میں دینے کے لیے کہا لیکن چوری چورا میں ایک مہذب مارواڑی انھیں کچھ پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ رک نہیں پایا۔ ایک چادر پھیلا دی گئی جس پر روپیوں اور سکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ یہ ایک منظر تھا........ گورکھپور اسٹیشن کے باہر گاندھی جی ایک اونچی گاڑی پر کھڑے ہو گئے اور لوگوں نے چند منٹوں کے لیے ان کا دیدار کر لیا۔

گاندھی جی جہاں کہیں گئے ان کی معجزاتی قوتوں کی افواہیں پھیل گئیں۔ بعض مقامات پر یہ کہا گیا کہ انھیں راجہ کے ذریعہ کسانوں کی شکایات کی تلافی کے لیے بھیجا گیا ہے اور وہ تمام مقامی افسران کے فیصلے رد کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ چند دیگر مقامات پر یہ دعوی کیا گیا کہ گاندھی جی کو قوت وطاقت انگریز بادشاہ سے برتر ہے اور ان کے آنے کے ساتھ نوآبادیاتی حکمراں ضلع سے بھاگ جائیں گے۔ گاندھی جی کی مخالفت کرنے والوں کے لیے خوفناک نتائج کی خبر دیتی ہوئی کہانیاں بھی گشت میں تھیں۔ اس طرح کی افواہیں پھیلی تھیں کہ گاندھی جی کی تنقید کرنے والے لوگوں کے گھر پُراسرار طور پر ٹوٹ کر گر گئے یا ان کی فصلیں خراب ہوگئیں۔

گاندھی بابا گاندھی مہاراج یا صرف مہاتما جیسے مختلف ناموں سے معروف گاندھی جی ہندوستانی کسانوں کے لیے ایک نجات دہندہ کے طور پر سامنے آئے جوان کو ٹیکس کی انتہا اور ظالم افسران سے آزاد کرانے والے نیز ان کی زندگی کا وقار اور شخصی آزادی بحال کرانے والے تھے۔ غریبوں اور کسانوں کے درمیان گاندھی جی کی اپیل کو ان کی درویشانہ طرز زندگی کے ذریعہ اور دھوتی نیز چرخہ جیسی علامات کے ذی فہم استعمال سے تقویت ملی۔ ذات کے اعتبار سے گاندھی ایک تاجر اور پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن ان کے سادہ طرز زندگی اور ہاتھوں سے کام کرنے کے تئیں ان کے پیار نے اس بات کی اجازت دی کہ وہ غریب مزدور طبقے کے ساتھ ہمدردی رکھیں اور بدلے میں وہ لوگ گاندھی جی سے ہمدردی رکھتے تھے۔ جہاں زیادہ تر سیاستداں ان سے کمتر سمجھ کر بات کرتے تھے وہیں گاندھی جی ان کو سمجھنے اور ان کی زندگی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے کے لیے سامنے آئے۔

بلاشبہ گاندھی جی کی عوام سے اپیل سچی تھی اور ہندوستانی سیاست کے تناظر میں کسی نظیر کے تاکیداً یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قوم پرستی کی اساس کو وسیع کرنے میں ان کی کامیابی کا راز احتیاط لہٰذا تنظیم کی بنیاد پر تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں کانگریس کی شاخیں قائم کی گئیں۔ شاہی ریاستوں (princely states) میں قوم پرستی کے عقائد کو فروغ دینے کی غرض سے ''پرجا منڈل'' کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا۔ گاندھی جی نے قوم پرستی کے پیغام کی ترسیل حکمرانوں کی زبان انگریزی کے بجائے مادری زبان میں کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ کانگریس کی صوبائی کمیٹیاں برطانوی ہندوستان کی مصنوعی سرحدوں کے مقابلے لسانی علاقوں پر مبنی تھیں۔ ان مختلف طریقوں سے قوم پرستی ملک کے بعید ترین کناروں تک پہنچ گئی اور وہ مختلف سماجی گروہ بھی اس میں شامل ہوگئے جو ماضی میں اس سے دور تھے۔

ماخذ 2

ماخذ 2 معجزاتی اور ناقابل یقین
(The miraculous and the unbelievable)

متحدہ صوبہ جات کے مقامی اخبارات نے اس زمانے میں پھیلی ہوئی بہت سی افواہوں کو درج کیا۔ یہ افواہیں ایسی تھیں کہ جس کسی نے بھی مہاتما گاندھی کی قوت کار کو جانچنا چاہا اسے تعجب ہوا:

1۔ بستی کے ایک گاؤں کے سکندر ساہو نے 15 فروری کو کہا کہ وہ مہاتما جی میں تب یقین کرے گا جب اس کے کارخانہ (جہاں گڑ پیدا کیا جاتا تھا) گنے کے رس سے بھری کڑاہی (ابلتی ہوئی) دو حصوں میں ٹوٹ جائے۔ فوراً ہی کڑاہی درمیان سے دو حصوں میں ٹوٹ گئی۔

2۔ اعظم گڑھ کے ایک کسان نے کہا کہ وہ گاندھی جی کی صداقت میں تب یقین کرے گا جب اس کے کھیت میں بوئے گئے گیہوں سے تلوں کی کونپلیں نکل آئیں۔ اگلے دن اس کھیت کا سارا گیہوں تل بن گیا۔

بعض ایسی افواہیں تھیں کہ جس نے گاندھی جی کی مخالفت کی وہ ہمیشہ کسی نہ کسی قدرتی آفات کا شکار ہوا۔

1۔ گورکھپور شہر سے ایک شریف آدمی نے چرخہ چلانے کی ضرورت پر سوال اٹھایا تو اس کے گھر میں آگ لگ گئی۔

2۔ اپریل 1921 میں چند لوگ اتر پردیش کے ایک گاؤں میں جوا کھیل رہے تھے۔ کسی شخص نے انھیں جوا کھیلنے سے منع کیا۔ اس گروپ میں سے ایک نے اس بات کو ماننے سے انکار کردیا اور گاندھی جی کو گالی دی۔ دوسرے دن اس کی بکری کو چار کتوں نے کاٹ لیا۔

3۔ گورکھپور کے ایک گاؤں کے کسانوں نے شراب پینا ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک شخص اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکا۔ جوں ہی وہ شراب کی دکان پر جانے کے لیے چلا ویسے ہی اس کے راستے میں اینٹ کے ٹکڑوں کی بارش شروع ہوگئی۔ جب اس نے گاندھی جی کا نام لینا شروع کیا یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

شاہد امین کی کتاب ''گاندھی ایز مہاتما'' سب لیٹرن اسٹڈیز III آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی

آپ نے باب 11 میں افواہوں کے متعلق پڑھا اور دیکھا کہ افواہوں کی گردش کا عمل ایک عہد کے عقائد کے ڈھانچے کے متعلق ہمیں کیا بتاتا ہے: یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان لوگوں کی ذہنیت کے متعلق جو ان افواہوں میں یقین کرتے ہیں اور اس صورت حال کے بارے میں جو ان عقائد کو ممکن بتاتی ہے۔ آپ کے خیال میں گاندھی جی کے متعلق ان افواہوں سے کیا ترجمانی ہوتی ہے؟

اب تک کانگریس کے مددگار چند خوشحال تاجر اور صنعت کار تھے۔ ہندوستانی مہم جو حضرات نے یہ جلد ہی تسلیم کر لیا کہ ان کے انگریز حریف جس خاص رعایت کے ذریعہ لطف اندوز ہو رہے ہیں وہ آزاد ہندستان میں ان کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ جی۔ ڈی۔ برلا جیسے حضرات نے قومی تحریک کی کھل کر حمایت کی جبکہ دیگر نے حکمت کے طور پر ایسا کیا۔ اس طرح گاندھی جی کے مداح غریب کسان اور مالدار صنعت کار دونوں تھے۔ گوکہ کسانوں کا گاندھی جی کے اتباع کے اسباب صنعت کاروں کے اسباب سے کسی قدر مختلف اور شاید ان کے برعکس بھی تھے۔

حالانکہ مہاتما گاندھی کا کردار حیات آفریں تھا لیکن ہم ''گاندھی وادی قوم پرستی'' کا ارتقا کہہ سکتے ہیں وہ کافی حد تک ان کے پیرو کاروں پر منحصر ہوتی تھی۔ 1917 اور 1922 کے درمیان ہندوستانیوں کے انتہائی باصلاحیت افراد کے گروہ نے خود کو گاندھی جی سے وابستہ کر لیا اس میں مہادیو ڈیسائی، ولبھ بھائی پٹیل، جے بی کرپلانی، سبھاش چندر بوس، ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہرو، سروجنی نائیڈو، گوند ولبھ پنت اور سی راج گوپالا چاریہ شامل تھے۔ گاندھی جی کے یہ قریبی ممتاز رفیق کار علاقوں سے آئے تھے اور یہ مختلف مذہبی روایات کے حامل بھی تھے۔ انھوں نے بے شمار ہندوستانیوں کو کانگریس میں شامل ہونے اور اس کے لیے کام کرنے کے لیے جوش پیدا کیا۔

فروری 1924 میں مہاتما گاندھی جیل سے رہا ہو گئے اور انھوں نے اپنی توجہ گھر میں بنے ہوئے کپڑے (کھادی) کو فروغ دینے اور چھوت چھات کو ختم کرنے کے قصد سے وقف کر دی۔ گاندھی جی جتنے بڑے سیاستداں تھے اتنے ہی بڑے سماجی مصلح بھی تھے۔ ان کا یقین تھا کہ آزادی کے قابل بننے کے لیے ہندوستانیوں کو بچپن کی شادی اور چھوت چھات جیسی سماجی برائیوں سے نجات حاصل کرنی ہوگی۔ ایک عقیدے کے ہندوستانیوں کو دوسرے عقیدے کے ہندوستانیوں کے لیے حقیقی برداشت و رواداری کو فروغ دینا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے ہندو مسلم ہم آہنگی پر زور دیا۔ اس عرصہ میں معاشی محاذ پر ہندوستانیوں کو خود کفیل بننا سیکھنا ہوگا۔ شاید اسی لیے انھوں نے غیر ملک سے درآمد کپڑے پہننے کے بجائے کھادی پہننے کی اہمیت پر زور دیا۔

بحث کیجیے

عدم تعاون کیا تھا؟ ان طریقوں کے تنوع کے متعلق معلوم کیجیے جن میں مختلف سماجی گروہوں نے تحریک میں حصہ لیا تھا۔

3. نمک ستیہ گرہ: ایک کیس اسٹڈی (The Salt Satyagraha: A Case Study)

عدم تعاون تحریک ختم ہونے کے کئی سالوں بعد تک مہاتما گاندھی نے خود کو سماجی اصلاح کے کاموں تک مرکوز رکھا۔ تاہم 1928 میں انھوں نے دوبارہ سیاست میں داخل ہونے کے بارے سوچنا

شروع کیا۔ اس سال سبھی سفید ممبران (انگریز) سائمن کمیشن کے خلاف کل ہند مہم چلائی جارہی تھی جو نوآبادیات کے حالات کی چھان بین کرنے کے لیے انگلینڈ سے بھیجے گئے تھے۔ گاندھی جی نے خود اس تحریک میں حصہ نہیں لیا پھر بھی انھوں نے اپنی دعائیں دی تھیں اور اسی سال باردولی میں ہونے والے کسان ستیہ گرہ کے ساتھ بھی انھوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

1929 میں دسمبر کے آخر میں کانگریس نے اپنا سالانہ اجلاس لاہور شہر میں منعقد کیا۔ یہ اجلاس دو باتوں کے لحاظ سے اہم تھا: جواہر لعل نہرو کا بحیثیت کانگریس صدر انتخاب جو نوجوان نسل کو قیادت کی چھڑی حوالے کرنے کی علامت تھا اور مکمل آزادی حاصل کرنے کے عہد کا اعلان، اب سیاست کی رفتار ایک بار پھر تیز ہوگئی۔ 26 جنوری 1930 کو مختلف مقامات پر قومی پرچم لہرانے کے ساتھ حب الوطنی کے نغمے گا کر اسے ''یوم آزادی'' کے طور پر منایا گیا۔ گاندھی جی نے خود اختصار کے ساتھ ہدایات دے کر بتایا کہ اس دن کو کیسے منایا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اچھا ہوگا کہ اگر یہ (آزادی کا) اعلان سبھی گاؤں، سبھی شہروں حتیٰ کہ...... یہ اچھا ہوگا کہ اگر تمام مقامات پر یکساں وقت پر تمام جلسے منعقد ہوں۔

گاندھی جی نے مشورہ دیا کہ نقارہ پیٹنے کے ذریعہ روایتی طریقے سے جلسے کے وقت کی اطلاع دی جائے۔ قومی پرچم لہرانے کے ساتھ جشن کا آغاز ہوگا۔ دن کا بقیہ حصہ کسی قدر تعمیری کاموں خواہ یہ سوت کی کتائی ہو یا اچھوتوں کی خدمت یا ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی تجدید حتیٰ کہ یہ سبھی کام ایک ساتھ انجام دیے جائیں جو ناممکن نہیں ہیں: اس میں حصہ لینے والے لوگ پرزور تائید کے ساتھ عہد لیں گے کہ'' دیگر لوگوں کی طرح ہندوستانیوں کو بھی آزادی اور اپنی شدید محنت کے نتیجہ سے لطف اندوز ہونے کا ناقابل منتقلی حق ہے اور یہ کہ اگر کوئی بھی حکومت لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھتی ہے اور ان کو زبردستی مطیع رکھتی ہے تو لوگوں کے پاس اسے بدلنے اور ختم کرنا کا ایک مزید حق بھی ہے۔

3.1 ڈانڈی (Dandi)

اس ''یوم آزادی'' کو منائے جانے کے فوراً بعد ہی مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ برطانوی ہندوستان بڑی حد تک نہایت ناپسندیدہ قوانین میں سے ایک جس نے نمک کی تیاری اور فروخت پر ریاست کو اجارہ داری دے دی تھی، کو توڑنے کے لیے ایک مارچ (احتجاجی جلوس) کی قیادت کریں گے۔ نمک کی اجارہ داری کے جس مسئلہ کا انتخاب کیا گیا تھا وہ گاندھی جی کی تدبیری دانائی کی ایک اہم مثال تھی۔ ہر ایک ہندوستانی گھرانے کے لیے نمک کا استعمال لازمی تھا، تاہم لوگوں

کو گھریلو استعمال کے لیے نمک بنانے سے بھی روکا گیا۔ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ اونچے داموں میں دکانوں سے نمک خریدیں۔ نمک پر ریاست کی اجارہ داری کافی غیر مقبول تھی۔ اس کو نشانہ بناتے ہوئے گاندھی جی انگریز حکومت کے خلاف وسیع بے اطمینانی کو منظم کرنے کے لیے پر امید تھے۔

شکل 13.6
ڈانڈی مارچ (احتجاجی جلوس) مارچ 1930

شکل 13.7
6 اپریل 1930 کو ڈانڈی مارچ کے اختتام پرستیہ گرہ کرنے والے ہی قدرتی نمک اٹھاتے ہوئے

جہاں زیادہ تر ہندوستانیوں کو گاندھی جی کے چیلنج کی اہمیت سمجھ میں آ گئی وہیں بادی النظر میں انگریز راج کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ گاندھی جی نے اپنے نمک مارچ کی پیشگی اطلاع وائسرائے لارڈ اِرون کو دے دی تھی لیکن اِرون ان کی اس کاروائی کی اہمیت کے مفہوم کو سمجھنے میں ناکام رہا۔ 12 مارچ 1930 کو گاندھی جی نے سابرمتی میں واقع اپنے آشرم سے سمندر کی طرف چلنا شروع کیا۔ تین ہفتے بعد وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ یہاں انھوں نے مٹھی بھر نمک بنا کر خود کو قانون کی نظر میں مجرم بنا دیا۔ اس عرصے میں ملک کے دیگر حصوں میں متوازی نمک مارچ منعقد کیے گئے۔

ماخذ 3

نمک ستیہ گرہ کیوں؟ (Why the Salt Satyagraha?)

نمک احتجاج کی علامت کیوں تھا؟ اس کے متعلق مہاتما گاندھی کیا لکھتے ہیں:

روزانہ حاصل ہونے والی اطلاعات کے مجموعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ستم ایجاد نمک ٹیکس کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ ٹیکس ادا کیے بغیر نمک، جو ٹیکس کبھی کبھی نمک کی اصل قیمت سے چودہ گنا زیادہ تک ہوتا ہے اس کے استعمال کو روکنے کے لیے حکومت اس نمک کو جس کو وہ منافع سے فروخت نہیں کر پائی ہے تباہ کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ حکومت ملک کی انتہائی اہم ضرورت پر ٹیکس لگاتی ہے۔ یہ عوام کو اس کے تیار کرنے سے روکتی ہے اور قدرت کے ذریعہ بغیر کسی کوشش کے تیار کیے گئے نمک کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس ستم ایجاد غاصب پالیسی کو کسی پائیدار صفت کے لیے مخصوص نہیں کیا جا سکتا ہے مختلف ذرائع سے میں ہندوستان کے سبھی حصوں میں اس قومی ملکیت کی غارت گری کی کہانیاں سن رہا ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ ٹنوں نمک کونکن کے ساحل پر تباہ کر دیا گیا۔ اس طرح کی کہانیاں ڈانڈی سے بھی آ رہی ہیں۔ جہاں کہیں بھی اس طرح کے علاقے کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کے ذریعہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے قدرتی نمک اٹھا لے جانے کا امکان ہے وہاں نمک افسران کے تقرر کا واحد مقصد نمک کو تباہ کرنے کو عمل میں لانا ہوتا ہے۔ اس طرح بیش قیمتی ملکیت کو قومی خرچ سے ہی تباہ کیا جاتا ہے اور لوگوں کے منہ سے نمک چھین لیا جاتا ہے۔

اس طرح نمک کی اجارہ داری ایک چوطرفہ طرز عمل ہے۔ یہ لوگوں کو بیش قیمتی سہل دیہی صنعت سے محروم کرتا ہے۔ قدرت کے ذریعہ بہتات میں پیدا ملکیت کی خواہ مخواہ کی غارت گری کا عمل ہے۔ نمک کی اس غارت گری کا بذات خود مطلب مزید قومی اخراجات ہے اور چوتھا اس بے وقوفی کا جزو لازم، بھوکے لوگوں سے 1,000 فی صد سے بھی زیادہ وصولیابی۔

عام لوگوں کی بے تعلقی کی وجہ سے ہی یہ ٹیکس برقرار رہا۔ عوام کافی حد تک خواب غفلت سے بیدار ہو چکے تھے، اس ٹیکس کو اب ختم کرنا ہوگا، کتنی جلدی یہ ختم ہوگا یہ لوگوں کی طاقت پر منحصر کرتا ہے۔

دی کلیکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی (سی ڈبلیو ایم جی) جلد 49

نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ کو کیوں تباہ کیا گیا، مہاتما گاندھی نمک ٹیکس کو دیگر ٹیکسوں کے مقابلے زیادہ ظالمانہ کیوں سمجھتے تھے؟

ماخذ 4

کل ہم نمک ٹیکس قانون توڑیں گے (Tomorrow we shall break the salt tax law)

5 اپریل 1930 کے دن مہاتما گاندھی نے ڈانڈی میں کہا تھا:

جب میں نے سابرمتی کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈانڈی کے سمندری ساحل کے چھوٹے سے گاؤں کے لیے چھوڑا تھا تو میرے ذہن میں یہ یقین نہیں تھا کہ ہم کو اس مقام تک پہنچنے دیا جائے گا۔ اس وقت جب میں سابرمتی میں تھا تب یہ افواہ تھی کہ مجھے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ حکومت شاید میرے ساتھیوں کو ڈانڈی تک آنے دے گی لیکن مجھے یقیناً نہیں آنے دے گی۔ اگر کوئی شخص میرے اوپر دانستہ ناقص عقیدہ کے الزام کا اظہار کرتا ہے تو میں اس الزام سے انکار نہیں کروں گا۔ میرے یہاں تک پہنچنے میں امن اور عدم تشدد کی طاقت کی معمولی تدبیر حق بجانب نہ ہوگی۔ اس طاقت کو آفاقی طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ کاش حکومت، اگر یہ چاہے تو وہ اس کام کی انجام دہی کے لیے خود کو مبارک باد دے سکتی ہے کیونکہ وہ ہم میں سے ہر ایک کو گرفتار کر سکتی تھی۔ جب حکومت یہ کہتی ہے کہ ان کے پاس امن کی اس فوج کو گرفتار کرنے کی ہمت نہیں تھی تو ہم اس بات کی تعریف کرتے ہیں۔ اس طرح کی فوج کو

گرفتار کرنے میں حکومت شرم محسوس کرتی ہے۔ جو شخص کوئی ایسا کام کرنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہے جس سے اس کا پڑوسی ناخوش ہو تو وہ شخص مہذب ہے۔ حکومت ہم لوگوں کو گرفتار نہ کرنے کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔ بالفرض اس نے یہ کام عالمی رائے کے خوف سے صرف بچنے کے لیے ہی کیا ہو۔
کل ہم نمک ٹیکس قانون توڑیں گے خواہ حکومت اس کو برداشت کرتی ہے یا نہیں۔ یہ سوال الگ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حکومت یہ برداشت نہ کرے لیکن اس جماعت کے لیے جو صبر واستقلال اور ضبط وتحمل کا اس نے مظاہرہ کیا ہے وہ اس کے لیے مبارک باد کی مستحق ہے.....
اگر مجھے گجرات مع باقی ملک کے سارے ممتاز لیڈروں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے تو کیا ہوگا، یہ تحریک اس یقین پر مبنی ہے کہ جب ایک ملک خواب غفلت سے بیدار ہوجاتا ہے اور آگے بڑھنے لگتا ہے تو اسے لیڈر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سی ڈبلیو ایم جی، جلد 49

گاندھی جی نوآبادیاتی حکومت کو کس طرح دیکھتے تھے یہ تقریر اس کے متعلق کیا بتاتی ہے؟

عدم تعاون تحریک جیسی سرکاری منظور شدہ قوم پرست مہم کے علاوہ بھی احتجاج کے لاتعداد دیگر دھارے تھے۔ ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کے وسیع حصوں میں کسانوں نے سخت ناپسندیدہ نوآبادیاتی جنگل قوانین کو توڑا جس کے سبب وہ خود اور ان کے مویشی ان جنگلوں میں نہیں جاسکتے تھے جن میں وہ ایک زمانے میں آزادانہ گھومتے تھے۔ بعض قصبوں میں فیکٹری مزدور ہڑتال پر چلے گئے، اس دوران وکیلوں نے بھی برطانوی عدالتوں کا بائیکاٹ کیا اور طلبہ نے حکومت کے ذریعہ چلائے جانے والے تعلیمی اداروں میں پڑھنے سے انکار کردیا۔ 1920-22 کی طرح ہی اس بار بھی گاندھی جی نے ہندوستانیوں کے تمام طبقات کو نوآبادیاتی حکومت کے سبب پیدا ہونے والی اپنی بے اطمینانی ظاہر کرنے کے لیے کہا جس کے جواب میں حکمرانوں نے اختلاف کرنے والوں کو نظر بند کردیا۔ نمک مارچ میں سرگرم تقریبا 60,000 ہندوستانیوں کو گرفتار کیا گیا۔ جن میں بے شک گاندھی جی بذات خود بھی شامل تھے۔

ساحل سمندر کی طرف گاندھی جی کے مارچ کی تکمیل کو ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے متعین پولس افسران کے ذریعہ پیش کردہ خفیہ رپورٹوں سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ان رپورٹوں میں راستے میں واقع گاؤں میں گاندھی جی کے ذریعہ کی گئیں تقاریر کی نقل بھی ملتی ہے۔ جن میں انھوں نے مقامی افسران سے درخواست کی تھی کہ وہ سرکاری ملازمت ترک کر کے جدوجہد آزادی میں شامل ہوجائیں۔ ایک واسنا نامی گاؤں میں گاندھی جی نے اعلی ذات کے لوگوں سے کہا تھا کہ ''اگر آپ سوراج کے لیے آواز اٹھاتے ہیں تو آپ کو اچھوتوں کی خدمت کرنی ہوگی فقط نمک ٹیکس یا دیگر ٹیکسوں کے منسوخ ہونے سے آپ کو سوراج حاصل نہیں ہوسکتا۔ سوراج کے لیے آپ کو ان

غلطیوں کی اصلاح کرنی ہوگی جو آپ نے اچھوتوں کے ساتھ کی ہیں۔ سوراج کے لیے ہندوؤں مسلمانوں، پارسیوں اور سکھوں کو متحد ہونا ہوگا۔ یہ سوراج کی طرف جانے والی سیڑھیاں ہیں۔''
پولس کے جاسوسوں نے اپنی رپورٹوں میں لکھا کہ گاندھی جی کی میٹنگوں میں تمام ذاتوں کے گاؤں کے لوگ اور مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی بجا طور پر حاضر ہوتی ہیں۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ ہزاروں رضا کار وقوم پرستی کے مقصد کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے سرکاری افسران تھے جنھوں نے نوآبادیاتی حکومت میں اپنے عہدوں سے استعفی دے دیا تھا۔ حکومت کو لکھی گئی رپورٹ میں ضلع پولس سپرنٹنڈنٹ نے تبصرہ کیا کہ محترم گاندھی پرسکون اور مطمئن دکھائی دیے۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہے ہیں مزید قوت پا رہے ہیں۔

نمک مارچ کی تکمیل کو دیگر ماخذوں سے بھی تلاش کیا جا سکتا ہے جیسے امریکی اخباری جریدہ ''ٹائم'' اس کی تحریریں گاندھی جی کی وضع قطع کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے ساتھ شروع ہوتی تھیں اور ان کے ''کمزور قالب'' اور ''مکڑی جیسے صلب'' کو حقیر گردانا گیا۔ چنانچہ اس مارچ کے متعلق اپنی پہلی رپورٹ میں ٹائم نے نمک مارچ کے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ اس نے دعوی کیا کہ پیدل چلنے کے دوسرے دن کے خاتمہ پر گاندھی جی زمین پر گر گئے۔ میگزین کو یقین نہیں تھا کہ ''لاغر و کمزور برگزیدہ شخص جسمانی طور پر مزید آگے جانے کے قابل رہے گا۔ لیکن ایک ہفتے کے اندر ہی اس کی فکر تبدیل ہوگئی۔ ٹائم نے لکھا کہ اس مارچ کو ملنے والی زبردست عوامی پیروی نے لوگوں کو جمع کر دیا جس سے انگریز حکمراں شدید مضطرب ہوگئے ہیں۔ اب وہ خود بھی گاندھی جی کو ایک برگزیدہ اور ''مدبر ماہر سیاست'' کے طور پر سلام کرنے لگے جو عیسائیوں کے خلاف عیسائی اقدامات کا ہی ہتھیار استعمال کر رہا تھا۔

شکل 13.8
جنوری 1931 میں مہاتما گاندھی کے جیل سے رہا ہونے کے بعد مستقبل کے لائحہ عمل کا منصوبہ تیار کرنے کے لیے الہ آباد میں کانگریس لیڈران کی نشست
اس تصویر میں آپ (دائیں سے بائیں) جواہر لعل نہرو، جمنالال بجاج، سبھاش چندر بوش، گاندھی جی، مہادیو ڈیسائی اور (سامنے کی طرف سردار ولبھ بھائی پٹیل کو دیکھ سکتے ہیں۔
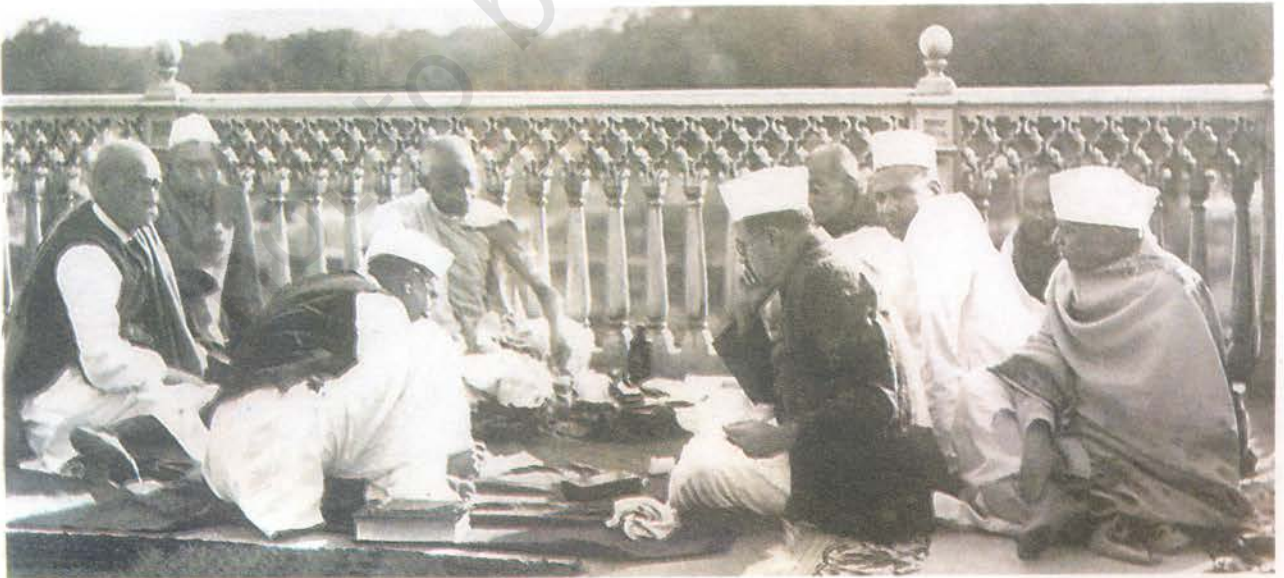
3.2 مکالمہ (Dialogues)

نمک مارچ کم از کم تین اسباب کی وجہ سے منفرد تھا۔ اول یہ وہ واقعہ تھا جس کی وجہ سے دنیا کی توجہ گاندھی جی کی طرف مبذول ہوئی۔ یوروپی اور امریکی پریس کے ذریعہ اس مارچ کی بڑے پیمانے پر اشاعت کی گئی۔ دوم یہ پہلی قوم پرست سرگرمی تھی جس میں خواتین نے بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ سرگرم اشتراکی کارکن کملا دیوی چٹوپادھیائے نے گاندھی جی کو قائل کیا وہ اپنے احتجاج کو صرف مردوں تک ہی محدود نہ رکھیں۔ کملا دیوی خود ان لاتعداد عورتوں میں سے ایک تھیں جنھوں نے نمک یا شراب قوانین کو توڑتے ہوئے گرفتاری دی تھی۔ تیسرا اور شاید سب سے اہم سبب یہ تھا کہ نمک مارچ کی وجہ سے ہی انگریزوں کو اچھی طرح سمجھ میں آیا کہ ان کا راج ہمیشہ نہیں رہے گا اور ہندوستانیوں کو بھی اقتدار میں کچھ تفویض کرنا پڑے گا۔

اسی مقصد کے لیے برطانوی حکومت نے لندن میں ''گول میز کانفرنس'' کا ایک سلسلہ منعقد کیا۔ نومبر 1930 میں پہلی میٹنگ ہندوستان میں سابق ممتاز سیاسی لیڈر کے بغیر میٹنگ منعقد ہوئی چنانچہ کارگزاری کی یہ مشق بیکار ثابت ہوئی۔ جنوری 1931 میں گاندھی جی جیل سے رہا ہوئے اور اگلے مہینے وائسرائے کے ساتھ ان کی کئی طویل میٹنگیں ہوئیں۔ ان میٹنگوں کا انجام ''گاندھی اِروِن سمجھوتہ'' کی شکل میں سامنے آیا جس کی شرائط میں سول نافرمانی تحریک واپس لینا تھا، سارے قیدیوں کی رہائی اور ساحلی علاقوں میں نمک تیار کرنے کی اجازت دینا تھا۔ انتہا پسند (Radical) قوم پرستوں کے ذریعہ اس سمجھوتے پر تنقید کی گئی، کیونکہ گاندھی جی وائسرائے سے ہندوستانیوں کے لیے سیاسی آزادی کا عہد لینے میں ناکام رہے تھے۔ انھیں ممکنہ مقصد کے حصول کے لیے فقط گفتگو کی یقین دہانی مل سکی تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس 1931 کے آخری حصہ میں لندن میں منعقد ہوئی۔ یہاں گاندھی جی کانگریس کی نمائندگی کر رہے تھے تاہم انھوں نے دعوی کیا کہ ان کی پارٹی پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے، جس کو تین پارٹیوں کی طرف سے چیلنج دیا گیا۔ اوّل مسلم لیگ کی طرف سے، جس نے دعوی کیا کہ وہ مسلم اقلیت کے مفادات کے لیے موقف اختیار کرتی ہے۔ دوم چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کی طرف سے جو دعویٰ کرتے تھے کہ کانگریس ان کی ریاستوں پر کوئی حق نہیں رکھتی، اور سوم غیر معمولی طور پر ذہین وکیل اور مفکر بی۔ آر۔ امبیڈکر کی طرف سے، جن کی دلیل تھی کہ گاندھی جی اور کانگریس نچلی ذاتوں کی حقیقتاً نمائندگی نہیں کرتے۔

لندن میں ہونے والی یہ کانفرنس بے نتیجہ ثابت ہوئی اس لیے گاندھی جی ہندوستان واپس آ گئے اور سول نافرمانی پھر سے شروع کردی۔ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن، ہندوستانی لیڈر

ماخذ 5

جداگانہ انتخابی حلقوں کے تعلق سے مسائل (The problem with separate electorates)

گول میز کانفرنس کے موقع پر مہاتما گاندھی نے دبے کچلے طبقات کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کے متعلق اپنی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

''اچھوتوں'' کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کو یقینی بنائے جانے سے غلامی مستقل صورت اختیار کر لے گی ......کیا آپ چاہتے ہیں کہ ''اچھوت'' بنے رہیں؟ خوب، جداگانہ انتخابی حلقوں سے بدنامی کا داغ مستقل طور پر بنا رہے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ''چھوت چھات'' کو ختم کیا جائے اور جب آپ یہ کرلیں تو ایک گستاخ ''اعلی'' طبقہ کے ذریعہ ایک ''کمتر'' طبقہ پر نافذ کیے گئے یہ مفسدانہ نشانات تباہ ہوجائیں گے جب آپ ایسا کریں گے تو پھر آپ کس کو جداگانہ انتخابی حلقے دیں گے؟

شکل 13.9
دوسری گول میز کانفرنس، لندن، نومبر 1931

مہاتما گاندھی نے ''نچلی ذاتوں'' کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کے مطالبے کی مخالفت کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ایسا کرنے سے سماج کی رائج الوقت روش میں ان کے انضمام کا عمل رک جائے گا اور ہندوؤں کی دیگر ذاتوں سے مستقل طور پر نسلی علاحدگی ہوجائے گی۔

(گاندھی جی) کے لیے انتہائی غیر ہمدرد تھا۔ اپنی بہن کو لکھے ایک ذاتی خط میں ولنگڈن نے لکھا تھا ''یہ ایک خوبصورت دینا ہے اگر چہ یہ گاندھی جی کے لیے نہیں ہے ...... جیسے کہ وہ ہمیشہ کہتا ہے کہ اس کا ہر قدم دراصل خدا سے تحریک یافتہ ہے لیکن دراصل یہ ایک منصوبہ بند سیاسی چال ہوتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ امریکی پریس اسے کمال کا آدمی کہتی ہے ...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نہایت غیر عملی، متصوفانہ اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کے درمیان رہ رہے ہیں جو گاندھی کو کسی حد تک ایک برگزیدہ شخص کے طور پر دیکھتے ہیں......''

تاہم 1935 میں نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں سے کسی حد تک نمائندگی پر مبنی حکومت کا وعدہ کیا گیا۔ دو سال بعد محدود حق رائے دہی کی بنیاد پر منعقدہ الیکشن میں کانگریس کو فتح حاصل ہوئی۔ اب 11 میں سے 8 صوبوں میں کانگریس کے ''وزیر اعظم'' اقتدار میں آئے جو برٹش گورنر کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔

ستمبر 1939 میں کانگریس وزارت کے عہدے سنبھالنے کے دو سال بعد، دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو دونوں ہی ہٹلر اور نازیوں کے زبردست ناقد تھے۔ نتیجے میں انھوں نے وعدہ کیا کہ انگریز یہ وعدہ کریں کہ اگر ایک مرتبہ جنگ کے اختتام پذیر ہونے کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی تو بدلے میں کانگریس انگریزوں کی جنگ کے لیے کوششوں کی حمایت کرے گی۔ انگریز حکومت نے ان کی یہ پیش کش مسترد کر دی۔ اس کے

ماخذ 6

جداگانہ انتخابی حلقوں کی بابت امبیڈکر کے خیالات
(Ambedkar on separate electorates)

دبے کچلے طبقات کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے مطالبہ کرنے پر گاندھی جی کی مخالفت کے جواب میں امبیڈکر نے لکھا تھا:

یہاں ایک ایسا طبقہ ہے جو بے شک اس حالت میں نہیں ہے کہ وہ بذات خود بقا کے لیے جدوجہد جاری رکھ سکے۔ جس مذہب سے یہ لوگ بندھے ہوئے ہیں وہ انھیں باعزت مقام مہیا کرانے کے بجائے ان پر کوڑھیوں کا ٹھپہ لگاتا ہے اور انھیں عمومی روابط کے لیے موزوں نہیں سمجھتا۔ معاشی طور پر یہ ایسا طبقہ ہے جو روزی روٹی کے لیے پوری طرح اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر انحصار کرتا ہے اور جس کے پاس اپنے ذریعہ معاش کے لیے کوئی آزاد راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ہندوؤں کے سماجی تعصبات کی وجہ سے ان کے سارے راستے بند ہیں بلکہ ہمارے ہندو سماج نے واضح کوشش کے ذریعہ ازاول تا آخر سارے ممکنہ دروازے بند کردیے جس نے دبے کچلے طبقات کو زندگی کے پیمانے پر اوپر اٹھنے کے لیے کوئی موقع مہیا نہیں کرایا۔

ان حالات میں تمام منصف مزاج لوگ اس بات کو قبول کریں گے کہ ایسے اپاہج طبقے کے لیے منظم استبداد کے خلاف زندگی کی جدوجہد میں کامیابی کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اسے سیاسی اقتدار میں کچھ حصہ ملے تا کہ یہ خود اپنا تحفظ کرسکیں ...... یہ سب سے مقدم ضرورت ہے......

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر ''وہاٹ کانگریس اینڈ گاندھی ہیوڈن ٹو دی ان ٹچیبلس''، رائٹنگز اینڈ اسپیچز، جلد 9، صفحہ 312 سے ماخوذ

شکل 13.10

مہاتما گاندھی اور راجندر پرساد وائسرائے لارڈ لنلتھ گو (Lidnlithgow) کے ساتھ میٹنگ کے لیے جاتے ہوئے 13 اکتوبر 1939

میٹنگ میں، جنگ میں ہندوستان کی شمولیت کی نوعیت پر بحث ہوئی۔ جب وائسرائے کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تو کانگریس وزارت نے استعفیٰ دے دیا۔

احتجاج میں کانگریس وزارت نے اکتوبر 1939 میں استعفیٰ دے دیا۔ 1940 اور 1941 کے دوران کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ کا ایک سلسلہ منظّم کیا تاکہ حکمرانوں پر اس بات کا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کی آزادی کا وعدہ کریں۔

دریں اثنا مارچ 1940 میں مسلم لیگ نے ''پاکستان'' کے نام سے ایک علاحدہ ملک بنانے کے لیے خود کو پابند کرتے ہوئے ایک قرارداد پاس کی۔ سیاسی منظرنامہ اب پیچیدہ ہو گیا تھا۔ اب یہ جدوجہد ہندوستانی بنام انگریز نہیں رہ گئی تھی بلکہ کانگریس، مسلم لیگ اور برطانوی حکومت کے درمیان تین طرفہ جدوجہد تھی۔ اس زمانے میں برطانیہ میں مخلوط پارٹی حکومت تھی جس میں شامل لیبر پارٹی کے ممبران ہندوستانیوں کی خواہشات کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے، لیکن اس حکومت کے وزیراعظم کنزرویٹیو پارٹی کے ونسٹن چرچل ایک کٹّر سامراجی شخص تھے جن کا اس بات پر اصرار تھا کہ ان کا تقرر بادشاہ کے اعلیٰ وزیر کی حیثیت سے اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ برطانوی سلطنت کے خاتمہ کے لیے بااختیار ہیں۔ 1942 کے موسم بہار میں مہاتما گاندھی اور کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کے لیے راغب کرنے کی کوشش میں اپنے ایک وزیر سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ تاہم کانگریس نے اس بات پر اصرار کیا کہ اگر اتحادی طاقتوں سے ہندوستان کی حفاظت کے لیے برطانوی حکومت کانگریس کی مدد چاہتی تو وائسرائے کو سب سے پہلے اپنی مجلس عاملہ (Executive Council) میں کسی ایک ہندوستانی کا دفاع ممبر کی حیثیت سے تقرر کرنا ہوگا۔ اس مسئلہ پر گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا گیا۔

تصویر 13.11

مہاتما گاندھی، اسیفورڈ کرپس کے ساتھ، مارچ 1942

بحث کیجیے

ماخذ 5 اور 6 کو پڑھیے، دبے کچلے طبقات کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کے مسئلے پر امبیڈکر اور گاندھی جی کے درمیان خیالی مکالمے کو لکھیے۔

4. ہندوستان چھوڑو (QUIT INDIA)

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد گاندھی جی نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی تیسری بڑی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ مہم ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک تھی جس کو اگست 1942 میں شروع کیا گیا۔ اگرچہ گاندھی جی کو ایک بار پھر جیل میں بند کر دیا گیا لیکن نوجوان سرگرم کارکنان پورے ملک میں ہڑتالیں اور تخریب کاری کے کام تشکیل دیتے رہے۔ بالخصوص پرکاش نارائن جیسے کانگریس کے اشتراکی ممبران خفیہ مزاحمت میں سرگرم تھے۔ بہت سے اضلاع میں جیسے مغرب میں ستارا اور مشرق میں میدنی پور میں ''آزاد'' حکومتوں کا اعلان کر دیا گیا۔ انگریزوں نے اس تحریک کا سختی کے ساتھ جواب دیا، تاہم اس بغاوت کو دبانے میں ایک سال سے بھی زائد کا عرصہ لگا۔

''ہندوستان چھوڑو'' واقعتاً ایک عوامی تحریک تھی جس میں لاکھوں کی تعداد میں عام ہندوستانی شامل ہوئے۔ خاص طور پر اس تحریک کو بڑی تعداد میں نوجوانوں نے توانائی مہیا کرائی جو اپنے کالجوں کو چھوڑ کر جیل گئے تھے۔ تاہم اس دوران کانگریس کے لیڈران جیل میں بند تھے، مسلم لیگ میں جناح اور ان کے ساتھی صبر و تحمل کے ساتھ اپنا دائرہ وسیع کرنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان سالوں میں لیگ نے پنجاب اور سندھ میں اپنی پہچان بنانا شروع کی تھی جہاں ماضی میں اس کی برائے نام موجودگی پائی جاتی تھی۔

ستارا 1943 (Satara)

انیسویں صدی کے آخر سے ایک غیر برہمی تحریک جو ذات پات کے نظام اور زمین داری نظام کے خلاف تھی مہاراشٹر میں ارتقا پذیر ہو چکی تھی۔ اس تحریک کے 1930 کی دہائی تک فوجی تحریک کے ساتھ رابطے قائم ہو چکے تھے۔

1943 میں مہاراشٹر کے ستارا ضلع میں کچھ جوان لیڈروں نے رضا کار دستے (سیبا دل) اور دیہی اکائی (طوفان دل) کے ساتھ ایک متوازی حکومت (پرتی سرکار) قائم کر لی تھی۔ انھوں نے عوامی عدالتوں کا نظم کیا اور منظم تعمیری کام کیے۔ کنبی کسانوں کے غلبے اور دلتوں کی حمایت سے ستارا کی پرتی سرکار، حکومت کے استیصال اور کانگریس کی ناپسندیدگی کے باوجود 1946 کے الیکشن تک منجملہ امور انجام دیتی رہی۔

شکل 13.12
ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران ممبئی میں خواتین کا ایک جلوس

جون 1944 میں جب جنگ عظیم خاتمہ کے قریب تھی، گاندھی جی کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اسی سال گاندھی جی نے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان فاصلہ کم کرنے کے لیے جناح کے ساتھ میٹنگوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ 1945 میں برطانیہ میں لیبر پارٹی اقتدار میں آئی جو ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے خود کو پابند عہد سمجھتی تھی۔ اس عرصے میں ہندوستان میں وائسرائے لارڈ ویویل نے کانگریس اور مسلم لیگ کو باہم ساتھ لانے کے مقصد سے بات چیت کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

1946 کے شروع میں صوبائی قانون ساز اداروں (اسمبلی) کے الیکشن ہوئے۔ جنرل زمرے میں کانگریس نے سب کا صفایا کر دیا لیکن خاص طور پر مسلمانوں کے لیے محفوظ سیٹوں میں مسلم لیگ نے زبردست اکثریت سے جیت حاصل کی۔ سیاسی طور پر مخالف سمتوں میں بڑھنے کا میلان (عمل تقطیب) (Polarisation) مکمل ہو چکا تھا۔ 1946 کی گرمیوں میں ایک کابینی مشن برطانیہ سے ہندوستان بھیجا گیا جس نے کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک وفاقی نظام (Federal System) پر راضی کرنے کی کوشش کی۔ اس نظام کے تحت ہندوستان کو باہم متحد رکھنے کے لیے ایک حد تک صوبوں کو خود مختاری دینے کی بات کی گئی تھی۔ مشن کی یہ کوشش ناکام رہی۔ سلسلۂ جنبانی (بات چیت) منقطع ہو جانے کے بعد جناح نے پاکستان کے لیے لیگ مطالبہ کے اصرار کے لیے ''یوم راست کارروائی'' (Direct Action Day) کا اعلان کیا۔ اس کے لیے 16 اگست 1946 کا دن مقرر کیا گیا، اسی دن کلکتہ میں خونی فسادات پھوٹ پڑے۔ یہ تشدد دیہی بنگال بعد میں بہار تک پھر ملک کے ایک سے دوسرے سرے تک متحدہ صوبہ جات اور پنجاب تک پھیل گیا۔ بعض جگہوں پر مسلمان مصیبت کا شکار تھے تو دیگر جگہوں پر ہندو بھی اس کی زد میں آئے۔

شکل 13.13
مہاتما گاندھی کے ساتھ جواہر لعل نہرو (دائیں طرف) اور سردار ولبھ بھائی پٹیل (بائیں) تبادلۂ خیال کرتے ہوئے۔
کانگریس کے اندر نہرو اور پٹیل دو ممتاز سیاسی رجحانات اشتراکی اور قدامت پرستی کی نمائندگی کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کو اکثر ان دونوں گروہوں کے درمیان ثالث بننا پڑتا تھا۔

فروری 1947 میں ویویل کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ماؤنٹ بیٹن نے آخری دور کے مذاکرات کے لیے دعوت دی، لیکن جب یہ

غیر نتیجہ خیز ثابت ہوا تو اس نے اعلان کیا کہ برطانوی ہندوستان آزاد کر دیا جائے گا لیکن اس کو تقسیم بھی کیا جائے گا۔ اقتدار کی رسمی منتقلی کے لیے 15 اگست کی تاریخ متعین کی گئی۔ جب وہ دن آیا تو ہندوستان کے مختلف حصوں میں جوش وولولے کے ساتھ جشن منایا گیا۔ دہلی میں جب آئین ساز مجلس کے صدر نے موہن داس کرم چند گاندھی کو ''بابائے قوم'' کا خطاب دیتے ہوئے میٹنگ شروع کی تو بہت دیر تک تالیوں کے ذریعہ دادوستائش ہوتی رہی۔ اسمبلی کے باہر مجمع ''مہاتما گاندھی کی جے'' کے نعرے لگا رہا تھا۔

5. آخری بہادرانہ دن (THE LAST HEROIC DAYS)

15 اگست 1947 کے دن جب راجدھانی میں آزادی کی خوشی میں جشن منائے جا رہے تھے، گاندھی جی ہندوستان میں موجود تھے۔ وہ کلکتہ میں تھے لیکن انھوں نے نہ تو کسی تقریب میں شرکت کی اور نہ ہی یہاں جھنڈا لہرایا۔ گاندھی جی اس دن 24 گھنٹے کے روزہ پر تھے۔ انھوں نے جس آزادی کے لیے اتنی طویل جدو جہد کی تھی وہ ایک ناقابل قبول قیمت پر انھیں ملی تھی یعنی ملک تقسیم ہو گیا اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کی گردن پر سوار تھے۔

گاندھی جی کے سوانح نگار ڈی۔ جی۔ تینڈولکر نے لکھا ہے کہ گاندھی جی ''پریشانی اور زبوں حالی کے شکار لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے اسپتالوں اور مہاجرین کے کیمپوں کا چکر لگا رہے تھے۔ انھوں نے سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ ''وہ ماضی کو بھلا کر اور اپنی مصیبتوں پر توجہ دینے کی بجائے ایک دوسرے کی طرف بھائی چارے کا ہاتھ بڑھانے اور امن وسکون کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کریں.....''

گاندھی جی اور نہرو کی پیش قدمی پر ''اقلیتوں کے حقوق'' پر ایک قرارداد پاس کی گئی۔ کانگریس پارٹی نے ''دوقومی نظریہ'' کو کبھی بھی قبول نہیں کیا۔ اپنی خواہش کے برخلاف جب تقسیم ملک کے لیے اسے اپنی منظوری دینی پڑی تب بھی اسے یقین تھا کہ ''ہندوستان کثیر مذاہب اور کثیر نسلوں کا ملک ہے اور اسے ایسا ہی برقرار رہنا ہے'' پاکستان میں حالت جو بھی رہے، ہندوستان ''ایک جمہوری سیکولر ریاست ہوگی جہاں سبھی شہریوں کو تمام حقوق حاصل ہوں گے اور مذہب کا لحاظ کیے بغیر جس سے وہ تعلق رکھتا ہے، ریاست کی طرف سے تحفظ کے لیے وہ برابر کا حقدار ہوگا۔ کانگریس نے امید جتائی اور اقلیتوں کو یقین دہانی کرائی کہ وہ ہندوستان میں ان کے شہری حقوق کے خلاف جارحیت سے اپنی بہترین استعداد کے ساتھ مسلسل تحفظ کرے گی۔''

بہت سے دانشوروں نے آزادی کے بعد کے مہینوں کو گاندھی جی ''نہایت عمدہ ساعت'' لکھا ہے۔ بنگال میں امن قائم کرنے کے بعد گاندھی جی دہلی منتقل ہوگئے جہاں سے وہ پنجاب کے فساد زدہ اضلاع میں جانے کے خواہش مند تھے۔ حالانکہ راجدھانی میں ہی مہاجرین کے ذریعہ ان کے جلسے میں خلل اندازی ہونے لگی جو جلسوں میں ان کے قرآن کی آیات پڑھنے پر اعتراض کرتے یا زور سے نعرے لگاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ وہ ان ہندوؤں اور سکھوں کی تکالیف و پریشانی کے متعلق کیوں نہیں بولتے جو ابھی تک پاکستان میں رہ رہے ہیں۔ جی۔ ڈی۔ تینڈولکر لکھتے ہیں کہ گاندھی جی پاکستان میں موجود اقلیتی طبقوں کی تکالیف کے تئیں مساوی طور پر فکر مند تھے۔ وہ ان کی اعانت و دستگیری کے لیے وہاں جانے کے لیے خواہش مند تھے، لیکن وہ کس منہ سے وہاں جا سکتے تھے جب کہ وہ دہلی میں ہی مسلمانوں کو تکلیف و پریشانی سے پوری طرح تلافی کی ضمانت بھی نہیں دے سکتے تھے؟''

شکل 13.14
گاندھی جی ایک فسادزدہ گاؤں کی طرف جاتے ہوئے، 1947

20 جنوری 1948 کے دن گاندھی پر ایک جان لیوا حملہ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن انھوں نے بے خوف اپنا کام جاری رکھا۔ 26 جنوری کو انھوں نے اپنی پرارتھنا سبھا (مناجاتی جلسہ) میں اس بات کا ذکر کیا کہ گذشتہ سالوں میں کس طرح اس دن کو یوم آزادی کے جشن کے طور پر منایا جاتا تھا۔ اب آزادی مل چکی ہے لیکن اس کے کچھ ابتدائی مہینے فریب نظر اور وہموں سے بھرے تھے۔ تاہم ان کا یقین تھا کہ ''بدترین دور گذر چکا ہے'' لہٰذا اب سب ہندوستانی ''تمام طبقات اور مذاہب کی برابری'' کے لیے اجتماعی طور پر کام کریں گے۔ اقلیتی طبقے پر اکثریتی طبقے کا غلبہ اور برتری کبھی قائم نہیں ہوگی خواہ اقلیتی طبقہ تعداد اور اثر کے اعتبار سے کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو'' خود انھوں نے اس بات کی امید بھی دلائی کہ'' اگرچہ جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے لیکن دل میں ہم سب دوست اور بھائی ہی رہیں گے، ایک دوسرے کی مدد اور تکریم و تعظیم کرتے رہیں گے اور خارجی دنیا کے لیے ایک ہی ہوں گے۔''

شکل 13.15
گاندھی جی کی وفات، ایک مروج تصویر
مروج عوامی شبیہوں میں گاندھی جی کو دیوتا قرار دے دیا گیا اور انھیں قومی تحریک میں ایک اتحاد پیدا کرنے والی قوت کے طور پر دکھایا جاتا تھا۔ یہاں آپ جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل کو دیکھ سکتے ہیں جو کانگریس کے اندر دریا کے دو کناروں کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ گاندھی جی کی چتا کے دونوں طرف کھڑے ہیں۔ تصویر کے وسط میں مہاتما گاندھی دونوں کو دعا (آشیرواد) دے رہے ہیں۔

گاندھی جی نے آزادی اور متحدہ ہندوستان کے لیے زندگی بھر لڑائی لڑی، مزید برآں جب ملک تقسیم ہو گیا تب بھی ان کا اصرار تھا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے لیے عزت اور دوستی قائم رکھیں۔

دوسرے ہندوستانیوں کو ان کا حد سے زیادہ معاف کر دینے والا انداز پسند نہ تھا۔ 30 جنوری کی شام کو ان کے روزانہ کے مناجاتی جلسہ میں ایک نوجوان نے گاندھی جی کو گولی مار کر موت

کی نیند سلا دیا۔ ان کے قاتل نے بعد ازاں خود سپردگی کر دی جو ناتھورام گوڈ سے نامی پونے کا ایک برہمن تھا۔ ناتھورام گوڈ سے ایک انتہا پسند ہندو اخبار کا ایڈیٹر تھا جو گاندھی جی کی ''مسلمانوں کے تشفی کرنے والے'' کے طور پر بالاعلانیہ مذمت کرتا تھا۔

گاندھی جی کی موت غیر معمولی طور پر گہرے رنج وغم کے جذبات کے اظہار کا سبب بنی، ہندوستان میں سیاسی قوس وقزح کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جارج ویل اور البرٹ آئن اسٹائین جیسی بین الاقوامی شخصیات کی طرف سے بھی جذباتی و حساس ردعمل سامنے آیا۔ ایک زمانے میں گاندھی جی کی جسمانی ساخت اور ظاہراً غیر عقلیت پسند خیالات کا مذاق اڑانے والے ''ٹائم'' میگزین نے ان کی شہادت کا موازنہ ابراہم لنکن کی شہادت سے کیا جن کو ایک متعصب امریکی شہری نے قتل کر دیا تھا کیونکہ ابراہم لنکن بلا لحاظ رنگ ونسل نوع انسانی کی مساوات میں یقین رکھتے تھے اور جس نے گاندھی جی کو قتل کیا تھا وہ ایک متعصب ہندو تھا۔ گاندھی جی کا یقین تھا کہ دوستی ممکن ہے اور مختلف مذاہب کے ہندوستان کے درمیان وہ واقعتاً اس کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ اس احترام میں ''ٹائم'' لکھتا ہے۔ ''دنیا جانتی تھی کہ اس نے ان کی (گاندھی جی) موت پر ویسی ہی چشم پوشی اختیار کی ہے جیسی لنکن کی موت پر کی تھی اور دنیا کے لیے یہ سمجھنا ایک معنی میں بہت گہرا اور بے حد آسان کام ہے۔''

6. گاندھی جی کی واقفیت (KNOWING GANDHI)

ایسے کئی قسم کے ماخذات موجود ہیں جن کی روشنی میں ہم گاندھی جی کی سیاسی زندگی کے واقعات اور قومی تحریک کی تاریخ کی تعمیر نو کر سکتے ہیں۔

6.1 عوامی رائے اور ذاتی تحریریں (Public voice and private scripts)

مہاتما گاندھی اور ان کے ہم عصروں بشمول رفیق کاروں اور مخالفوں دونوں کی تحریریں اور تقریریں ایک اہم ماخذ ہیں۔ ان میں ہمیں یہ امتیاز کرنا ضروری ہے کہ کون سی عوام کے لیے معنی خیز ہیں اور کون سی نہیں۔ مثال کے طور پر تقریریں ہمیں ایک فرد کی عوامی رائے سننے کی اجازت دیتی ہیں۔ جب کہ اس کے ذاتی خطوط ہمیں ذاتی خیالات کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔ خطوط میں ہم لکھنے والے افراد کا اپنا غصہ اور درد، ان کا اضطراب اور بے چینی، ان کی امیدیں اور مایوسی بیان کرتے ہوئے ان معنی میں دیکھ سکتے ہیں جس معنی میں وہ بذات خود عوامی بیانات میں ظاہر نہیں کر سکتے، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ ذاتی وعوامی کا فرق اکثر ٹوٹ جاتا ہے۔ بہت سارے خطوط

جو کسی فرد واحد کو لکھے جاتے ہیں اس لیے وہ ذاتی کہلاتے ہیں لیکن وہ عوام کے لیے بھی کسی حد تک بامعنی ہوتے ہیں۔ خطوط کی زبان اکثر اس شعور سے تشکیل پاتی ہے کہ شاید انھیں ایک دن شائع کر دیا جائے۔ اس کے برعکس خط کے شائع ہونے کی امید اکثر لوگوں کو ذاتی خطوط میں بھی اپنی رائے کا اظہار آزادی سے کرنے میں مزاحم ہوتی ہے۔ مہاتما گاندھی اپنے رسالہ ''ہریجن'' میں باقاعدگی کے ساتھ ان خطوط کو شائع کرتے تھے جو دوسرے افراد ان کو لکھتے تھے۔ نہرو نے قومی تحریک کے دوران انھیں لکھے گئے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا اور اسے ''اے بنچ آف اولڈ لیٹرز'' (پرانے خطوط کا مجموعہ A Bunch of Letters) کے نام سے شائع کیا تھا۔

ماخذ 7

ایک واقعہ خطوط کے ذریعہ (One event through letters)

1920 کی دہائی میں جواہر لعل نہرو اشتراکیت (Socialism) سے متواتر متاثر ہو رہے تھے اور 1928 میں جب وہ یوروپ سے واپس آئے تب وہ سوویت یونین سے شدید متاثر تھے۔ جب انھوں نے اشتراکی لوگوں (جے پرکاش نارائن، نریندر دیو، این۔ جی۔ رنگا اور دیگر) کے ساتھ نزدیکی طور پر کام کرنا شروع کیا تو کانگریس کے اندر اشتراکی اور قدامت پرستوں کے درمیان ایک دراڑ پیدا ہوگئی۔ 1936 میں کانگریس کا صدر بننے کے بعد نہرو نے فاشزم (فسطائیت) کے خلاف جذباتی بیان دیے اور مزدوروں و کسانوں کے مطالبات کی حمایت کی۔

نہرو کی اشتراکی خطابت سے فکرمند قدامت پرستوں نے راجندر پرساد اور سردار پٹیل کی قیادت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دینے کی دھمکی دی اور ممبئی میں کچھ اہم صنعت کاروں نے نہرو پر تنقید کرتے ہوئے بیانات جاری کیے۔ بعد میں پرساد اور نہرو دونوں نے مہاتما گاندھی کی طرف رخ کیا اور واردھا میں واقع ان کے آشرم میں ان سے ملاقات کی۔ جیسا کہ گاندھی جی اکثر کرتے تھے انھوں نے دونوں کے بیچ ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے نہرو کی سیاسی انتہا پسندی اور پرساد نیز دیگر لوگوں کو نہرو کی قیادت کی اہمیت کو باور کرایا۔

اے بنچ آف اولڈ لیٹرز، 1958 میں نہرو نے اس وقت کی تبادلۂ مراسلت کے بہت سے خطوط کی مکرر اشاعت کی۔ ان خطوط کے اقتباسات کو ذیل میں پڑھیے۔

اے بنچ آف اولڈ لیٹرز سے (From A Bunch of Old Letters)

عزیز من جواہر لعل جی، واردھا، یکم جولائی **1936**

کل آپ سے رخصت ہونے کے بعد ہم نے مہاتما گاندھی جی سے طویل گفتگو اور تفصیلی مشاورت کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے طرز عمل سے آپ نے شدید تکلیف محسوس کی ہے، خاص طور سے ہمارے خط کا لہجہ آپ کے لیے شدید تکلیف کا باعث بنا ہے۔ ہمارا مقصد کبھی بھی آپ کو شرمندہ کرنا یا تکلیف پہنچانا نہیں تھا اور اگر آپ تجویز کر دیتے یا نشاندہی کر دیتے کہ اس بات سے آپ کو تکلیف پہنچی تو ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے خط میں ترمیم یا اس میں تبدیلی کر لیتے لیکن ہم نے مکمل صورت حال کی نظر ثانی کرنے کے بعد یہ خط اور اپنے استعفیٰ کو واپس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ پریس میں شائع تمام گفتگو میں آپ کانگریس کے عمومی پروگرام کے متعلق اتنا زیادہ نہیں بول رہے ہیں جتنا ایک ایسے موضوع پر جس کو کانگریس نے درست تسلیم نہیں کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے آپ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں ہمارے اقلیتی طبقے کے ساتھیوں کے ترجمان کی طرح زیادہ عمل کر رہے ہیں نہ کہ اکثریتی طبقے کے ترجمان کی حیثیت سے جس کی کانگریس صدر ہونے کے ناطے ہمیں آپ سے امید تھی۔

ہمارے خلاف یہاں مسلسل ایک مہم جاری ہے اور ہمارے ساتھ ایک ایسے شخص جیسا سلوک کیا جا رہا ہے جس کا وقت گزر چکا ہو، جو فرسودہ خیالات و تصورات جس کی دور حاضر میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کی نمائندگی کرتا ہے، جو ملک کی ترقی کے عمل میں رخنہ اندازی کرتے ہیں اور اس کے مستحق ہیں کہ ان کو ان عہدوں سے نکال باہر کرنا چاہیے جن پر انھوں نے نامناسب طور پر قبضہ کر رکھا ہے........ہم نے محسوس کیا ہے کہ دیگر لوگوں نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے اور کر رہے ہیں اور ہمیں آپ کی طرف سے وہ تحفظ نہیں مل پا رہا ہے جو بطور ایک ساتھی اور ہمارے صدر کی حیثیت سے آپ کی طرف سے ملنے کے ہم مستحق ہیں..........

آپ کا مخلص

راجندر پرساد

میرے پیارے باپو **الہ آباد، 5 جولائی 1936**

میں کل رات یہاں پہنچا، جب سے میں نے واردھا چھوڑا ہے جسمانی کمزوری اور ذہنی طور پر پریشانی محسوس کر رہا ہوں

...... یوروپ سے میری واپسی کے بعد سے میں نے پایا کہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں کے بعد بری طرح تھک جاتا ہوں؛ وہ مجھ پر کمزوری کے اثرات مرتب کرتی ہیں اور سال بہ سال ہر نئے تجربے کے بعد تقریباً میں خود کو مزید بوڑھا محسوس کرنے لگتا ہوں......

معاملات کو ہموار کرنے میں اور بحران سے بچانے کے لیے تعاون دینے میں آپ نے جو زحمت اٹھائی ہے، اس کے لیے میں آپ کا مشکور ہوں۔

مجھے بھیجا گیا راجندر بابو کا خط (دوسرا خط) میں نے دوبارہ پڑھا۔ اس میں انھوں نے مجھے ایک دہشت انگیز اور تعزیری کارروائی کرنے والا شخص تصور کیا ہے......

تاہم حقائق کتنی ہی نرمی وگدازی سے بیان کیے جائیں، ان کے معنی یہ ہیں کہ میں ایک ناقابل برداشت زحمت بن چکا ہوں اور جو بھی خوبیاں رکھتا ہوں تھوڑی بہت قابلیت، طاقت، سنجیدگی، کسی حد تک ایسی شخصیت جو مبہم کشش رکھتی ہے ان کے لیے خطرناک بن چکی ہیں کیونکہ وہ (میں) ایک غلط رتھ (اشتراکیت) کے لیے کمربستہ ہیں۔ ان سب کا نتیجہ عیاں ہے۔

میں نے اپنے موجودہ خیالات و تصورات کے متعلق اپنی کتاب میں اور بعد میں بھی بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ میرے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے یہاں مواد کی کمی نہیں ہے۔ میرے وہ نظریات عارضی نہیں ہیں۔ وہ میرا حصہ ہیں اور اگرچہ میں انھیں بدل سکتا ہوں یا مستقبل میں وہ بدل سکتے ہیں، جب تک کہ میں انھیں سنبھالے ہوئے ہوں ان کا اظہار ضرور کروں گا کیونکہ میں ایک وسیع اتحاد کے لیے اسے بڑی اہمیت دیتا ہوں، اس لیے میں نے ممکنہ طریقے سے معتدل انداز میں ان کا اظہار کیا ہے اور معین نتیجے کے بجائے غور و خوض کے لیے بطور دعوت نامہ زیادہ پیش کیا ہے۔

مجھے اس طریقہ میں اور کانگریس جو کچھ کر رہی تھی، اس کے درمیان کوئی ٹکراؤ نظر نہیں آتا۔ جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا طریقہ ہمارے لیے ایک واضح و معین اثاثہ ہے کیونکہ اس سے عوام میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے، لیکن میرے وہ طریقے، جو معتدل اور مبہم تھے، میرے ساتھی خطرناک اور نقصان سمجھتے ہیں۔ مجھ سے یہاں تک کہا گیا کہ ہندوستان میں غریبی اور بیروزگاری پر ہمیشہ اصرار کرنا کوتاہ اندیشی تھی، یا بہر میں صورت میں اس معاملے میں غلط تو تھا ہی......

آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کسی قسم کا بیان جاری کرنا چاہتے ہیں، میں اس بیان کا خیر مقدم کروں گا، کیونکہ میرا ماننا ہے کہ ہر نظریہ ملک کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

محبت کے ساتھ آپ کا

جواہر لعل

عزیز من جواہر لعل جی — سیگاؤں، 15 جولائی 1936

تمہارا خط رقت انگریز ہے، تم اپنے آپ کو سب سے زیادہ زخمی محسوس کرتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تمہارے ساتھیوں کے پاس تمہاری جیسی ہمت اور بے باکی کا فقدان ہے۔ نتیجہ تباہ کن رہا ہے۔ میں نے ہمیشہ التجا کی ہے کہ وہ تم سے آزادی اور بے خوفی کے ساتھ بات کریں لیکن ان کے پاس ہمت کی کمی ہے اس لیے وہ جب بھی کبھی بولتے ہیں بدسلیقگی کے ساتھ بولتے ہیں اور تم آزردہ محسوس کرتے ہو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں، وہ تمہیں اس لیے ہراساں کر رہے ہیں کیونکہ تمہاری حساسیت اور بے صبری سے وہ واقف ہیں۔ وہ تمہاری تنقید و ملامت اور تحکم آمیز انداز سے تلملا جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تمہارے اندر جو خط سے مبرا اور برتر علم انھیں نظر آتا ہے اسے تمہارا بے جا دعویٰ تصور کرتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ تم نے ان کے ساتھ بمشکل کوئی خوش اخلاقی کا سلوک کیا ہے اور کبھی بھی اشتراکیوں کے تمسخر اور حتیٰ کہ بدتعبیری سے ان کا دفاع نہیں کیا ہے۔

میں اس پورے معاملے کو ایک حسرت ناک مضحکہ خیز واردات کی طرح دیکھتا ہوں تاہم میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس پورے معاملے کو ہلکے انداز میں دیکھو۔

میں نے ہی تمہارا نام اس کانٹوں بھرے تاج (کانگریس کی صدارت) کے لیے تجویز کیا تھا، اگرچہ سر زخمی ہو جائے اسے پہنے رہنا۔ کمیٹی کی میٹنگوں میں اپنی حس مزاح دوبارہ شروع کرو۔ وہ تمہارا اکثر معمول کا کردار ہے۔ نڈھال شخص کی طرح نہیں، تنگ مزاج آدمی معمولی سے موقع پر پھٹ پڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے تار کے ذریعہ بتاؤ کہ میرا خط پڑھنے کے بعد تمہیں ویسی ہی خوشی محسوس ہوئی جیسے لاہور میں نئے سال کے دن تم نے محسوس کی تھی جب مجھے اطلاع ملی تھی کہ تم ترنگے کے چاروں جانب ناچے تھے۔

تم اپنے گلے کو ایک (آرام) موقع ضرور دو۔

میری طرف سے پیار

باپو
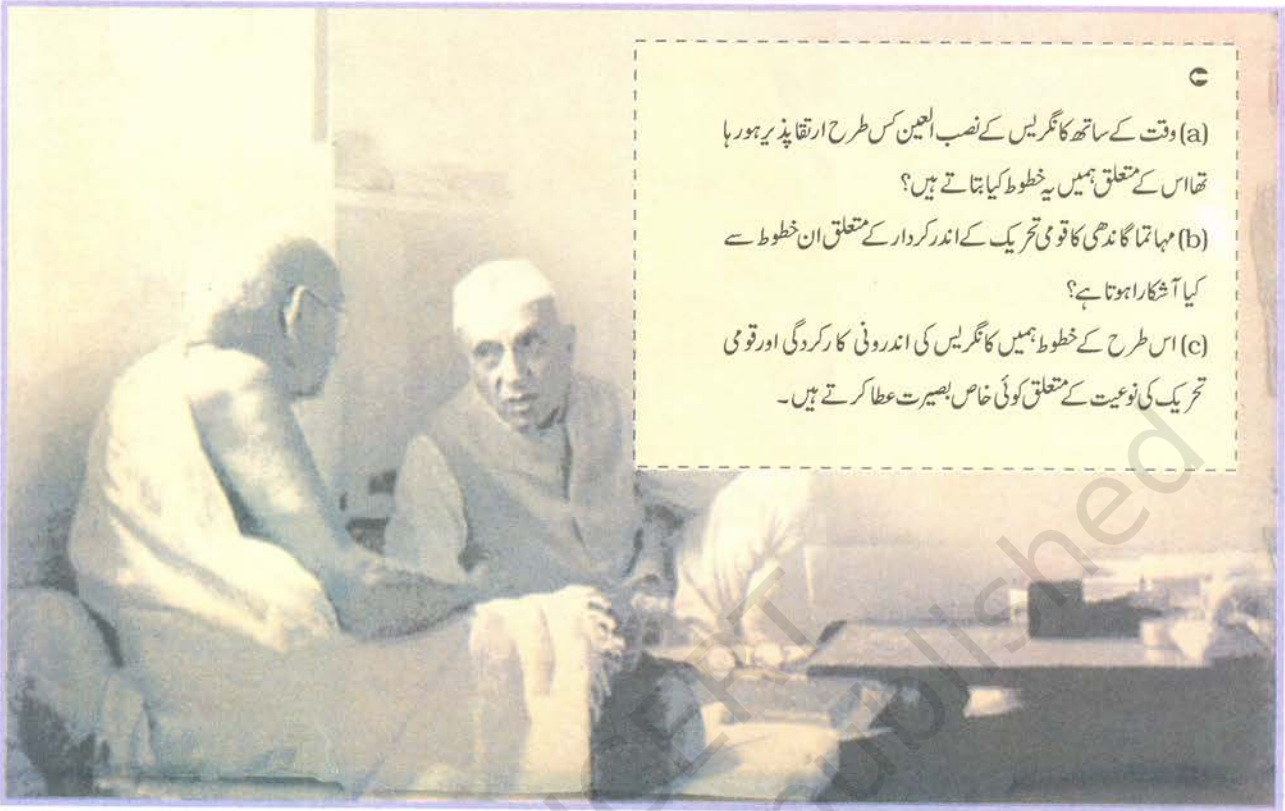
6.2 تصویری قالب (Framing a picture)

خودنوشت سوانح عمریاں ہمیں ماضی کی ایک ہی طرح کی روداد سناتی ہیں جو انسانی تفصیلات کے لحاظ سے کافی مالا مال تھا، لیکن یہاں ہمیں ایک بار پھر خودنوشت سوانح عمریوں کے پڑھنے اور ان کی تعبیر کے طریقہ کو مدنظر رکھتے ہوئے محتاط رہنا ہوگا۔ ہمیں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ سابقہ حالات سے متعلق روداد اکثر یادداشت کی بنیاد پر لکھی جاتی ہیں۔ یہ ہمیں بتاتی ہیں کہ مصنف کیا یادیں تازہ کر رہا ہے۔ اسے کیا اہم نظر آیا یا وہ کیا بیان کرنے پر قادر تھا یا ایک شخص اپنی زندگی دوسروں کی نظروں میں کس طرح لانے کا خواہش مند تھا۔ ایک خودنوشت سوانح عمری لکھنا اپنی زندگی کو تصویری قالب میں لانے کا ایک طریقہ ہے۔ اس لیے ان رودادوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں وہ دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو مصنف ہمیں بتانا نہیں چاہتا۔ ہمیں اس خاموشی کے اسباب کو سمجھنے کی ضرورت ہے یعنی وہ سب دیدہ و دانستہ یا غیر دانستہ فراموش کردہ کام۔

6.3 پولس کی نظر سے (Through police eyes)

دیگر انتہائی اہم ماخذ حکومت کے دستاویزات ہیں، نوآبادیاتی حکمراں ایسے دستاویزات کو تسمہ سے باندھ کر رکھتے تھے جن کو وہ حکومت کے لیے مخدوش سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں پولس والوں اور دیگر

افسران کے ذریعہ لکھے گئے خطوط اور رپورٹیں صیغۂ راز ہوتی تھیں، لیکن اب یہ دستاویزات آرکائیوز میں قابل دسترس ہیں۔

آیئے ہم ایک ایسے ہی ماخذ پر نظر ڈالیں: ابتدائی بیسویں صدی سے شعبہ وزارت داخلہ کے ذریعہ تیار کردہ پندرہ روزہ رپورٹیں مقامی علاقوں سے پولس کے ذریعہ فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہیں۔ اکثر یہ رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ اعلیٰ افسران کیا دیکھنا چاہتے تھے یا کیا یقین کرنے کے خواہش مند تھے۔ سرکشی اور بغاوت کے امکانات کا مشاہدہ کرتے ہوئے حالانکہ وہ خود کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ یہ خوف بلا جواز تھے۔ اگر آپ نمک ستیہ گرہ (مارچ) کے زمانے کی پندرہ روزہ رپورٹوں کو ملاحظہ کریں تو آپ مشاہدہ کریں گے کہ شعبہ وزارت داخلہ یہ قبول کرنے کے لیے رضامند نہ تھا کہ مہاتما گاندھی کی کارروائیوں کے تئیں عوام کی طرف سے کوئی پرجوش ردعمل ابھر رہا تھا۔ ان رپورٹوں میں نمک

شکل 13.16
سول نافرمانی تحریک کے دوران بمبئی میں کانگریس کے رضا کاروں کے ساتھ پولس کا تصادم۔

⊂ کیا آپ اس تصویر اور پولس کی تیار کردہ رپورٹوں میں دی گئی اطلاعات کے درمیان باہم تضاد دیکھ سکتے ہیں؟

شعبۂ وزارت داخلہ کی پندرہ روزہ رپورٹیں (بصیغۂ راز)
(Fortnightly Reports of the Home Department (Confidential))

مارچ 1930 کا پہلا عشرہ

یہاں گجرات میں سیاسی ارتقائی عمل پر گہری نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس سے صوبہ کی سیاسی صورت حال پر کس حد تک اور کس رخ پر اثر پڑے گا، اس وقت اس کا اندازہ کرنا مشکل امر ہے۔ فی الحال کسان ربیع کی فصل کی کٹائی میں مشغول ہیں۔ طلبہ اپنے آنے والے امتحانات کی تیاری میں منہمک ہیں۔

مرکزی صوبہ جات اور برار

ولبھ بھائی پٹیل کی گرفتاری، کانگریس حلقوں کے علاوہ معمولی ہیجان کا سبب بنی لیکن ناگپور کانگریس کمیٹی کے ذریعہ گاندھی کو ان کا مارچ شروع کرنے پر مبارک باد دینے کے لیے میٹنگ میں 3,000 سے بھی زیادہ افراد کا مجمع موجود تھا۔

بنگال

گاندھی جی کی سول نافرمانی مہم کا آغاز گزشتہ عشرہ کا غیر معمولی واقعہ ہے۔ جے۔ ایم۔ سین گپتا اور بنگال صوبائی کانگریس کمیٹی نے ایک کل بنگال سول نافرمانی کونسل تشکیل دی ہے۔ لیکن ان کی تشکیل کے علاوہ بنگال میں سول نافرمانی کے معاملے میں کوئی سرگرم قدم ابھی تک نہیں اٹھایا گیا ہے۔

اضلاع کی رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ جو میٹنگیں منعقد کی گئیں ان میں لوگوں میں معمولی جوش یا دلچسپی دکھائی نہیں دی اور عام لوگوں پر کوئی گہرا نقش نہیں چھوڑا تا ہم یہ امر قابل غور ہے کہ ان میٹنگوں میں حاضر ہونے والی خواتین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بہار اور اڑیسہ

کانگریس کی سرگرمی سے متعلق رپورٹ کرنے کے لیے یہاں برائے نام مواد ہے۔ یہاں چوکیداری ٹیکس کی ادائیگی نہ کرنے کے سلسلے میں ایک مہم خاصی زیر بحث ہے۔ لیکن ابھی تک اس تجربہ کے لیے کوئی علاقہ منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے تعلق سے بے تحاشا قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، لیکن یہ زیادہ ممکن نظر آتا ہے کہ پیشین گوئیوں کے سچ ثابت نہ ہونے کے سبب سارے منصوبے خاک میں مل گئے ہیں۔

مدراس

گاندھی جی کی سول نافرمانی مہم شروع ہونے سے سارے دیگر مسئلے پوری طرح ماند پڑ گئے ہیں۔ اس ضمن میں عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ مارچ ڈرامائی ہے اور ان کا یہ پروگرام ناقابل عمل ہے لیکن عموماً ہندو عوام بذات خود انھیں مقدس و محترم خیال کرتے ہیں، اس لیے گرفتاری کے امکان جس کے بارے میں وہ قصداً پر جوش نظر آتے ہیں اور اس کے سیاسی حالات پر اثرات، کافی بدگمانی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

12 مارچ، سول نافرمانی مہم کے افتتاح کے دن کے طور پر منایا گیا۔ ممبئی میں صبح کے وقت جشن کی شکل میں قومی پرچم کو سلامی دی گئی۔

بمبئی

کیسری پریس کو جارحانہ زبان استعمال کرنے میں ملوث پایا گیا ہے۔ معمول کے مطابق اس کا رویہ متلون مزاجی کا ہے۔ لکھتا ہے "اگر حکومت ستیہ گرہ کی طاقت آزمانا چاہتی ہے تو عمل اور بے عملی اس کے لیے ضرر کا سبب بنے گی۔ اگر سرکار گاندھی جی کو گرفتار کرتی ہے تو اسے ملک کی بے اطمینانی سے زیر بار ہونا پڑے گا، اگر حکومت ایسا نہیں کرتی تو سول نافرمانی کی تحریک وسیع ہوتی جائے گی۔ تاہم، ہم کہتے ہیں کہ اگر حکومت جناب گاندھی کو سزا دیتی ہے تو بھی ملک کی جیت ہوگی اور اگر حکومت انھیں اپنے راستے پر چلنے دیتی ہے تو پھر بھی یہ ایک بڑی فتح ہوگی۔ دوسری طرف اعتدال پسند اخبار " وودھ ورت" نے تحریک کے بے اثر ہونے کی نشاندہی کی ہے اور اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ یہ تحریک اپنے پیش نظر مقصد کو حاصل نہیں کر سکتی تاہم اس نے حکومت کو یاد دہانی کرائی کہ استیصال اس کے مقصد کو ناکام کر دے گا۔

مارچ 1930 کا دوسرا عشرہ

بنگال

سب کی دلچسپی گاندھی کے سمندر تک مارچ اور سول نافرمانی مہم کے لیے ان کے انتظامات کے اطراف مرکوز ہے۔ انتہا پسند اخبارات ان کی کارروائیوں اور تقاریر کے متعلق تفصیل سے لکھ رہے ہیں اور پورے بنگال میں منعقد ہونے والی میٹنگوں اور ان میں پیش ہو رہی قرار دادوں کے بعد بڑے پیمانے پر اس کی نمائش کر رہے ہیں۔ گاندھی کے ذریعہ سول نافرمانی کی شکل میں طرفداری کے لیے معمولی جوش ہے......

عام طور پر لوگ اس بات کو دیکھنے کے لیے انتظار کر رہے ہیں کہ گاندھی کے ساتھ کیا واقع ہوتا ہے اور امکان یہی ہے کہ اگر ان کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تو بنگال میں آتش گیر مادہ میں چنگاری بھڑک اٹھے گی لیکن کسی طرح کی شدید آتش زدگی کی توقعات نظر نہیں آتیں۔

مرکزی صوبہ جات اور برار

ناگپور میں 12 مارچ کو گاندھی کے مارچ کے آغاز کے موقع پر ان میٹنگوں میں کافی لوگ حاضر ہوئے اور زیادہ تر اسکول ویران نظر آئے۔

شراب کی دکانوں کا بائیکاٹ اور جنگلی قوانین کی خلاف ورزی حملے کا سب سے زیادہ امکانی راستہ نظر آتا ہے۔

پنجاب

یہ محسوس کرنا بعید از امکان نہیں ہے کہ جہلم ضلع میں نمک کا قانون توڑنے کی منظم کوششیں کی جائیں گی۔ ملتان میں پانی ٹیکس کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں جو شورش ہے، اس کی تجدید کی جائے گی اور غالباً گوجرانوالہ میں قومی پرچم کے تعلق سے کچھ تحریک شروع ہو سکتی ہے۔

متحدہ صوبہ جات

گذشتہ عشرہ کے دوران سیاسی سرگرمی میں بلاشبہ شدت آئی کانگریس پارٹی محسوس کرتی ہے کہ عوام کی دلچسپی بنائے رکھنے کے لیے اسے کچھ قابل دید کام کرنے چاہئیں۔ گاندھی کے احکامات وصول ہونے پر رضا کاروں کی بھرتی، گاؤں میں پروپیگنڈہ اور نمک قانون توڑنے کی تیاری جیسی سرگرمیوں کی خبریں بہت سے اضلاع سے آ رہی ہیں۔

اپریل 1930 کا پہلا عشرہ

متحدہ صوبہ جات

اس عشرہ کے دوران واقعات بہت تیزی سے آگے بڑھے۔ سیاسی میٹنگوں، جلسوں اور رضا کاروں کی بھرتی کے علاوہ، آگرہ، کانپور، بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، میرٹھ، رائے بریلی، فرخ آباد، اٹاوہ، بلیا اور مین پوری میں نمک قانون کی کھلے عام خلاف ورزی کی گئی۔

14 اپریل کی صبح جب پنڈت جواہر لعل نہرو، مرکزی صوبہ جات میں یوتھ لیگ کی ایک میٹنگ میں شرکت کرنے جا رہے تھے تب ان کو چیوکی ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو اس موقع پر سیدھے نینی سینٹرل جیل لے جایا گیا جہاں ان پر مقدمہ چلا اور 6 مہینے کی معمولی قید کی سزا سنائی گئی۔

بہار اور اڑیسہ

بعض مقامات پر غیر قانونی طریقے سے نمک بنانے کی کوشش کی گئی لیکن چھوٹے پیمانے پر قابل دید کوششیں ہو رہی ہیں۔

مرکزی صوبہ جات

جبل پور میں سیٹھ گووند داس نے کیمیائی نمک بنانے کی کوششیں کی، جس کی لاگت صاف (عام) نمک کی بازاری قیمت سے کئی گنا زیادہ ہے۔

مدراس

جب پولس نے سمندر کے پانی کو ابال کر بنائے گئے نمک کو ضبط کرنے کی کوششیں کی تو وشاکھا پٹنم میں پولس کو معقول مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن دوسری جگہوں پر غیر قانونی نمک کو ضبط کرنے پر مزاحمت نیم دلی کے ساتھ کی گئی۔

بنگال

مفصل علاقوں میں غیر قانونی نمک بنانے کی کوششیں کی گئیں 24 پرگنہ اور میدنا پور اضلاع ان کارروائیوں کے اہم علاقے رہے۔

حقیقتاً بہت تھوڑی مقدار میں نمک بنایا گیا اور اس میں بھی زیادہ تر ضبط کر لیا گیا اور جن برتنوں میں نمک بنایا گیا تھا ان کو مسمار کر دیا گیا۔

پندرہ روزہ رپورٹوں کو غور سے پڑھیے۔ یاد رکھیے کہ یہ اقتباسات نوآبادیاتی شعبہ وزارت داخلہ کی بصیغۂ راز رپورٹوں سے لیے گئے ہیں۔ ان رپورٹوں میں مختلف مقامات سے پولس کے ذریعہ خبر کردہ اطلاعات کو ہمیشہ درست تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

(1) آپ کے خیال میں یہ رپورٹیں کیا کہتی ہیں۔ اس سے ماخذوں کی نوعیت کس حد تک متاثر ہوتی ہے؟ مذکور بالا متون سے عبارت کے حوالے کے ساتھ اپنے دلائل کو مثالوں کے ساتھ مختصراً لکھیے۔

(2) آپ کیوں سوچتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے امکان کے متعلق لوگ کیا سوچتے تھے جس کے ضمن میں شعبہ وزارت داخلہ مستقل اطلاعات دے رہا تھا؟ 5 اپریل 1930 کو ڈانڈی میں اپنی گرفتاری کے سوال کے بارے میں گاندھی جی نے تقریر میں کیا کہا تھا، اس کو دوبارہ پڑھیے۔

(3) آپ کے خیال میں مہاتما گاندھی کو گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟

(4) آپ کے خیال میں شعبہ وزارت داخلہ مستقل یہ کیوں کہتا رہا کہ ڈانڈی مارچ کے تئیں لوگوں کا کوئی جوابی ردعمل سامنے نہیں آیا۔
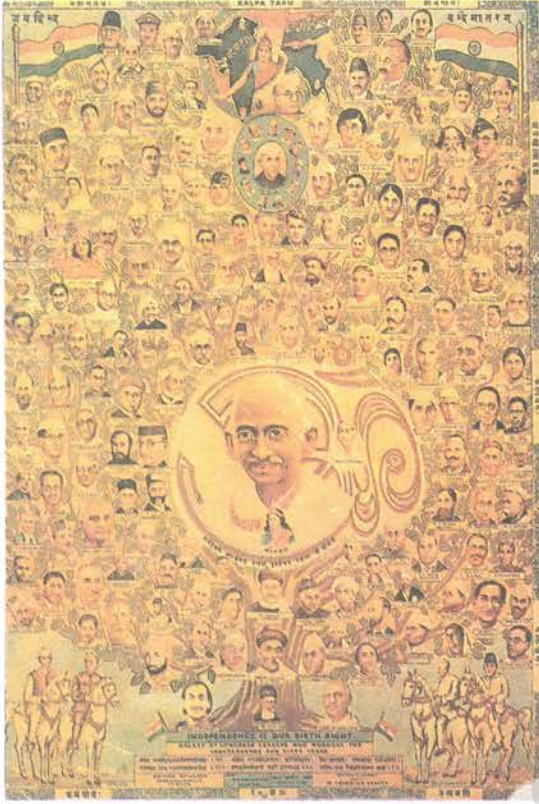
مارچ کو ایک ڈرامہ، ایک مضحکہ خیز قدم برطانوی حکومت کے خلاف ان لوگوں کی لام بندی کے لیے قانون شکن کوشش جو لوگ واقعتاً برطانوی حکومت کے خلاف، آواز اٹھانے کے لیے رضامند تھے اور جو اپنے روزانہ کے لائحہ عمل کے ساتھ مصروف کار، برطانوی راج کے تحت خوش تھے۔

شکل 13.17
اس طرح کی تصاویر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کے تئیں لوگوں کی فکر تھی اور مقبول عام تصاویر میں اس کی کس طرح ترجمانی کرتے تھے۔
قوم پرستی کے درخت کے اندر مہاتما گاندھی مرکزی شبیہہ کے طور پر نظر آرہے ہیں جن کے چاروں طرف دیگر لیڈران اور دانا لوگوں کی چھوٹی چھوٹی تصاویر ہیں۔

6.4 اخبارات سے (From newspapers)

انگریزی اور مختلف ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والے ہم عصر اخبارات بھی ایک نہایت اہم ماخذ ہیں جو مہاتما گاندھی کی حرکات کا سراغ لگاتے اور ان کی سرگرمیوں کی خبریں شائع کرتے تھے یہ اخبارات اس بات کی بھی نمائندگی کرتے ہیں کہ عام ہندوستانی ان کے متعلق کیا سوچتے تھے اور تاہم اخبارات کے بیانات کو غیر متعصبانہ طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ اخبارات ایسے افراد کے ذریعہ شائع ہو رہے تھے جو اپنی سیاسی آراء اور دنیاوی نظریات رکھتے تھے۔ ان خیالات سے یہ متعین ہوتا تھا کہ کیا شائع کیا جائے اور واقعات کی خبر کس طرح دی جائے۔ اس لیے لندن کے اخبار میں شائع بیانات ہندوستانی قوم پرست اخبار میں شائع خبر سے مختلف ہی ہوں گے۔

ہمیں ان رپورٹوں کے دیکھنے کی ضرورت تو ہے لیکن اس کی ترجمانی کرتے وقت ہمیں کافی محتاط ہونا ہوگا۔ ان میں شائع ہر بیان کو، سیاسی میدان میں کیا واقع ہوا تھا اس کی نمائندگی کے طور پر لفظ بہ لفظ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر ان میں ایسے افسران کے خوف اور بے چینیاں منعکس ہوتی ہیں جو تحریک کو کنٹرول کرنے میں نااہل تھے اور اس تحریک کے پھیلنے کے متعلق مضطرب تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ مہاتما گاندھی کو گرفتار کرنا چاہیے یا نہیں یا گرفتار کرنے کے کیا معنی ہوں گے۔ نو آبادیاتی حکومت عوام اور اس کی سرگرمیوں پر جتنی زیادہ نظر رکھتی تھی اپنی حکومت کی اساس کے متعلق اس کی فکر مندی اور بڑھ جاتی تھی۔

ٹائم لائن

1915	گاندھی جی کی جنوبی افریقہ سے واپسی
1917	چمپارن تحریک
1918	کھیڑا (گجرات) میں کسانوں کی تحریکیں، اور احمد آباد میں کامگاروں کی تحریک
1919	رولٹ ستیہ گرہ (مارچ-اپریل)
1919	جلیانوالہ باغ قتل عام (اپریل)
1921	عدم تعاون تحریک اور خلافت تحریک
1928	باردولی میں کسان تحریک
1929	کانگریس کے لاہور اجلاس (دسمبر) میں پورن سوراج (مکمل سوراج) کے ہدف کی قرارداد کو قبول کرنا
1930	سول نافرمانی تحریک کی شروعات: ڈانڈی مارچ (مارچ-اپریل)
1931	گاندھی اروِن سمجھوتہ (مارچ): دوسری گول میز کانفرنس (دسمبر)
1931	گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں کسی قدر نمائندہ حکومت کی تشکیل کا وعدہ
1939	کانگریس وزارت کا استعفیٰ
1942	ہندستان چھوڑو تحریک کا آغاز (اگست)
1946	گاندھی جی کا فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے کے لیے نوا کھالی اور دیگر فساد زدہ علاقوں کا دورہ

100 سے 150 لفظوں میں جواب دیجیے

1۔ گاندھی جی نے عام لوگوں کے ساتھ خود کو مماثل قرار دینے کی کوشش کس طرح کی؟
2۔ کسان گاندھی جی کو کس طرح دیکھتے تھے؟
3۔ نمک قانون جدوجہد آزادی کا ایک اہم مسئلہ کیوں بن گیا؟
4۔ قومی تحریک کے مطالعہ کے لیے اخبارات ایک اہم ماخذ کیوں ہیں؟
5۔ چرخہ کو قوم پرستی کی علامت کے طور پر کیوں منتخب کیا گیا؟

مندرجہ ذیل پر ایک مختصر مضمون (250 سے 300 الفاظ پر مشتمل) لکھیے

6۔ عدم تعاون (تحریک) احتجاج کی ایک شکل کس طرح تھا؟
7۔ گول میز کانفرنس کی بات چیت بے نتیجہ کیوں ثابت ہوئی؟

8۔ گاندھی جی نے قومی تحریک کی نوعیت کو کس طرح بدل دیا؟ یہ ماخذ سرکاری ماخذات سے کس طرح مختلف ہوتے ہیں؟

نقشہ کا کام

10۔ ڈانڈی مارچ کے راستہ کو تلاش کیجیے۔ گجرات کے نقشے پر اس مارچ کے راستے کو بنائیے یہاں واقع بڑے قصبات اور گاؤں کو نشان زد کیجیے۔

پروجیکٹ (کوئی ایک)

11۔ قوم پرست لیڈروں میں سے کس بھی دو کی خودنوشت سوانح عمریوں کو پڑھیے۔ اور دیکھیے کہ ان میں مصنفین نے اپنی زندگی اور عہد کو کن مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے اور قومی تحریک کی ترجمانی کی ہے۔ دیکھیے کس طرح ان کے خیالات مختلف ہیں۔ اپنے مطالعے کی بنیاد پر ایک بیان قلمبند کیجیے۔

12۔ قومی تحریک کے دوران واقع کسی واقعہ کا انتخاب کیجیے۔ اس کے ضمن میں اس زمانے کے لیڈران کے خطوط اور تقاریر کو حاصل کیجیے اور پڑھیے۔ ان میں سے کچھ اب شائع ہو چکی ہیں۔ جس جگہ آپ رہتے ہیں وہ اس علاقہ کا مقامی لیڈر بھی ہو سکتا ہے۔ کوشش کیجیے اور دیکھیے کہ کس طرح مقامی لیڈران اعلیٰ سطح پر قومی قیادت کی سرگرمیوں کو دیکھتے تھے۔ اپنے مطالعے کی بنیاد پر تحریک کے متعلق لکھیے۔

مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

شیکھر بندھو یادھیائے۔ 2004
فرام پلاسی ٹو پارٹیشن: اے ہسٹری آف ماڈرن انڈیا،
اورینٹ لونگ مین۔ نئی دہلی

سروپلی گوپال، 1975
جواہرلعل نہرو: اے بائیو گرافی۔
جلد اول، 1947–1889
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی

ڈیوڈ ہارڈی مان، 2003
گاندھی ان ہنر ٹائم اینڈ اورس،
پرمانینٹ بلیک، نئی دہلی

گیانیندر پانڈے، 1978
دی اسکینڈینسی آف دی کانگریس ان اتر پردیش، 34-1942
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی

سمیت سرکار، 1983
ماڈرن انڈیا 1947–1885
میک ملن، نئی دہلی

آپ مندرجہ ذیل ویب سائٹ پر رابطہ قائم کر سکتے ہیں:

http:/www.gandhiseve.org/cwmgcwmg.html
(کلیکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی کے لیے)

تقسیم کی فہم
سیاست، یادداشتیں، تجربات

شکل 14.1

ملک کی تقسیم کی وجہ سے لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے ،اور پناہ گزیں کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ان کو ایک نئے ملک میں نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

ہم جانتے ہیں کہ 1947 میں نوآبادیاتی حکمرانی سے ہمارے ملک کی آزادی کی خوشی تقسیم ملک کی بربریت اور تشدد سے بے رونق ہوگئی۔ برطانوی ہندوستان کی دوخودمختار ریاستوں ہندوستان اور پاکستان (مع اپنے مغربی اور مشرقی حصے) میں تقسیم نازک حالات کا سبب بنی۔ ہزاروں زندگیوں کا خاتمہ ہوگیااور بہت سی دیگر ڈرامائی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔شہر بدل گئے۔ ہندوستان تبدیل ہوگیا، ایک نیا ملک وجود میں آیا اور نسل کشی پر مبنی تشدد اور ہجرت کے ایسے واقعات وقوع پذیر ہوئے جس کی اس سے قبل کوئی مثال نہ تھی۔

شکل 14.2
یہ فوٹو گراف اس زمانے کے تشدد کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔

یہ باب تقسیم ملک کی تاریخ کی جانچ کرے گا کہ یہ کیوں اور کس طرح واقع ہوئی علاوہ ازیں، 50-1946 کے دوران اور اس کے بعد بھی عام لوگوں کی سخت پریشانی وتکالیف کے تجربات کس طرح کے تھے۔ ساتھ ہی اس باب میں یہ بحث بھی ہوگی کہ لوگوں سے بات چیت اور انٹرویو کے ذریعہ یعنی زبانی تاریخ کا استعمال کرتے ہوئے ان کے تجربات کی تاریخ کی کیسے تعمیر نو کی جاسکتی ہے۔ یہ باب بیک وقت زبانی تاریخ کی اہم خصوصیات اور محدودات کی نشاندہی کرے گا۔ انٹرویو سے ہم سماج کے ماضی کے یقینی پہلوؤں کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہیں جن کے متعلق دوسرے قسم کے ماخذوں سے ہمیں تھوڑی بہت معلومات مل پاتی ہیں یا بالکل نہیں مل پاتیں۔ کئی معاملات کے متعلق یہ انٹرویوز زیادہ کچھ آشکارا نہیں کر پاتے جن معاملات کی تاریخ کی تعمیر کے متعلق بعد میں ہمیں دیگر ماخذوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس مسئلے پر ہم اس باب کے آخر میں رجوع کریں گے۔

1. تقسیم کے چند تجربات (SOME PARTITION EXPERIENCES)

یہاں تین واقعات پیش کیے جارہے ہیں جن کو 1993 میں ایک محقق کے سامنے ان لوگوں نے بیان کیا تھا جن کا ان پریشانیوں سے عملی سابقہ پڑا تھا۔ یہ اطلاعات دینے والے پاکستانی ہیں اور محقق ہندوستانی۔ اس محقق کا کام اس بات کی تفہیم کرنا تھا کہ جو لوگ کئی نسلوں سے کم وبیش ہم آہنگی کے ساتھ رہتے تھے آخر انھوں نے ایک دوسرے پر تشدد کیسے مسلط کر دیا۔

ماخذ 1

"میں تو صرف اپنے والد پر واجب الادا قرض واپس کر رہا ہوں"
("I am simply returning my father's karz, his debt")

محقق نے یہ اس طرح قلمبند کیا ہے:

1992 کے موسم سرما میں، پنجاب یونیورسٹی لاہور کی شعبہ تاریخ کی لائبریری کے میرے دورے کے دوران، وہاں کے لائبریرین عبداللطیف صاحب جو ایک ادھیڑ عمر متقی و پرہیزگار شخص تھے میری بہت مدد کیا کرتے تھے۔ اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے اور اس سے کہیں آگے جا کر وہ مجھے متعلقہ مواد مہیا کراتے تھے۔ میری فرمائش کی ہوئی فوٹو کاپیاں اگلی صبح میرے پہنچنے سے قبل حد سے زیادہ احتیاط کے ساتھ تیار رکھتے تھے۔ میرے کام کے تئیں ان کا رویہ اپنے لیے میں نے نہایت غیر معمولی پایا کہ ایک دن میں خود کو روک نہ سکا اور پوچھ ہی لیا۔ لطیف صاحب، آپ غیر معمولی طریقے سے میری اتنی زیادہ کیوں مدد کرتے ہیں؟ لطیف صاحب نے ایک نظر اپنی گھڑی پر ڈالی، اچانک جھپٹ کر اپنی نمازی

ٹوپی اٹھائی اور کہا" ابھی تو فوراً میں نماز کے لیے جا رہا ہوں لیکن میں واپسی پر آپ کو اس سوال کا جواب ضرور دوں گا" آدھے گھنٹے بعد اپنے دفتر پہنچتے ہی انھوں نے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھا۔

ہاں، آپ کا سوال، میں........ میرا مطلب ہے، میرے والد جموں سے تعلق رکھتے تھے۔ جموں ضلع میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے ۔ یہ ایک ہندو غلبہ والا گاؤں تھا اور اگست 1947 میں علاقے کے ہندو غنڈوں نے اس چھوٹے سے گاؤں کی مسلم آبادی کا قتل عام کر دیا۔ ایک دن آخر سہ پہر جب ہندوؤں کی بھیڑ بدترین غصے میں بھری ہوئی تھی تو میرے والد کو پتہ چلا کہ وہ شاید گاؤں کے صرف اکیلے مسلم نوجوان ہیں جو زندہ بچے ہیں۔ وہ اپنے پورے خاندان کو اس خونریزی میں پہلے ہی کھو چکے تھے اور بھاگنے کے راستے تلاش کر رہے تھے۔ انھیں ایک رحم دل ہندو پڑوسی عورت یاد آئی، انھوں نے اپنی پڑوسن بزرگ سے اپنے گھر میں پناہ دینے کی عاجزانہ استدعا کی۔ وہ خاتون والد صاحب کی مدد کرنے کے لیے راضی ہوگئیں لیکن انھوں نے کہا" بیٹا اگر تم یہاں چھپتے ہو تو وہ ہم دونوں کو پکڑ لیں گے۔ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ تم میرے پیچھے اس جگہ تک چلو جہاں ان لوگوں نے مردہ لوگوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے۔ تم وہاں مردہ شخص جیسے بن کر لیٹ جانا اور میں تم پر کچھ لاشیں ڈال دوں گی۔ بیٹا وہاں لاشوں کے درمیان ساری رات اسی طرح لیٹے رہنا اور کل صبح ہوتے ہی اپنی زندگی بچانے کے لیے سیالکوٹ کی طرف دوڑ جانا۔

"میرے والد اس تجویز پر راضی ہوگئے۔ پھر وہ دونوں اس جگہ تک گئے، والد صاحب زمین پر لیٹ گئے اور ضعیف عورت نے کئی لاشیں ان کے اوپر ڈال دیں۔ گھنٹہ بھر بعد مسلم ہندو چوروں کا ایک گروپ وہاں نمودار ہوا۔ ان میں سے ایک چیخ اٹھا۔ کسی میں کچھ جان باقی ہے؟ اور دیگر افراد اپنی گندی لاٹھیوں اور بندوقوں کے ساتھ اس انبار میں زندگی کے آثار تلاش کرنے لگے۔ کوئی شخص چلایا" اس لاش کی کلائی پر گھڑی موجود ہے! اپنی رائفل کا کندہ اس نے میرے والد کی انگلیوں پر زور سے مارا۔ والد صاحب عموماً ہمیں بتایا کرتے تھے کہ گھڑی والی کلائی کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کو بغیر ہلائے رکھنا ان کے لیے کتنا مشکل کام تھا پھر بھی وہ قطعاً بے حرکت پڑے رہے۔ کسی طرح وہ چند سیکنڈ کے لیے ایسا کرنے میں کامیاب رہے اسی وقت ان میں سے ایک شخص بولا" ارے یہ صرف ایک گھڑی ہی تو ہے، چلو یہاں سے چلتے ہیں، اندھیرا ہونے لگا ہے۔ اباجی کی یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ لوگ چلے گئے اور میرے والد پوری رات وہاں نحوست زدہ ماحول میں لیٹے رہے، صبح کی سپیدی کا خفیف سا اشارہ پا کر بلا مبالغہ اپنی زندگی (بچانے) کے لیے دوڑ پڑے۔ وہ سیالکوٹ پہنچنے تک واقعتاً کہیں نہیں رکے تھے۔

"میں آپ کی مدد کرتا ہوں کیونکہ اس ہندوستانی نے میرے والد کی مدد کی تھی۔ میں تو صرف اپنے والد پر واجب الادا قرض واپس کر رہا ہوں"

لیکن میں ہندو نہیں ہوں" میں نے کہا" میرا تعلق ایک سکھ خاندان سے ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک مخلوط ہندو۔ سکھ خاندان سے"

میں یقین کے ساتھ نہیں جانتا کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔ آپ بغیر کٹے بال (کیش) بھی رکھتے ہیں اور آپ مسلمان بھی نہیں ہیں۔ لہذا میرے لیے تو آپ ایک ہندو ہیں اور میں جو تھوڑا بہت آپ کے لیے کرتا ہوں اس وجہ سے کرتا ہوں کیونکہ ایک ہندو مائی نے میرے والد کی جان بچائی تھی۔"

ماخذ 2

''خاصا بڑا عرصہ ہوا، میں کسی پنجابی مسلمان سے نہیں ملا'' ("For quite a few years now, I have not met a Punjabi Musalman")

محقق کی دوسری کہانی لاہور میں واقع ایک یوتھ ہاسٹل کے منیجر کے متعلق ہے:

میں جائے اقامت کی تلاش کے لیے ہاسٹل گیا تھا اور فوراً ہی اپنی شہریت کا اعلان کر دیا۔ منیجر نے کہا '' آپ ہندوستانی ہیں لہٰذا میں آپ کو کمرہ الاٹ (تفویض) نہیں کر سکتا لیکن میں آپ کو چائے پلا سکتا ہوں اور ایک کہانی سنا سکتا ہوں۔ میں اس پیش کش کو مسترد نہیں کر سکتا تھا'' منیجر نے کہنا شروع کیا '1950' کی دہائی کی ابتدا میں میں دہلی میں تعینات تھا، میں پوری توجہ سے سن رہا تھا۔''

میں وہاں پاکستانی ہائی کمیشن میں ایک کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور میرے ایک لاہوری دوست نے یہ کہتے ہوئے مجھے ایک رقعہ دیا تھا کہ یہ، اس کے سابقہ پڑوسی (لاہور میں) جو اب پہاڑ گنج، نئی دہلی میں رہتے ہیں، ان کو پہنچا دوں، ایک دن اپنی سائیکل لے کر پہاڑ گنج کی طرف چلا اور جیسے ہی میں نے سینٹرل سیکریٹریٹ کے سامنے والے کتھیڈرل (گرجا گھر) کو عبور کیا مجھے ایک سائیکل سوار سکھ نظر آیا۔ میں نے پنجابی میں اس سے پوچھا، سردا جی، پہاڑ گنج کی طرف جانے والا راستہ کدھر سے ہے۔

''کیا آپ پناہ گزیں (رفیوجی) ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں لاہور سے آیا ہوں، میں اقبال احمد ہوں''۔

''اقبال احمد..........لاہور سے؟ ٹھہرو!

''وہ ٹھہرو'' کی آواز مجھے ایک بے رحم حکم کی طرح لگی اور میں نے فوراً ہی سوچا کہ اب تو میں گیا۔ یہ سکھ مجھ کو ختم کر دے گا۔ لیکن اس موقع پر راہ فرار نہ تھی چنانچہ میں رک گیا۔ وہ ہٹا کٹا سکھ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا اور اس نے کس کر گرمجوشی کے ساتھ چھاتی سے لگا لیا۔ بھیگی آنکھوں سے اس نے کہا '' خاصا بڑا عرصہ ہوا۔ میں کسی پنجابی مسلمان سے نہیں ملا۔ میں کسی (پنجابی مسلمان) سے ملنے کا آرزومند تھا لیکن تم کو یہاں پنجابی بولنے والے مسلمان نہیں ملیں گے۔''

شکل 14.3

ایک کروڑ سے زائد افراد اپنے مادر وطن سے بے گھر ہو گئے اور ہجرت کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔

ماخذ 3

’’نہیں، نہیں! تم کبھی ہمارے نہیں ہو سکتے‘‘
("No, no! You can never be ours")

محقق سے وابستہ تیسری کہانی اس طرح ہے:

1992 میں لاہور میں ہونے والی ایک شخص سے ملاقات ابھی تک وضاحت سے میرے حافظے میں موجود ہے۔ وہ غلطی سے مجھے غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والا ایک طالب علم سمجھ بیٹھا، نہ جانے کسی سبب وہ مجھے پسند کرنے لگا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قوم کی خدمت کرنے کے لیے میں وطن واپس لوٹ آؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں ایسا کروں گا لیکن بات چیت کے دور میں، میں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا کہ میری شہریت دراصل ہندوستانی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا لہجہ بدل گیا اور خود پر قابو پاتے پاتے بھی اس کے منہ سے بے دھڑک نکلا۔

’’اف، ہندوستانی! میں سمجھا تھا کہ تم پاکستانی ہو‘‘۔ میں نے اسے متاثر کرنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ میں خود کو ہمیشہ جنوب ایشیائی سمجھتا ہوں۔ ’’نہیں، نہیں! تم کبھی بھی ہمارے نہیں ہو سکتے۔ تمھارے لوگوں نے 1947 میں میرے پورے گاؤں کو صاف کر دیا تھا، ہم کٹر دشمن ہیں اور ہمیشہ رہیں گے‘‘۔

(1) ہر ایک ماخذ، آپس میں بات چیت کرنے ولے افراد کے دورویوں کے متعلق کیا ظاہر کرتے ہیں!
(2) آپ کے خیال میں، یہ کہانیاں ان لوگوں کی تقسیم ہند سے وابستہ مختلف یادوں کے متعلق کیا آشکارا کرتی ہیں؟
(3) ان افراد نے خود کو اور ایک دوسرے کی کس طرح شناخت کی؟

بحث کیجیے

تقسیم سے متعلق لکھنے میں اس طرح کی کہانیوں کی قدر و قیمت کی تشخیص کیجیے۔
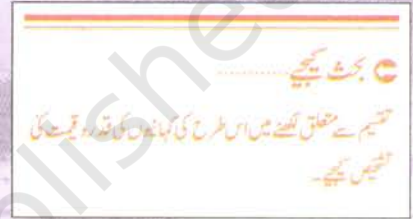
2. عظیم یادگار علامت
(A MOMENTOUS MARKER)

2.1 تقسیم یا قتل عام؟ (Partition or holocaust?)

ابھی پیش کی گئی حکایات سے جاری تشدد جو تقسیم کے کردار کی خصوصیت ہے امتیاز کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہزار ہا افراد مارے گئے اور لاتعداد عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر ہوا اور ان کو اغوا کیا گیا۔ کروڑوں افراد اجڑ گئے اور اجنبی زمین میں پناہ گزیں بن گئے۔ انسانی اموات کے بالکل صحیح تخمینے تک پہنچنا ناممکن کام ہے معلومات اور فاضلانہ اندازے کے مطابق اس سانحہ میں مرنے والوں کی تعداد 2,00,000 سے 5,00,000 تک رہی ہے۔ تمام امکانات کے مدنظر تقریباً ڈیڑھ کروڑ افراد کو عجلت میں تعمیر ہندوستان اور پاکستان کو علاحدہ کرنے والی سرحد کے اس جانب یا اس جانب آنا جانا پڑا۔ جوں ہی وہ لوگ اس ’’خط آثار‘‘ (Shadow lines) رسمی آزادی کے دو دن بعد تک بھی ان دونئی ریاستوں کے درمیان سرحد باضابطہ سرکاری طور پر بھی کوئی علم نہ تھا، دوچار ہوئے، وہ بے گھر ہو گئے۔ اچانک اپنی تمام غیر منقولہ اثاثہ جات اور منقولہ اثاثے انھوں نے کھو دیے، اپنے بہت سے عزیز و اقارب سے جدا ہو گئے، اپنی جڑوں، مکانوں، کھیتوں

شکل 14.4
بیل گاڑی پر اپنے خاندان اور سامان کے ساتھ، 1947

اور خوش نصیبی (دولت وثروت) نیز اپنی بچپن کی یادوں سے زبردستی محروم کر دیا گیا۔ اس طرح اپنی مقامی یا علاقائی تہذیب سے بھی وہ دور ہو گئے۔ وہ لوگ اپنی زندگی شروع کرنے کے لیے کسی مدد کے بغیر دانہ دانہ چگنے کے لیے مجبور تھے۔

کیا یہ صرف ایک کم وبیش منظم آئینی تصفیہ، ایک رضامندی کی بنیاد پر علاقوں اور اثاثوں کی تقسیم تھی یا اسے سولہ ماہ کی خانہ جنگی کہا جائے یا اسے دونوں طرح کی نہایت منظم طاقتوں کے ذریعہ پوری کی پوری آبادیوں کو ایک دشمن کے طور پر صفایا کرنے کے لیے حقیقی کوشش تسلیم کی جائے؟ زندہ بچ جانے والے افراد خود 1947 کو اکثر دیگر الفاظ ''ماشل لا'' (مارشل لا) ''مارا ماری'' اور ''رولا'' یا ''ہلٹر'' (ہنگامہ) وغیرہ کرتے ہیں۔ تقسیم کے زمانے میں ہونے والے قتل، زنا بالجبر، آتش زنی اور لوٹ مار کے متعلق بات کرتے ہوئے ہم عصر مشاہدین اور دانشوروں نے گاہے گاہے ''مرگ انبوہ''، قتل عام (Holocaust) کی تعبیر استعمال کی ہے نیز اس کے بنیادی معنی تباہی وبربادی یا اجتماعی پیمانے پر قتل عام کے لیے ہیں۔

کیا الفاظ کا یہ استعمال موزوں ہے؟

آپ نے نویں جماعت میں جرمن ہولوکاسٹ (قتل عام) کے متعلق پڑھا ہوگا۔ 1947 میں

برصغیر میں جو کچھ واقع ہوا اس کی شدت کا شعور وادراک، اصطلاح ''مرگ انبوہ''(Holocaust) سے کیا جا سکتا ہے۔ ''تقسیم یا بٹوارہ'' کسی قدر نرم اصطلاح ہے جس سے یہ تباہی و بربادی او جھل رہتی ہے۔ اس سے یہ بھی مرتکز کرنے میں مدد ملتی ہے کہ جرمنی کے مرگ انبوہ(Holocaust) کی طرح ہمارے، ہم عصر اندیشوں میں تقسیم کو اتنا زیادہ منسوب اور یاد کیوں کیا جاتا ہے۔ تاہم ان دونوں واقعات کے درمیان فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ 48-1947 میں برصغیر ہندو پاک میں قلع قمع کرنے کی کسی سرکاری مہم کی کوئی شہادت نہیں ہے جیسا کہ نازی جرمنی کے معاملے میں جہاں لوگوں کا قلع قمع کرنے کے لیے کنٹرول اور تنظیم کی مختلف جدید تکنیکوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے کردار کی خصوصیت ''نسلی صفایا'' تھی جو سرکاری اداروں کے بجائے مذہبی فرقوں کے خود ساختہ نمائندوں کے ذریعہ انجام دیا گیا تھا۔

2.2 دقیانوسی طرز کی طاقت (The power of stereotypes)

پاکستان میں ہندوستان سے متنفر اور ہندوستان میں پاکستان سے متنفر افراد، دونوں ہند کی پیداوار ہیں۔ گاہے گاہے کچھ لوگ غلط فہمی کی بنا پر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی وفاداریاں پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کے یہ دقیانوسی انداز، مسلمانوں کے ملک کے باہر اتحاد اسلامی کی وفاداریوں کے ساتھ دیگر انتہائی قابل اعتراض خیالات سے مل جاتے ہیں جیسے مسلمانوں کی ملک کے باہر اتحاد اسلامی کی وفاداریوں کے ساتھ دیگر انتہائی قابل اعتراض خیالات، مسلمان ظالم و بے رحم کٹر اور گندے ہوتے ہیں اور وہ حملہ آوروں کی اولاد ہیں جبکہ ہندو رحم دل، بے تعصب، روادار اور خالص (صحیح النسل) ہیں اور جن پر حملہ کیا گیا ان کی اولاد ہیں۔ صحافی آر۔ ایم۔ مرفی نے اپنے مطالعہ میں ثابت کیا ہے کہ پاکستان میں بھی اسی طرح کی دقیانوسی انداز کی فرائش کی کمی نہیں۔ ان کے مطابق بعض پاکستانی محسوس کرتے ہیں کہ مسلمان منصفانہ، بہادر، موحد (توحید پرست) اور گوشت خور ہوتے ہیں۔ جب کہ ہندو کالے، بزدل، مشرک اور سبزی خور ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض دقیانوسی انداز تقسیم سے قبل کا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ 1947 کی وجہ سے انھیں کافی تقویت ملی۔ مؤرخین کے ذریعہ ان تعبیرات میں پوشیدہ تصور کی مسلسل تنقید کی گئی ہے لیکن یہ دونوں ہی ملکوں میں نفرت کی آواز کو مدھم نہیں کر پائے۔

ملک کی تقسیم نے کچھ ایسی یادیں، نفرتیں، دقیانوسی انداز اور شناخت تخلیق کر دی ہیں جو ابھی تک سرحد کے دونوں طرف کی عوامی تاریخ کی تشکیل کر رہی ہیں۔ یہ نفرتیں مختلف فرقوں کے مشترک تنازعات کے دوران صاف ظاہر ہوتی ہیں اور فرقہ وارانہ ٹکراؤ نے ماضی کے ان تشدد کی یادوں کو زندہ رکھا ہے۔ تقسیم ملک کے تشدد کی کہانیوں کو فرقہ وارانہ گروہ مختلف فرقوں کے بیچ فرق کو

بحث کیجیے

اگر آپ نے تقسیم ملک سے متعلق کچھ کہانیاں سنی ہیں تو انھیں یاد کیجیے اور غور کیجیے کہ مختلف فرقوں کے متعلق آپ کا تصور کس انداز میں بنا۔ کوشش اور تصور کیجیے کہ مختلف فرقوں کے لوگ ایک ہی کہانی کو کس طرح بیان کریں گے۔

اور گہرا کرنے کے لیے، بار بار دہراتے تھے، لوگوں کے ذہنوں میں شک وشبہ اور بے اعتمادی کے جذبات پیدا کرتی ہیں، فرقہ واری دقیانوسی انداز کو مستحکم کرتی ہیں، گہرے طور پر غیریقینی اس خیال کو کہ ہندو، مسلمان اور سکھ، واضح معین سرحدوں کے ساتھ الگ الگ مذہبی فرقے ہیں اور جن کے مفادات بنیادی طور پر ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے رشتے تقسیم ملک کی اس وراثت سے گہرے طور پر تشکیل ہوتے ہیں۔ دونوں طرف کے فرقوں کے تصورات ان یادگار اوقات کی متنازعہ یادوں کے ذریعہ تشکیل پاتے ہیں۔

شکل 14.5
لوگ اپنے ساتھ وہی سامان لے کر چلے جس کو وہ اٹھا کر لے جاسکتے تھے۔
اجڑنے کا مطلب ایک گہرے شعور وادراک کا نقصان تھا۔ جہاں وہ نسلوں سے مقیم تھے، اس کے ساتھ ان کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔

3. ملک کی تقسیم کیوں اور کس طرح واقع ہوئی؟ (Why and How Did Partition Happen?)

3.1 ایک طویل تاریخ کا نقطہ معراج؟ (Culminating point of a long history?)

بعض مؤرخین (ہندوستانی اور پاکستانی) دونوں یہ تجویز کرتے ہیں کہ محمد علی جناح کا یہ نظریہ کہ نوآبادیاتی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ ملتیں ہیں، اس کا عکس عہد وسطی کی تاریخ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ مؤرخین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ 1947 کے واقعات کا پورے عہد وسطی

اور دورِ جدید میں تنازعات کی طویل تاریخ سے گہرا ربط تھا۔ایسی کوئی دلیل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ فرقوں کے درمیان تنازعات کی تاریخ پر امن بقائے باہمی کے ساتھ شراکت داری اور باہمی ثقافتی لین دین کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ بدلتی صورت حال لوگوں کی سوچ کو تشکیل دیتی ہے۔

بعض دانشور تقسیم ملک کو فرقہ وارانہ سیاست کے انجام کے طور پر دیکھتے ہیں جو بیسویں صدی کے اولین دہائیوں میں ارتقاپذیر ہونی شروع ہوئی تھی۔وہ تجویز کرتے ہیں کہ 1909 میں نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ مسلمانوں کے لیے بنائے گئے جداگانہ انتخابی حلقوں نے جن کی مزید توسیع 1919 میں کی گئی،فرقہ وارانہ سیاست کی نوعیت کو فیصلہ کن شکل دی،جداگانہ انتخابی حلقوں کا مطلب تھا کہ اب مسلمان مقررہ حلقہ رائے دہندگان میں اپنے خود کے نمائندوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔اس نظم نے سیاستدانوں کے لیے تحریص پیدا کی کہ وہ اس نظام میں کام کرتے ہوئے علاحدہ پسند نعروں کا استعمال کریں اور اپنے مذہبی گروہوں کے لیے خاص رعایت تقسیم کرنے کے واسطے لوگوں کو مجتمع کریں۔اس طرح سے حاصل مذہبی شناخت کا جدید سیاسی نظام کے اندر عملی طور پر استعمال ہونے لگا اور انتخابی سیاست کی منطق،ان شناخت کو زیادہ گہرا اور سخت کرنے لگی،مذہبی شناخت کے مدعائے کلام فرقوں کے درمیان سرگرم مخالفت اور دشمنی کے مقصد سے سامنے آئے۔تاہم اس دوران ہندوستانی سیاست پر جداگانہ انتخابی حلقوں کا گہرا اثر پڑا۔ہمیں احتیاط سے کام لیتے ہوئے ان کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی تقسیم ملک کو ان کی کارکردگی کے منطقی نتیجے کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں فرقہ وارانہ شناخت دیگر حالات واسباب کے طفیل بھی مستحکم ہوئی۔1920 اور 1930 کی ابتدائی دہائی کے دوران بہت سے قضیے کی وجہ چاروں عوامل ہو رہے تھے،مسلمانوں کو ''مسجد کے سامنے موسیقی'' گائے تحفظ تحریک اور آریہ سماج کے ذریعہ شدھی یعنی جو لوگ حال میں اسلام میں داخل ہوگئے ہیں ان کو دوبارہ ہندو بنانا جیسی حرکتوں سے غصہ آتا تھا اور ہندو 1923 کے بعد ''تبلیغ'' اور ''تنظیم'' کی وسعت سے غصے میں تھے۔ جوں جوں متوسط طبقے کے پروپیگنڈہ کرنے والے اور فرقہ واری سرگرم کارکن اپنے فرقوں کے اندر لوگوں کو دوسرے فرقوں کے لوگوں کے خلاف منظم کرتے ہوئے، وسیع تر اتحاد استوار کرتے گئے، ویسے ویسے ملک کے مختلف حصوں میں فسادات پھیلتے گئے۔ ہر ایک فرقہ وارانہ فساد نے فرقوں کے درمیان اختلافات گہرے کردیے اور تشدد کی پریشان کن یادیں پیدا ہوتی گئیں۔

تاہم تقسیم ملک کے ضمن میں فرقہ وارانہ فسادات کو راست طور پر بتدریج ظاہر ہونے والے نتیجے کے طور پر دیکھنا بھی صحیح نہیں ہوگا،جیسا کہ تقسیم ملک پر مبنی فلم ''گرم ہوا'' کا ہیرو اپنے مکالمے

لکھنؤ سمجھوتہ (The Lucknow Pact)

دسمبر 1916 کا لکھنؤ سمجھوتہ کانگریس اور مسلم لیگ (اتر پردیش میں قائم ''ینگ پارٹی'' کے ذریعہ کنٹرول) کے درمیان ایک فہم وفراست پر مبنی تھا جس کے ذریعہ کانگریس نے جداگانہ انتخابی حلقوں کو قبول کرلیا تھا۔اس سمجھوتے نے اعتدال پسندوں انتہا پسندوں اور مسلم لیگ کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرلیا تھا۔

آریہ سماج (Arya Samaj)

انیسویں صدی کے آخر اور ابتدائی بیسویں صدی کی ایک شمالی ہندوستانی ہندو اصلاح پسند تنظیم تھی جو خاص طور پر پنجاب میں سرگرم تھی۔یہ ویدک علوم کی تجدید کر کے اس کو سائنس کی جدید تعلیم کے ساتھ ملانا چاہتی تھی۔

''مسجد کے سامنے موسیقی'': کسی مذہبی جلوس کے ذریعہ نماز کے وقت مسجد کے باہر موسیقی کا بجایا جانا، ہندو مسلم تشدد کو بڑھا سکتا تھا۔ راسخ العقیدہ مسلمان اسے اپنی عبادت (خدا کے ساتھ رابطہ) میں ایک طرح کی دخل اندازی کے طور پر دیکھتے تھے۔

کے توسط سے کہتا ہے ''فرقہ وارانہ جھگڑے تو 1947 سے قبل بھی ہوتے تھے لیکن یہ کبھی بھی لاکھوں لوگوں کو ان کے گھروں سے اجاڑنے کا سبب نہیں بنے تھے''، تقسیم ملک پہلے کی فرقہ وارانہ سیاست سے صفاتی طور پر ایک مختلف مظہر تھا اور اس تقسیم کو سمجھنے کے لیے ہمیں برطانوی حکومت کی آخری دہائی کے واقعات کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

فرقہ واریت یا فرقہ پرستی سے کیا مراد ہے؟ (What is communalism?)

ہماری شناخت کے بہت سے پہلو ہیں۔ دوشیزہ ہوں یا نوجوان سب نوجوان لوگ ہیں، آپ قطعی طور پر ہر ایک گاؤں، شہر، ضلع یا ریاست سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک یقینی زبان بولتے ہیں۔ آپ ہندوستانی شہری کے ساتھ ہی عالمی شہری بھی ہیں۔ آمدنی کی سطح ہر ایک خاندان میں مختلف ہوتی ہے، اس بنا پر ہم سب کسی سماجی طبقے یا دیگر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر افراد کا کوئی ایک مذہب ہے اور ہماری زندگی میں ''ذات پات'' ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہماری شناخت کی بہت سی خصوصیات ہیں اور وہ پیچیدہ بھی ہیں تاہم مخصوص مواقع پر لوگ اپنی شناخت کے یقینی انتخاب شدہ پہلوؤں جیسے مذہب کو زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔ اسے فرقہ واریت کے طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔

فرقہ واریت کو اس سیاست سے منسوب کیا جاتا ہے جو ایک مذہبی شناخت کے اطراف دوسرے فرقہ کی مخالفت میں دشمنی کے لیے متحد ہونا چاہتی ہے۔ یہ مذہبی فرقہ پر مبنی شناخت کو بنیادی اور معین ومنجمد کرنے کے لیے کوشش کرتی ہے۔ یہ اس شناخت کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے فطری طور پر پیش کرتے ہیں، جیسے بالفرض لوگ ایسی شناخت میں پیدا ہوئے ہوں اور جو تاریخ کے مقررہ وقت کے علاوہ گزرتے ہوئے تدریجا بڑھتی نہیں۔ فرقہ واریت کسی بھی فرقہ میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے اس کے اندرونی امتیازات کو دباتی ہے اور دیگر فرقے کے خلاف اپنے فرقے کے ناگزیر اتحاد پر زور دیتی ہے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرقہ واریت ایک شناخت شدہ ''دیگر'' کے لیے نفرت کی سیاست کی پرورش کرتی ہے جیسے مسلم فرقہ واریت کے معاملے میں ہندو ''دیگر'' ہندو فرقہ واریت کے معاملے میں مسلمان ''دیگر'' ہیں یہ تشدد کی سیاست نفرت کو غذا پہنچاتی ہے۔ اس صورت میں فرقہ واریت مذہبی شناخت کی سیاست کاری کی ایک خاص قسم ہے۔

ایک ایسا نظریہ جو مذہبی فرقوں کے درمیان تنازعات کو فروغ دیتا ہے۔ کثیر مذہبی ملک کے تناظر میں ''مذہبی قوم پرستی'' کا محاورہ مماثل معنی حاصل کے لیے لایا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے ملک میں کوئی شخص مذہبی فرقہ کو ایک ملت کے طور پر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ بعض دیگر مذاہب کے خلاف عملی مخالفت کے بیج بو رہا ہے۔ محمد علی جناح برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک ملک یا قوم کی طرح دیکھتے تھے اور متمنی تھے کہ مسلمان خود اپنے لیے ایک قومی ریاست حاصل کرلیں۔

3.2 1937 کے صوبائی انتخابات اور کانگریس وزارتیں (The provincial elections of 1937 and the Congress ministries)

پہلی دفعہ 1937 میں صوبائی قانون ساز اداروں کے لیے انتخابات منعقد ہوئے جس کل آبادی کے صرف 10 سے 12 فی صد کے قریب لوگ ہی رائے دہی کے حق سے لطف اندوز ہوسکتے

تھے۔ اس الیکشن میں کانگریس نے عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مکمل اکثریت سے جیت درج کی۔ پھر ان میں سے سات صوبوں میں اپنی حکومت تشکیل دی۔ مسلمانوں کے لیے محفوظ انتخابی حلقوں میں کانگریس کی کارکردگی خراب رہی لیکن مسلم لیگ نے بھی ان حلقوں میں نہایت خراب کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس الیکشن میں ڈالے گئے کل مسلم ووٹوں کا صرف 4.4 فی صد ووٹ ہی مسلم لیگ حاصل کر سکی، شمال مغربی سرحدی صوبے میں کوئی ایک بھی سیٹ جیتنے میں مسلم لیگ ناکام رہی اور پنجاب میں 84 محفوظ انتخابی حلقوں میں سے وہ صرف دو پر قبضہ کر سکی اور سندھ میں 33 میں سے صرف تین ہی سیٹ اس کو مل سکی۔

متحدہ صوبہ جات میں مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر حکومت تشکیل دینا چاہتی تھی، چونکہ کانگریس نے اس صوبہ میں مکمل اکثریت سے فتح حاصل کی تھی اس لیے اس نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ بعض دانشوروں کی دلیل ہے کہ اس پیشکش کے ٹھکرائے جانے کے بعد مسلم لیگ کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر ہندوستان متحد بنا رہا تو مسلمانوں کے لیے سیاسی طاقت حاصل کرنا ایک مشکل امر ہوگا کیونکہ وہ ہمیشہ اقلیت ہی رہیں گے۔ مسلم لیگ نے یہ مان لیا کہ صرف ایک مسلم پارٹی ہی مسلم مفادات کی نمائندگی کر سکتی ہے اور کانگریس بنیادی طور پر ایک ہندو پارٹی ہے۔ جناح کا اصرار تھا کہ لیگ کو مسلمانوں کے ''واحد ترجمان'' کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے، اس وقت معدودے چند ہی لوگ اس بات کے قائل ہو سکے، لیگ اگرچہ متحدہ صوبہ جات، بمبئی اور مدارس میں مقبول تھی لیکن ان تین صوبوں میں بھی سماجی حمایت کے لیے لیگ ابھی تک کمزور بنی ہوئی تھی جن صوبوں کو کاٹ کر دس سال بعد پاکستان بنایا گیا جیسے بنگال، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب۔ حتی کہ لیگ سندھ میں بھی حکومت تشکیل کرنے میں ناکام رہی۔ اس فیصلہ کن مرحلے کے بعد لیگ نے سماجی حمایت کی توسیع کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔

کانگریس وزارتوں نے بھی اس درار کی توسیع میں تعاون دیا۔ متحدہ صوبہ جات میں کانگریس پارٹی نے مخلوط حکومت بنانے کے لیے مسلم لیگ کی تجویز کو مسترد کر دیا کیونکہ مسلم لیگ زمین دارانہ نظام کی حمایت کی طرف مائل نظر آتی تھی جس کو کانگریس ختم کرنے کی خواہشمند تھی۔ اگرچہ پارٹی نے اس سمت میں ابھی تک کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تھا نہ ہی کانگریس ''مسلم عوامی رابطہ پروگرام کے تحت جس کا اس نے آغاز کیا تھا، کوئی حقیقی فائدہ حاصل کر پائی تھی۔ کانگریس کے سیکولر اور انتہاپسندانہ تحریر وتقریر سے قدامت پسند مسلمان اور زمین دار ممتاز طبقہ تو دہشت زدہ ہو گیا۔ اور مستزادیہ کہ کانگریس مسلم عوام کی حمایت بھی جیتنے میں ناکام رہی۔ مزید براں، حالانکہ 1930 کی دہائی کے آخر میں، نمایاں کانگریس لیڈران سیکولرزم کی ضرورت کے لیے پہلے سے بھی زیادہ زور دینے

مسلم لیگ (The Muslim League)

1906 میں بنیادی طور پر مسلم لیگ کا آغاز ڈھاکہ میں ہوا۔ اتر پردیش کے مسلم ممتاز طبقے نے جلد ہی اس کا انتظام سنبھال لیا۔ 1940 کی دہائی میں پارٹی نے برصغیر ہندوپاک کے مسلم اکثریت والے علاقوں کی خودمختاری اور پاکستان کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

ہندو مہاسبھا (Hindu Mahasabha)

1915 میں قائم ہندو مہاسبھا ایک ہندو پارٹی تھی جو شمالی ہندوستان تک محدود رہی۔ اس پارٹی کا مقصد ہندوؤں میں ذات پات اور فرقہ کے اختلاف سے آگے نکل کر ہندو سماج کو متحد کرنے کی حوصلہ افزائی کرنی تھی۔ ہندو مہاسبھا ہندو شناخت کو مسلم شناخت کی عداوت کے لیے، توضیح کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

لگے تھے، لیکن پارٹی نظام مراتب میں ان خیالات سے اتفاق کرنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا حتی کہ کانگریس کے وزرا بھی ان خیالات سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ کانگریس کے ایک اہم رکن مولانا آزاد نے 1937 میں اس بات کی نشاندہی کی کہ کانگریس کے ممبران کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہے اس کے باوجود کم از کم مرکزی صوبہ جات (موجودہ مدھیہ پردیش) میں کانگریس ممبران ہندو مہا سبھا میں کافی سرگرم ہیں۔ 1938 میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے یہ اعلان کیا کہ کانگریس کے ممبران ہندو مہا سبھا کے ممبر نہیں بن سکتے۔ اتفاقاً یہ وہی زمانہ ہے جب ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کی طاقت بڑھ رہی تھی، 1930 کی دہائی میں آر ایس ایس اپنے نقطۂ آغاز ناگپور سے بڑھتے ہوئے متحدہ صوبہ جات، پنجاب اور ملک کے دیگر علاقوں تک پھیل گئے۔ 1940 تک آر ایس ایس کے پاس ہندو قوم پرستی کے نظریہ کے تئیں عہد یافتہ اور انتہائی نظم وضبط و ترتیب یافتہ بنیادی جتھے کے کارکنان کی تعداد 1,00,000 سے بھی زائد تھی، انھیں یقین تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کی زمین ہے۔

وفاق — جدید سیاسی زبان میں یہ اصطلاح معقول، خودمختار اور مقتدر ریاستوں کے اتحاد (یونین) مرکزی حکومت کے ساتھ مع متعین طاقت کی طرف رجوع کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

3.3 ''پاکستان'' کے لیے قرارداد

(The "Pakistan" Resolution)

پاکستان کے قیام کا مطالبہ بتدریج واضح شکل میں سامنے آیا۔ 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ نے برصغیر کے مسلم اکثریت والے علاقوں کے لیے مقررہ حد تک خودمختاری کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک قرارداد پیش کی۔ اس مبہم سی قرارداد میں کہیں بھی تقسیم ملک یا پاکستان کا ذکر نہیں تھا۔ فی الحقیقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) کے لیڈر سکندر حیات خان نے جنھوں نے اس قرارداد کا مسودہ تیار کیا تھا یکم مارچ 1941 کو پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ایسے پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت کرتے ہیں جس کا مطلب یہاں مسلم راج اور کسی ایک جگہ ہندو راج ہوگا............ اگر پاکستان کا مطلب پنجاب میں خالص مسلم راج قائم ہونے والا ہے تو پھر میں اس کے لیے کچھ نہیں کروں گا۔'' انھوں نے وفاقی اکائیوں کے لیے مناسب خودمختاری کے ساتھ متحدہ وفاق کے لیے اپنی دلیل کو دہرایا۔

پاکستان کے مطالبے کی اصل کو ماضی میں اردو کے شاعر محمد اقبال کے یہاں سے تلاش کیا جاسکتا ہے جنھوں نے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ترانہ لکھا۔ 1930 میں مسلم لیگ کے اجلاس کا صدارتی خطبہ دیتے ہوئے محمد اقبال نے ''شمال مغربی ہند مسلم ریاست کے لیے ضرورت'' پر زور دیا تاہم اقبال نے اس تقریر میں ایک نئے ملک کے ظہور کو متصور نہیں کیا بلکہ شمال

پاکستان کا نام

(The name "Pakistan")

پاکستان یا **پاک-ستان** (پنجاب، افغانستان، کشمیر، سندھ اور بلوچستان) نام کیمبرج یونیورسٹی کے ایک پنجابی مسلمان طالب علم چودھری رحمت علی نے 1933 اور 1935 میں لکھے اپنے دو مقالوں میں وضع کیا تھا۔ وہ اس نئی انفرادیت (ریاست) کے لیے ایک علاحدہ قومی درجے کے خواہش مند تھے۔ 1930 کی دہائی میں کسی نے رحمت علی کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ یہاں تک کہ مسلم لیگ اور دیگر مسلم لیڈران نے بھی اس کے خیالات کو صرف ایک طالب علم کا خواب سمجھ کر خارج کر دیا۔

ماخذ4

1940 کی مسلم لیگ کی قرارداد (The Muslim League resolution of 1940)

مسلم لیگ کی 1940 کی قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ:
جغرافیائی طور پر ملحق اکائیوں کو علاقوں کی شکل میں نشان زد کیا جائے جن کی تشکیل ضرورت کے لحاظ سے ایسے علاقوں کی نئی صورت سے کی جائے کہ ان علاقوں کے جو شمال مغربی اور مشرقی حلقوں میں مسلمان تعداد میں اکثریت میں ہوں ان کو اکٹھا کر کے ایک ''آزاد ریاست'' تشکیل دے دی جائے جس میں شریک اکائیاں خودمختار اور مقتدر ہوں گی۔

مسلم لیگ کس بات کا مطالبہ کر رہی تھی؟
کیا وہ ایسے پاکستان کا مطالبہ کر رہی تھی جس پاکستان کو آج ہم جانتے ہیں؟

مغربی ہند میں مسلم اکثریت والے علاقوں کو ایک متحد، بندش سے آزاد ہندوستانی وفاق کے اندر ایک خودمختار اکائی کے طور پر تسلیم کرنے کی بات کی۔

3.4 تقسیم ہند کا اچانک ہونا (The suddenness of Partition)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ 1940 میں مسلم لیگ بذات خود اپنے مطالبے کے بارے میں ابہام کا شکار تھی۔ برصغیر کے مسلم اکثریت والے علاقوں کے لیے خودمختاری کے مطالبے اور تقسیم ملک کے لیے پہلے رسمی واضح عمل کے درمیان بہت ہی کم وقت تھا— صرف سات سال۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ پاکستان کی تخلیق کا کیا مطلب ہے اور اس سے مستقبل میں لوگوں کی زندگی کیسی ہوگی۔ 1942 میں اپنی آبائی سرزمین (وطن) سے ہجرت کرنے والے بہت سے افراد کو لگتا تھا کہ جوں ہی امن بحال ہوگا وہ لوگ واپس لوٹ آئیں گے۔

حتیٰ کہ شروع میں مسلم لیڈران نے بھی ایک خودمختار ریاست پاکستان کے لیے سنجیدگی سے مطالبہ نہیں کیا۔ ابتدا میں شاید جناح خود بھی پاکستان کے تصور کو سودے بازی کی ایک جوابی کارروائی کے طور پر ہی استعمال کر رہے تھے جس کو وہ انگریزی حکومت کے ذریعہ کانگریس کو ملنے والی رعایتوں پر ممکنہ روک لگانے اور مسلمانوں کے لیے اضافی خاص رعایت حاصل کرنے کے لیے فائدہ مند سمجھتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دباؤ کے سبب انگریزوں نے محدود وقت کے لیے آزادی کی رسمی بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تاہم یہ زبردست ہندوستان چھوڑو تحریک ہی تھی جو 1942 میں شروع ہوئی تھی اور شدید استیصال کے باوجود قائم تھی جس نے انگریز راج کو گھٹنوں کے بل لا کھڑا کیا اور برطانوی افسران کو ممکنہ اقتدار کی منتقلی کے بارے میں ہندوستانی پارٹیوں کے ساتھ بات چیت شروع کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

3.5 مابعد جنگ واقعات (Post-War developments)

1945 میں بات چیت کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا تو مکمل آزادی کی طرف بنیادی قدم کے طور پر انگریز ایک مکمل مرکزی ایگزیکیٹو کونسل بنائے جانے کے لیے راضی ہو گئے جس میں وائسرائے اور مسلح افواج کے کمانڈران ان چیف کے علاوہ ہندوستانی ممبران ہوں گے۔ اقتدار کی منتقلی کے متعلق بات چیت کا یہ سلسلہ جناح کے اڑیل مطالبے کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ایگزیکیٹو کونسل کے تمام مسلم ممبران کو منتخب کرنے کا مطلق حق مسلم لیگ کے علاوہ کسی کو نہیں ہے اور وہ کونسل میں فرقہ وارانہ قسم کا ویٹو بھی چاہتے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مسلم ممبران کے ذریعہ کسی فیصلے

شکل 14.6
نومبر 1939 میں وائسرائے کے ساتھ ایک میٹنگ سے قبل گاندھی جی کے ساتھ محمد علی جناح

کی مخالفت کی صورت میں اس فیصلہ کا نفاذ دوتہائی اکثریت سے ہی ہونا چاہیے۔ اس زمانے کی سیاسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے لیگ کا پہلا مطالبہ قوم پرست مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کے لیے جو کانگریس کی حمایت کرتا تھا (بات چیت کے سلسلے میں اس طبقہ کے وفد کی نمائندگی مولانا آزاد کررہے تھے) مکمل طور پر غیر معمولی تھا اور مغربی پنجاب میں یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) کے ممبران بھی زیادہ تر مسلمان تھے۔ انگریزوں کا مقصد یونینسٹ کو ناراض کرنا نہیں تھا جو ابھی تک پنجاب حکومت پر اختیار رکھتے تھے اور مسلسل انگریزوں کے وفادار رہے تھے۔

یونینسٹ پارٹی (Unionist Party)

یہ پنجاب میں ہندو، مسلم اور سکھ زمین داروں کے مفادات کی نمائندگی کرنے والی سیاسی پارٹی تھی۔ جو 27-1923 کے درمیان خاص طور پر کافی طاقتور تھی۔

1946 میں دوبارہ صوبائی الیکشن منعقد ہوئے۔ عام انتخابی حلقوں میں کانگریس نے دوسری پارٹیوں کا صفایا کر دیا اور غیر مسلموں کے 91.3 فی صد ووٹوں پر قبضہ کرلیا۔ مسلمانوں کے لیے محفوظ سیٹوں پر مسلم لیگ کو بھی ایسی ہی مساوی اور قابل دید کامیابی ملی۔ اس نے مرکزی صوبہ جات میں تمام 30 محفوظ انتخابی حلقوں میں کل مسلم ووٹوں میں سے 86.6 فی صد کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور صوبوں کی کل 509 سیٹوں میں 442 سیٹ اسے حاصل ہوئیں تاہم

صرف 1946 کے آخر میں جا کر مسلم لیگ خود کو مسلم رائے دہندگان کے درمیان ایک نہایت ذی اثر پارٹی کے طور پر ثابت کر سکی۔ اب جا کر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ''واحد ترجمان'' ہونے کا دعویٰ ثابت کر پائی۔ تاہم واضح رہے کہ انتخاب میں رائے دہی کا حق بہت محدود تھا۔ صوبائی الیکشن میں آبادی کا تقریباً 12-10 فی صد حصہ ہی ووٹ ڈالنے کے حق سے محظوظ ہوتا تھا۔ مرکزی اسمبلی کے لیے انتخابات میں تو صرف ایک فی صد لوگوں کو ہی رائے دہی کا حق حاصل تھا۔

3.6 تقسیم ملک کا ایک ممکنہ متبادل

(A possible alternative to Partition)

مارچ 1946 میں برطانوی کابینہ نے تین ممبران پر مشتمل ایک وفد مسلم لیگ کے مطالبہ کی جانچ کرنے اور آزاد ہندوستان کے لیے مناسب سیاسی خدوخال تجویز کرنے کے لیے دہلی کے لیے روانہ کیا۔ کابینہ مشن نے تین ماہ کا ہندوستان کا دورہ کیا اور ایک مبہم سے تین سطح والے وفاق کی سفارش کی، جس میں ہندوستان متحد بنا رہتا اس میں مرکزی حکومت کافی کمزور ہوتی اور اس کے پاس صرف غیر ملکی امور، دفاع اور ابلاغ پر اختیار ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی قانون ساز اسمبلی کا انتخاب کرتے ہوئے موجودہ علاقائی اسمبلیوں کو تین حصوں میں گروہ بند کیا جانا تھا۔ 'a' ہندو اکثریت والے صوبہ جات اور 'b' 'c' شمال مغربی اور شمال مشرقی (بشمول آسام) مسلم اکثریت والے صوبہ جات بالترتیب گروہ بند کیے گئے تھے صوبہ جات کے ان حصوں یا گروہ کو مل کر مختلف علاقائی اکائیاں تشکیل دینی تھیں۔ ثالثی سطح پر اقتدار کے لیے قائم انتظامی اور قانون ساز ادارے ان کے اپنے پاس ہی رہتے۔

علاحدگی (Secede) کے معنی کسی انجمن یا تنظیم سے رسمی طور پر علاحدگی کے ہیں۔

شروعات میں تمام اہم پارٹیوں نے اس منصوبہ کو قبول کر لیا۔ لیکن یہ سمجھوتہ جزوقتی ثابت ہوا کیونکہ یہ منصوبے کی ترجمانی کی باہمی مخالفت پر مبنی تھا۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ صوبہ جات کی گروہ بندی حصہ 'b' اور 'c' ارتقا پذیر انفرادیت کے ساتھ، لازمی ہوں اس کے ساتھ ہی مستقبل میں اتحاد (Union) سے علاحدگی کا حق بھی ہونا چاہیے۔ کانگریس چاہتی تھی کہ صوبہ جات کو کسی بھی گروپ میں شرکت کرنے کا حق ملے۔ کانگریس کیبنٹ مشن کی اس وضاحت کے ساتھ بھی مطمئن نہ تھی کہ پہلے یہ گروہ بندی لازمی ہوگی لیکن ایک دفعہ آئین بن جانے کے بعد صوبوں

شکل 14.7
اکتوبر 1938 میں شمال مغربی سرحدی صوبہ میں گاندھی جی، خان عبد الغفار خان (جو سرحدی گاندھی کے نام سے معروف ہیں) موشیلا نائر اور امۃ السلیم کے ساتھ

نقشہ 1
تین حصوں کے ساتھ ایک ہندوستانی وفاق کے
لیے کیبنٹ مشن کی تجویز
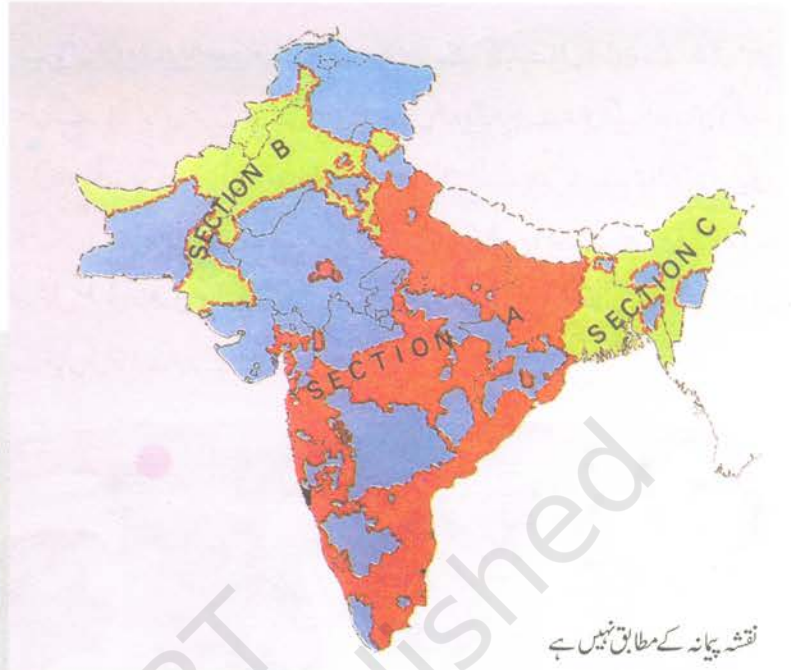
(سبز)	1941 کے مسلم اکثریت والے علاقے
(سرخ)	1941 کے ہندو اکثریت والے علاقے
(نیلا)	شاہی ریاستیں، جن کے متعلق اس تجویز میں خاص طور پر کوئی انتظام نہ تھا۔

ماخذ 5

''بیاباں میں ایک آواز'' ("A voice in the wilderness")

گاندھی جی جانتے تھے کہ ان کی حالت ''بیاباں میں ایک آواز'' ہے لیکن پھر بھی وہ مسلسل تقسیم ملک کے تصور کی مخالفت کرتے رہے:

لیکن آج ہم کیسا المیہ دیکھ رہے ہیں۔ میں پھر بھی وہ دن دیکھنا چاہوں گا جب ہندو اور مسلمان باہمی صلاح ومشورہ کے بنا کوئی کام نہیں کریں گے۔ میں دن اور رات اس سوال کے لیے سخت ذہنی اذیت میں مبتلا ہوں کہ آنے والے اس دن کو سلام کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں لیگ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ کسی بھی ہندوستانی کو اپنا دشمن ملحوظ نہ رکھے...... ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی مٹی کی پیداوار ہیں، دونوں کا خون ایک ہے، ایک جیسا کھانا کھاتے ہیں، ایک جیسا پانی پیتے ہیں اور ایک جیسی زبان بولتے ہیں۔

پرارتھنا سبھا کی تقریر، 7 ستمبر 1946
کلیکٹڈ ورکس آف مہاتما گاندھی، جلد 92، صفحہ 139

لیکن میرا پختہ یقین ہے کہ مسلم لیگ کے ذریعہ جس پاکستان کا مطالبہ اٹھایا گیا ہے وہ غیر اسلامی ہے اور مجھے اس کو ناجائز کہنے میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ اسلام انسانی اتحاد اور بھائی چارے کی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی۔ تاہم جو لوگ ہندوستان کو ممکنہ خطرے کی علامت کے طور پر حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں وہ اسلام اور ہندوستان کے دشمنوں کی طرح ہیں۔ وہ چاہے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں لیکن وہ مجھ کو ایسی کسی تجویز پر متفق نہیں کر سکتے جس کو میں غلط سمجھتا ہوں۔

ہریجن، 26 ستمبر 1646
کلیکٹڈ ورکس آف مہاتما گاندھی، جلد 92، صفحہ 229

⊂ پاکستان کے تصور کی مخالفت کرنے کے لیے گاندھی جی نے کیا دلائل پیش کیے تھے؟

کے پاس گروہ سے علاحدہ ہونے کا حق ہوگا اور نئے انتخابات اس آئین کے مطابق منعقد ہوں گے۔ بالآخر اس طرح کیبنٹ مشن کے ان پیش کردہ تجاویز سے نہ ہی لیگ اور نہ ہی کانگریس متفق ہو پائی۔ یہ ایک انتہائی فیصلہ کن مرحلہ تھا کیونکہ ''اس'' کے بعد تقسیم ملک کم وبیش ناگزیر تھی۔ کانگریس کے زیادہ تر لیڈر اس کو ایک المیہ لیکن ناقابل مفر کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ صرف گاندھی جی اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیڈر خان عبدالغفار خان مستقل استقلال کے ساتھ تقسیم ملک کے خیال کی مخالفت کر رہے تھے۔

شکل 14.8
کلکتہ کی سڑکوں پر فسادی لوہے کے چھڑوں اور ڈنڈوں سے لیس، 1946

3.7 تقسیم ملک کی طرف (Towards Partition)

کیبنٹ مشن منصوبے سے اپنی حمایت واپس لینے کے بعد مسلم لیگ نے اپنے پاکستان کے مطالبے کی حمایت جیتنے کے لیے ''راست کارروائی'' (Direct Action) کرنے کا فیصلہ کیا۔ 16 اگست 1946 کے دن کو اس نے ''یوم راست کارروائی'' (Direct Action Day) کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ اسی دن کلکتہ میں فسادات بھڑک اٹھے جو کئی دن تک جاری رہے اور ان میں ہزاروں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مارچ 1947 تک، شمالی ہند کے بہت سے حصوں میں تشدد پھیل گیا تھا۔

مارچ 1947 میں کانگریس اعلیٰ کمان نے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے ووٹ دیا۔ ایک مسلم اکثریت کے ساتھ اور دوسرا ہندو و سکھ اکثریت کے ساتھ اور کانگریس نے بنگال کے معاملے میں بھی یہی اصول اپنانے کا مشورہ دیا۔ اس وقت تک تعداد و شمار کا کھیل دیکھتے ہوئے پنجاب کے بہت سارے سکھ لیڈران اور کانگریسی اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ اب تقسیم ملک ایک لازمی ناخوشگوار عمل ہے ورنہ وہ مسلمان اکثریت کے ذریعہ محصور ہو جائیں گے اور انھیں مسلمان لیڈران کے ذریعہ نافذ کردہ شرائط کے تحت رہنا ہوگا۔ بنگال میں بھی ''محدود لوگ'' بنگالی ہندوؤں کا جو طبقہ سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں بنائے رکھنا چاہتا تھا وہ بھی ''مسلمانوں کی مستقل سرپرستی'' (جیسا کہ ان کے ایک لیڈر نے یہی کہا تھا) کے خوف میں مبتلا ہونا شروع ہو گئے۔ چونکہ وہ تعداد و شمار کے لحاظ سے اقلیت میں تھے اس لیے انھیں محسوس ہوتا تھا کہ صرف صوبہ کی تقسیم ہی ان کے سیاسی غلبہ کو یقینی بنا سکتی ہے۔

بحث کیجیے..........

حصہ سوم پڑھنے کے بعد بظاہر یہ لگتا ہے کہ پاکستان بننے کے لیے کئی اسباب تھے۔ آپ کے خیال میں ان میں سے کون سب سے زیادہ اہم تھا اور کیوں؟

4. قانون اور انتظام کا ناکام ہونا (The Withdrawal of Law and Order)

شکل 14.9
1946 کے خون سے شرابور مہینوں کے دوران تشدد اور آگ زنی میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔

مارچ 1947 سے تقریباً ایک سال تک قتل عام جاری رہا۔ اس کا اہم سبب یہ تھا کہ حکمرانی کے ادارے منہدم ہو چکے تھے۔ اس وقت بہاول پور (موجودہ پاکستان) میں تعینات ایک انتظامی افسر پنڈیرل مون (Penderal Moon) نے اس ضمن میں لکھا تھا جب مارچ 1947 میں امرتسر میں آگ زنی اور مارکاٹ جاری تھی تو پولس کس طرح گولی چلانے میں ناکام رہی تھی۔

امرتسر ضلع سال کے آخر میں آ کر خوں افشانی کا منظر بن گیا تھا جب وہاں شہر میں مختار کاری (Authority) کا مکمل سقوط ہو چکا تھا۔ برطانوی افسران نہیں جانتے تھے کہ صورت حال کو کیسے قابو میں کیا جائے۔ وہ کسی قسم کا فیصلہ لینے کے بھی خواہش مند نہ تھے اور دخل اندازی کرنے کے لیے تذبذب کا شکار تھے۔ دہشت زدہ لوگوں نے جب مدد کے لیے اپیل کی تو برطانوی افسران نے انھیں گاندھی جی، جواہر لعل نہرو، ولبھ بھائی پٹیل یا محمد علی جناح سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ مختار کاری اور اقتدار کس کے ہاتھ میں ہوگا سوائے گاندھی جی کے ہندوستانی پارٹیوں کے اعلیٰ لیڈران آزادی کے سلسلے میں جاری بات چیت میں مشغول تھے جب کہ متاثرہ صوبوں میں بہت سے ہندوستانی سول افسران خود اپنی جان و مال کے سلسلے میں خوفزدہ تھے اور انگریز ہندوستان چھوڑنے کی تیاری میں مصروف تھے۔

مشکل اس لیے اور زیادہ بڑھ گئی کیونکہ ہندوستانی فوجی جوان اور پولس والے بھی ایک ہندو مسلم اور سکھ کے حساب سے کام کرنے لگے تھے۔ جوں جوں فرقہ وارانہ تناؤ بڑھتا گیا ویسے ویسے وردی پوش افراد کے پیشہ ورانہ عہد پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بیشتر مقامات پر نہ صرف پولس والوں نے اپنے ہم مذہب لوگوں کی مدد کی بلکہ انھوں نے دوسرے مذہبی طبقوں پر بھی حملے کیے۔

4.1 ایک تنہا فوج (The one-man army)

اس ساری افراتفری کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی بحال کرنے کے لیے ایک شخص کی بہادرانہ کوششوں کا نتیجہ سامنے آنے لگا۔ 77 سالہ گاندھی جی نے اپنے تاحیات عدم تشدد کے اصول کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ فیصلہ اس یقین پر مبنی تھا کہ لوگوں کے دلوں کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وہ مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کے نوآکھالی گاؤں سے بہار کے گاؤں میں اور پھر کلکتہ اور دہلی کی فساد زدہ پسماندہ بستیوں کے سفر پر نکل پڑے۔ ہر جگہ انھوں نے خبر گیری کرتے ہوئے اقلیتی طبقے کو یقین دہانی کرائی۔ اکتوبر 1946 مشرقی بنگال میں مسلمانوں نے ہندوؤں کو نشانہ بنایا۔ گاندھی جی نے علاقے کا دورہ کیا، پیدل گاؤں گاؤں میں گئے اور مقامی مسلمانوں کو باور کرایا کہ وہ ہندوؤں کے تحفظ کی ضمانت دیں۔ اسی طرح دیگر مقامات جیسے دہلی میں انھوں نے دونوں فرقوں کے درمیان باہمی بھروسہ اور یقین و اعتماد کا حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حالات سے مجبور ہو کر جان بچانے کے لیے بھاگ کر پرانے قلعہ کے گندے اور اژدھام بھرے پناہ گزین کیمپ میں پناہ لینے والے شاہد احمد دہلوی نامی دہلی کے

ماخذ 6

"ایک گولی چلائے بغیر"
("Without a shot being fired")

یہ وہ ہے جو مون نے لکھا:

24 گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تک فسادی مجمع کو اس عظیم تجارتی شہر میں بغیر چیلنج کیے قیامت خیزی کی اجازت دی گئی۔ بہترین بازاروں کا جلا کر راکھ کر دیا گیا اور آگ لگانے نیز فتنہ انگیزی کرنے والوں کو منتشر کرنے کے لیے ایک بھی گولی نہیں چلائی گئی (یعنی جو لوگ شورش کرنے میں ملوث تھے)...... ضلع مجسٹریٹ نے اپنی (بڑی پولس) طاقت کو شہر میں مارچ کرنے کا حکم دیا اور اس طاقت کا کوئی موثر استعمال کیے بنا واپس بلا لیا......

شکل 14.10
نوا کھالی گاؤں کے لوگ گاندھی جی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پرامید گاؤں والوں کا مجمع بھیڑ

ایک مسلمان نے 9 ستمبر 1947 کو ان کے دہلی پہنچنے کو ''خصوصی طور پر طویل اور سخت گرمی کے بعد بارش کی آمد'' سے مربوط کیا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنی خودنوشت میں یادداشت تازہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح مسلمان ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ ''اب دہلی محفوظ ہوجائے گی۔''

28 نومبر 1947 کو گرونانک کے یوم پیدائش پر جب گاندھی جی گردوارہ سیس گنج میں سکھوں کے ایک جلسے کو خطاب کرنے گئے تو انھوں نے مشاہدہ کیا کہ پرانی دہلی کا دل کہے جانے والے چاندنی چوک کی سڑک پر ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ اسی شام اپنی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ ''ہمارے لیے اس سے زیادہ شرم کی اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ فی الحقیقت چاندنی چوک میں ایک بھی مسلمان نہیں مل سکا؟'' گاندھی جی دہلی میں مسلسل اس ذہنیت کے خلاف لڑتے رہے جو ہر مسلمان کو ایک پاکستانی کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے شہر سے باہر دھکیلنے کے لیے خواہشمند تھی۔

شکل 14.11
فساد زدہ گاؤں کے لوگ گاندھی جی کی آمد کا انتظار کرتے ہوئے

جب انھوں نے لوگوں کے دلوں کو بدلنے کے لیے اَن شن (برت) شروع کیا تو حیرت انگیز طور پر بہت سے ہندو اور سکھ مہاجرین نے بھی اس میں ان کا ساتھ دیا۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں۔اس کا اثر ''بجلی'' کی طرح تھا۔ لوگوں نے شہر کے مسلمانوں کی منظم نسل کشی کی احمقانہ حرکت کی جس کے لیے وہ آزاد چھوڑ دیے گئے تھے حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا شروع کر دیا تھا۔تشدد کا یہ خطرناک ڈرامہ بالآخر گاندھی جی کی شہادت کے ساتھ ختم ہوا۔ دہلی کے بہت سے مسلمانوں نے بعد میں یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا ''دنیا صحیح معنی میں بدل گئی تھی۔''

5. تقسیم ملک میں خواتین (GENDERING PARTITION)

5.1 عورتوں کی ''بازیابی'' ("Recovering" women)

گذشتہ ڈیڑھ دہائی سے مؤرخین تقسیم کے دوران عام لوگوں کے تجربات کی جانچ کر رہے ہیں۔اس تشدد کے دور میں عورتوں کے دہشت خیز تجربات کے متعلق دانشوروں نے بہت لکھا ہے۔عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا، اغوا کیا گیا، اکثر بار بار فروخت کیا گیا، انجان حالات میں اجنبی لوگوں کے ساتھ نئی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ جس گہرے جذباتی صدمے کو انھوں نے برداشت کیا اس میں بعض خواتین نے بدلے ہوئے حالات میں اپنے نئے خاندانی رشتوں کو بہتر بنایا۔لیکن ہندو پاک حکومتیں انسانی رشتوں کی پیچیدگی کے لطیف احساسات سے عاری۔ جو عورتیں سرحد کے غلط طرف چلی گئی تھیں انھیں ان کے نئے رشتہ داروں سے یہ مانتے ہوئے چھین لیا کہ انھیں ان کے قدیم اہل خانہ یا جگہوں پر واپس بھیج دیا جائے گا۔اس بابت متعلقہ عورتوں سے مشورہ نہیں کیا گیا، اپنی زندگی سے متعلق فیصلہ لینے کے ان کے حق کو نظر انداز کیا گیا۔ایک تخمینہ کے مطابق ایک مہم میں کل ملا کر 30,000 خواتین کی ''بازیابی'' کی گئی۔ان میں سے 22,000 مسلم خواتین کی ہندوستان سے اور 8,000 ہندو اور سکھ خواتین کی پاکستان سے بازیابی کی گئی۔ یہ مہم 1954 کے آخر میں جا کر ختم ہوئی۔

بحث کیجیے

امن قائم کرنے کے لیے انگریزوں نے جب وہ ہندوستان چھوڑ کر جا رہے تھے، کیا اقدام کیے؟ اور گاندھی جی نے اس پریشان کن وقت میں کیا کیا تھا؟

ماخذ 7

عورتوں کی "بازیابی" کے کیا معنی تھے
(What "recovering" women meant)

کاش ٹنڈن نے اپنی کتاب "پنجابی سینچوری" (Punjabi Century) میں جونوآبادیاتی پنجاب کی ایک خودنوشتہ سماجی تاریخ ہے ایک جوڑے کے تجربات کی دوبارہ پڑتال کی ہے:

ایک معاملہ میں تقسیم ملک کے دوران ایک سکھ نوجوان نے قتل عام پر آمادہ مجمع کو قائل کر کے ایک نوجوان، خوبصورت مسلم لڑکی کو جو دہشت زدہ ہو کر بھاگ رہی تھی اس مجمع سے اپنے لیے لے لیا۔ ان دونوں نے شادی کر لی اور ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے۔ بتدریج لڑکی کے ذہن سے اس کے والدین جو اس دوران مارے گئے تھے اور گذشتہ زندگی کی یادیں دھندلی ہونے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے اور ان کا ایک بیٹا بھی ہوا تھا تاہم جلد ہی اغوا ہوئی عورتوں کی بازیابی کے لیے مستقل مزاجی سے لگے ہوئے سماجی کارکن اور پولس والوں نے جوڑے کو پکڑنے کے لیے تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اس سکھ کے آبائی ضلع جالندھر میں تحقیقات کی۔ اسے اس تحقیقات کی بھنک مل گئی اور وہ اہل خانہ کے ساتھ کلکتہ بھاگ گیا۔ سماجی کارکن کلکتہ پہنچے۔ اس دوران جوڑے کے دوست واحباب نے کورٹ سے ان کی گرفتاری روکنے کا حکم نامہ (Stay Order) حاصل کرنے کی کوشش کی جبکہ قانون اپنے بوجھل قدموں سے چل رہا تھا۔ کلکتہ سے یہ جوڑا اس امید کے ساتھ پنجاب کے کسی غیر معروف گاؤں کی طرف بھاگ گیا کہ پولس ان کی پرچھائیں بھی پانے میں ناکام رہے گی، لیکن پولس نے انھیں پکڑ ہی لیا اور ان سے تفتیش شروع کر دی۔ اس کی بیوی پھر سے حاملہ تھی اور اب بچے کی پیدائش کا وقت قریب تھا۔ سکھ نے اپنے چھوٹے لڑکے کو تو اپنی ماں کے پاس بھیج دیا اور اپنی بیوی کو ایک گنے کے کھیت میں لے گیا۔ یہاں ایک گڈھے میں اس نے اپنی بیوی کو ممکنہ آرام کے ساتھ بٹھا دیا جب کہ وہ خود پولس کا انتظار کرتے ہوئے ایک بندوق کے ساتھ لیٹ گیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے اپنی بیوی کو خود سے الگ نہ ہونے دے گا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اس گڈھے میں اپنی بیوی کا بچہ تولد کرایا۔ اگلے دن اس کی بیوی کو تیز بخار آ گیا اور تین دن کے اندر وہ مر گئی۔ وہ اپنی بیوی کو اسپتال لے جانے کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ وہ بہت زیادہ ڈرا ہوا تھا کہ کہیں سماجی کارکنان اور پولس والے اسے اسے چھین نہ لیں۔

شکل 14.12
اپنے خاندان کے افراد کی موت کی خبر سن کر عورتیں ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہوئے۔
فسادات کے تشدد میں مرد کافی بڑی تعداد میں مارے گئے تھے۔

5.2 "عزت" کی حفاظت (Preserving "honour")

دانشوروں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اس جسمانی اور نفسیاتی خوف کے دور میں فرقہ اور طبقہ کی عزت کی حفاظت کا تصور کس طرح کا کردار ادا کر رہا تھا۔ عزت کا یہ خیال تذکیر کے تصور سے اخذ کیا گیا تھا جو زن (عورت) اور زمین کی ملکیت سے متعین ہوتا ہے۔ شمالی ہند کے زرعی سماجوں

میں یہ ایک خاصا تصور ہے۔ یہ مانا جاتا تھا کہ کسی کی مردانگی، بیرونی لوگوں سے مناسب انداز میں اپنی ملکیت — زن اور زمین — کے تحفظ کرنے کی صلاحیت میں مضمر تھی۔ کسی حد تک اکثر آویزش ان دو بنیادی ''ملکیت'' کے اوپر ہی واقع ہوتی تھی۔ حسب ضرورت اکثر عورتیں ویسی ہی اقدار کو اندرونی بنا لیتی تھیں۔

تاہم گاہے گاہے جب مردوں کو یہ خوف ہوتا تھا کہ ''ان کی'' خواتین — بیویاں، لڑکیاں بہنیں — کا ''دشمن'' کے ذریعہ تقدس پامال ہو جائے گا تو وہ بذات خود عورتوں کو مار دیا کرتے تھے۔ اُروشی بوٹالیا نے اپنی کتاب ''دی ادر سائڈ آف سائلنس'' (The Other Side of Silence) میں ضلع راولپنڈی کے تھوآ خالصہ گاؤں کے ایک ایسے ہی لرزہ خیز واقعہ کو بیان کیا ہے۔ تقسیم ملک کے زمانے میں سکھوں کے اس گاؤں میں 90 عورتوں نے ''دشمن'' کے ہاتھوں میں پڑنے کے بجائے ''اپنی مرضی سے'' کنوئیں میں کود کر جان دے دی۔ اس گاؤں سے آئے ہوئے مہاجرین پناہ گزیں ابھی تک دہلی کے ایک گردوارے میں اس واقعہ کو تقریب کے ذریعہ کو یاد کرتے ہیں۔ وہ ان اموات کو خودکشی نہیں بلکہ شہادت سمجھتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ اس زمانے کے مردوں نے عورتوں کے فیصلے کو بہادری کے ساتھ قبول کیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض معاملوں میں انھوں نے عورتوں کو خود اپنی جان لینے کے لیے قائل بھی کیا۔ ہر سال 13 مارچ کو جب ان کی ''شہادت'' پر مذہبی رسومات انجام دی جاتی ہیں تو اس واقعہ کو سامعین مرد و خواتین اور بچوں کے سامنے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ عورتوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بہنوں کی قربانی اور بہادری کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھیں اور خود کو ایسے ہی سانچے میں ڈھالیں۔

یادآوری کی رسم طبقے کے افراد کے لیے ان یادوں کو زندہ رکھنے میں مدد دیتی ہے تاہم اس طرح کی رسوم میں ان عورتوں کو یاد کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی جو اس طرح مرنے کی خواہش مند نہ تھیں اور جنھوں نے اپنی مرضی کے خلاف اپنی زندگیوں کا خاتمہ کیا تھا۔

بحث کیجیے

کن خیالات کے سبب تقسیم ملک کے دوران بہت سی معصوم خواتین کو موت اور تکالیف سے گزرنا پڑا؟ ہند و پاک حکومتیں کیوں ''اپنی'' خواتین کے باہمی تبادلے کے لیے راضی ہوگئی تھیں؟ آپ کے خیال میں کیا ایسا کرتے وقت وہ صحیح تھے؟

6. علاقائی اختلافات
(REGIONAL VARIATIONS)

ابھی تک ہم عام لوگوں کے جن تجربات پر بحث کر رہے تھے وہ برصغیر کے شمال مغربی حصوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کیا تقسیم ملک بنگال، اتر پردیش، بہار، مرکزی ہندوستان اور دکن میں عین اسی طرح واقع ہوئی؟ اگر چہ 1946 میں کلکتہ اور نوآکھالی میں انسانی جانوں کا بھاری اتلاف ہو چکا تھا لیکن تقسیم ملک کی سب سے زیادہ خونی اور تباہ کن شکل پنجاب میں سامنے آئی۔ مغربی پنجاب سے تقریباً تمام ہندوؤں اور سکھوں کو ہندوستان میں اور تقریباً تمام پنجابی بولنے والے مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا اور یہ 1946 سے 1948 کے درمیان نسبتاً دو سال کے عرصہ میں واقع ہوا۔

اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش میں حیدرآباد کے بہت سے خاندان 1950 کی دہائی اور 1960 کی ابتدائی دہائی کے پورے عرصے میں مسلسل پاکستان کی طرف ہجرت کرتے رہے گو کہ بہت سے مسلمانوں نے ہندوستان میں ہی رہنا پسند کیا۔ ان میں سے بہت سارے اردو بولنے والے لوگ جو مہاجر کے نام سے معروف ہیں، سندھ میں کراچی اور حیدرآباد علاقے کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

بنگال میں یہ ہجرت زیادہ طویل عرصہ تک جاری رہی۔ لوگ ایک غیر محکم سرحد کے آر پار نقل مکانی کرتے رہے۔ اس کے ایک معنی یہ بھی تھے کہ بنگالی تقسیم سے جو تکلیف کا عمل پیدا ہوا تھا وہ شاید اتنا زیادہ شدید نہ تھا لیکن یہ ایک ذہنی آزار کی طرح تھا۔ مزید برآں پنجاب کے برخلاف بنگال میں آبادی کا باہمی تبادلہ بھی تقریباً مکمل نہیں تھا۔ بہت سے بنگالی ہندو مشرقی پاکستان میں جب کہ بہت سے بنگالی مسلمانوں نے مغربی بنگال میں ہی موجود رہنا بہتر سمجھا۔ بالآخر بنگالی مسلمانوں (مشرقی پاکستان) نے جناح کے دوقومی نظریہ کو سیاسی کارروائی کے ذریعہ خارج کرتے ہوئے پاکستان سے خود کو علاحدہ کر لیا اور 72-1971 میں بنگلہ دیش کی تشکیل عمل میں آئی۔ مذہبی اتحاد بھی مشرقی اور مغربی پاکستان کو باہم جوڑ کر نہیں رکھ سکا۔

شکل 14.13
ناامیدی کے چہرے
1947 میں پرانے قلعے کے اندر ایک پناہ گزیں کیمپ قائم کیا گیا تھا جس میں مختلف مقامات سے مہاجرین کثرت کے ساتھ آ رہے تھے۔

تاہم پنجاب اور بنگال کے تجربات کے درمیان زبردست یکسانیت ہے۔ ان دونوں ریاستوں میں عورتیں اور لڑکیاں ستم رانی کا بنیادی ہدف بن گئیں۔ حملہ آور عورتوں کے جسموں کے ساتھ مفتوح قلمرو کی طرح سلوک کرتے تھے۔ وہ ایک فرقہ کی عورتوں کی بے عزتی کو ان کے پورے فرقہ کی بے عزتی اور انتقامی کے پرفریب طریق عمل کے طور پر دیکھتے تھے۔

افسانے، شاعری، فلمیں (Fiction, Poetry, Films)

کیا آپ تقسیم ملک سے متعلق کسی طرح کی مختصر کہانیوں، ناولوں، نظموں یا فلموں سے مانوس ہیں؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقسیم ملک سے متعلق ادب اور فلمیں اس دہشت ناک تباہی کے واقعہ کو مؤرخین کے تحقیقی کاموں کے مقابلے میں زیادہ بصیرت افروز میں نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ عوام کی تکالیف اور دکھ درد کو ایک فرد کے کردار یا عام لوگوں کے ایک چھوٹے گروہ کے ذریعہ غور کر کے واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کی تقدیریں ایسے بڑے واقعہ سے تشکیل پاتی ہیں جن پر وہ کوئی قابو نہیں رکھتے۔ یہ اس زمانے کے ذہنی عذاب اور ابہام کو نا قابل فہم انتخابات کو جن کے ساتھ بہت سے لوگوں نے مقابلہ کیا تھا ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ان میں تشدد کا حجم اور پریشانی کا پیمانہ انسانی تخریب کاری و بداخلاقی اور صدمے کے احساس کا اندراج کیا گیا ہے۔ ان میں امید اور ان طریقوں کا اظہار بھی ہے جن سے لوگوں نے اس مصیبت پر قابو پایا تھا۔

اردو کے انوکھے، غیر معمولی طور پر ذہین افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے اپنی تحریر (کام) کے متعلق کہا تھا:

> طویل عرصے سے میں ملک کی تقسیم کے ذریعہ پیدا انقلاب کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کرتا رہا۔ میں اب بھی اسی طرح محسوس کرتا ہوں اور گمان کرتا ہوں کہ آخر کار خود پر ترس کھائے یا مایوس ہوئے بغیر اس ہیبت ناک سچائی کو قبول کرلیا۔ اس عمل میں، میں نے انسان کے بنائے ہوئے خون کے سمندر کے ایک نایاب رنگ کے موتی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی، اکیلے ذہن کی دھن کے ساتھ جس میں انسان انسان کو مار رہا تھا کے متعلق لکھا، ان میں سے کچھ کی شدید ندامت کے احساس کے متعلق لکھا، ان قاتلوں کے بہائے گئے آنسوؤں کے متعلق لکھا جو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ان میں اب تک کچھ انسانی احساسات کیوں باقی رہ گئے۔ یہ سب اور مزید بھی، میں نے اپنی کتاب ''سیاہ حاشیے'' میں لکھا ہے۔

تقسیم ملک سے متعلق ادب اور فلمیں بہت سی زبانوں میں موجود ہیں۔ ہندی، اردو، پنجابی، سندھی، بنگالی، آسامی اور انگریزی میں قابل لحاظ کام ہوا ہے۔ آپ منٹو، راجندر سنگھ بیدی (اردو)، انتظار حسین (اردو)، بھیشم ساہنی (ہندی)، کملیشور (ہندی)، راہی معصوم رضا (ہندی)، نارائن بھارتی (سندھی) سنت سنگھ سکھوں (پنجابی)، نریندر ناتھ مشرا (بنگالی)، سید ولی اللہ (بنگالی)، للیتا مبیکا انتھ راجنم (ملیالم) امیتو گھوش (انگریزی) اور باپسی سدھوا (انگریزی) جیسے ادیبوں کو پڑھنا چاہیں گے۔ امرتا پریتم، فیض احمد فیض اور دنیش داس نے بالترتیب پنجابی، اردو اور بنگالی میں تقسیم ملک پر یادگار نظمیں تحریر کی ہیں۔ آپ رتوک گھٹک (میگھے ڈھا کہ تارا اور سوپر بانا ریکھا) ایم۔ ایس ستھیو (گرم ہوا)، گووند نہلانی (تمس) کی ہدایت کاری پر بنی فلمیں اور حبیب تنویر کی ہدایت کاری میں پیش کیے گئے ڈرامہ ''جن نے لاہور نہیں دیکھا او جمائے نئی'' (جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا) بھی شاید دیکھنا چاہیں گے۔

بحث کیجیے........

تقسیم ملک سے آپ کی ریاست یا کسی پڑوسی ریاست پر کیا اثر پڑا؟ معلوم کیجیے کہ اس سے علاقے کے مرد و زن کی زندگیاں کس طرح متاثر ہوئیں اور انھوں نے حالات کا کس طرح سامنا کیا؟

7. مدد، انسانیت، ہم آہنگی
(HELP, HUMANITY, HARMONY)

تشدد کے ملبے اور تقسیم ملک کے درد کے نیچے مدد، انسانیت اور ہم آہنگی کی ایک عظیم تاریخ دفن ہے۔ عبدالطیف کے دردناک وپُر اثر بین ثبوت جیسے بہت سے بیانات سے یہ سب آشکار ہوتا ہے۔ مؤرخین نے اس سلسلے کی بہت سی کہانیاں تلاش کی ہیں کہ کس طرح تقسیم ملک کے دوران لوگوں نے ایک دوسرے کی مدد کی۔ یہ ہمدردی اور حصہ داری نئے مواقع کے آغاز اور صدمات پر فتح کی کہانیاں ہیں۔

اس لحاظ سے خوشدیو سنگھ کا کام ہمارے لیے ایک مثال ہے۔ ڈاکٹر خوشدیو سنگھ ٹی بی (تپ دق) کے ماہر ایک سکھ ڈاکٹر تھے جو اس زمانے میں دھرم پور میں تعینات تھے۔ یہ موجودہ دور میں ہماچل پردیش میں ہے۔ دن رات اپنے کام میں مشغول ہو کر ڈاکٹر صاحب نے لاتعداد مہاجر مسلمانوں، سکھوں، ہندوؤں کو بغیر کسی تعصب کے تسکین کا ایک لمس، کھانا، پناہ، پیار اور تحفظ مہیا کرایا۔ دھرم پور کے باشندوں میں ان کے جذبہ انسانی اور فیاضی کے تئیں ایک قسم کا یقین و اعتماد پیدا ہو گیا جیسا کہ دہلی اور دیگر جگہوں کے مسلمانوں کا گاندھی جی پر تھا۔ ان میں سے ایک، محمد عمر نے خوشدیو سنگھ کو لکھا ''بڑی عاجزی کے ساتھ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے علاوہ کسی اور کے تحت خود کو محفوظ محسوس نہیں کرتا۔ اس لیے انتہائی مہربانی کے ساتھ میرے لیے اچھا ہوگا کہ آپ اپنے اسپتال میں مجھے ایک سیٹ مرحمت فرمادیں۔''

اس ڈاکٹر کے سخت محنت طلب کام کے متعلق ہم ان کی آپ بیتی بعنوان ''محبت نفرت سے زیادہ طاقتور'' (Love is Stronger than Hate) ہے: 1947 کی یادیں:

ماخذ 8

انگوروں کی ایک چھوٹی ٹوکری
(A small basket of grapes)

ڈاکٹر خوشدیو سنگھ 1947 میں اپنے کراچی کے دورے کے دوران ہوئے اپنے تجربہ کے متعلق لکھتے ہیں:

میرے دوست مجھے ہوائی اڈے پر ایک کمرے میں لے گئے جہاں ہم سب بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے...... (اور) ساتھ ہی دوپہر کا کھانا کھایا مجھے کراچی سے رات ڈھائی بجے لندن کے لیے روانہ ہونا تھا......شام پانچ بجے...... میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ انھوں نے بڑی فراخدلی سے مجھے اپنا وقت دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے ساری رات رکنے کی امید کرنا مناسب نہ ہوگا اور میں نے انھیں مشورہ دیا کہ خود تکلیف نہ اٹھائیں، لیکن کوئی بھی شخص رات کے کھانے تک مجھے چھوڑ کر نہیں گیا...... پھر انھوں نے کہا کہ وہ لوگ جا رہے ہیں اور میں جہاز پر سوار ہونے سے قبل تھوڑا آرام کرلوں...... میں رات میں پونے دو بجے اٹھا اور جب میں نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب ابھی تک وہیں پر تھے......وہ سب میرے ساتھ جہاز تک گئے اور میری روانگی سے قبل انگوروں کی ایک چھوٹی ٹوکری مجھے تحفے میں دی۔ میرے ساتھ پیار کے امنڈتے جذبات کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا گیا تھا اور یہاں ٹھہرنے سے مجھے جو خوشی ملی تھی اس کے اظہار تشکر کے لیے میرے پاس الفاظ نہ تھے۔

شکل 14.14
ہر جگہ پناہ گزینوں کے کیمپ لوگوں سے بھرے پڑے تھے جن کو صرف کھانا اور چھت ہی کی ضرورت نہ تھی بلکہ پیار اور دردمندی کی بھی حاجت تھی۔

(A Remembrance of 1947) سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس میں یہاں ڈاکٹر سنگھ اپنے کام ک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک انسان ہونے کے ناطے میری ساتھی انسانوں کے لیے اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے یہ حقیر سی کوشش تھی۔''انھوں نے 1947 میں دو مختصر دوروں کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پرانے دوستوں اور دھرم پور میں جن کی انھوں نے مدد کی تھی ان کے ساتھ کراچی ہوائی اڈے پر یادگار گھنٹے گزارنے کا موقع ملا۔ پہلے کے شناسا چھی پولس والے ان کے ساتھ جہاز تک گئے اور جب وہ جہاز میں داخل ہوئے تو انھوں نے سلامی دی۔ ''میں نے ہاتھ جوڑ کر اظہار تشکر (سلامی) کیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''

بحث کیجیے

اس ضمن میں مزید معلوم کیجیے کہ کس طریقے سے لوگوں نے تقسیم ملک کے دوران ایک دوسرے کی مدد کی اور لوگوں کی جان بچائی تھی۔

8. زبانی شہادتیں اور تاریخ

(ORAL TESTIMONIES AND HISTORY)

کیا آپ نے اس مواد پر غور کیا ہے جن کی مدد سے اس باب میں تقسیم ملک کی تاریخ کی تعمیر یعنی تحریر کیا گیا ہے۔ زبانی بیانات، یادداشتیں، ڈائریاں، خاندانی تاریخیں، براہ راست لکھی گئیں رودادیں — ان سب سے تقسیم ملک کے دوران عام لوگوں کی دشواریاں اور سخت مصائب کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ لاکھوں افراد نے تقسیم ملک کو تکالیف اور چیلنجوں کے دور کی شکل میں دیکھا۔ ان کے لیے یہ صرف ایک آئینی تقسیم یا مسلم لیگ، کانگریس اور دیگر کی جماعتی سیاست ہی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے معنی زندگی میں غیر متوقع تبدیلیاں تھیں۔ 1946 اور 1950 کے درمیان اور آئندہ بتدریج واضح ہونے والی نفسیاتی، جذباتی اور سماجی تبدیلیوں سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

ذاتی یادداشتوں — ایک قسم کا زبانی ماخذ — کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہمیں تجربات اور یادداشتوں کو تفصیل سے گرفت میں لینے میں مدد دیتے ہیں۔ ان سے مؤرخین کو تقسیم ملک جیسے واقعات کے دوران لوگوں کے ساتھ ہونے والے معاملات، کے متعلق غنی مشمولات کی ترکیب اور جاندار رودادوں کو تحریر کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ سرکاری دستاویزات سے اس قسم کی اطلاعات حاصل کرنا ناممکن ہے۔ سرکاری دستاویزات پالیسی اور سیاسی جماعتی معاملات اور مختلف سرکاری کفالت پر مبنی اسکیموں سے بحث کرتی ہیں۔ تقسیم ملک کے معاملے میں سرکاری رپورٹوں اور فائلوں کے ساتھ ہی اعلیٰ سرکاری افسران کی ذاتی تحریروں سے انگریزوں اور اہم سیاسی پارٹیوں کے مابین ہندوستان کے مستقبل یا پناہ گزینوں کی بازآبادکاری کے متعلق بات چیت پر کافی روشنی پڑتی ہے تاہم ان سے ملک کی تقسیم کے لیے حکومت کے فیصلے سے متاثر ہونے والوں کے معمول کے مطابق تجربات کے بارے میں بہت کم پتہ چلتا ہے۔

زبانی تاریخ مؤرخین کو اس بات کی بھی اجازت دیتی ہے کہ وہ غریب اور عاجز لوگوں — یعنی جیسے: عبداللطیف کے والد، تھوآ خالصہ کی خواتین، وہ پناہ گزیں جو حقیر زندگی کے لیے گیہوں کی خالی بوریاں جس میں گیہوں آتا تھا بیچ کر روزی روٹی کا سامان کرنے کے لیے مجبور اور تھوک داموں پر خردہ گیہوں فروخت کرنے والے بہار میں بننے والی سڑک پر کام کے بوجھ سے دوہری ہوتی ہوئی ایک متوسط طبقے کی بنگالی بیوہ، ایک پشاوری تاجر جس کے خیال میں ہندوستان میں ہجرت کرنے کے بعد کٹک میں چھوٹی موٹی نوکری غضب کی چیز تھی، لیکن اس نے پوچھا تھا ''کٹک کہاں ہے یہ ہندوستان کے اوپری حصے میں ہے یا نچلے حصے میں، پشاور میں تو ہم نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سنا؟''

فراموش کردہ زندہ تجربات سے بازیابی کے ذریعہ ان کے متعلقہ مضمون کی حدود کو وسعت دیں۔ اس طرح خوشی اور معروف لوگوں کی کارروئیوں سے آگے جاتے ہوئے تقسیم ملک کی زبانی تاریخ ایسے مرد و خواتین کے تجربات کا تفصیلی جائزہ لینے میں کامیاب رہی ہے جن کو اب تک نظر انداز کیا جاتا تھا، عمومیت کے سبب خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا یا جن کا ذکر صرف رائج الوقت روش میں بس چلتے چلتے کیا جاتا تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کیونکہ جو تاریخیں ہم پڑھتے ہیں اس میں عوام کی زندگی اور کاموں کو ماضی میں اکثر ناقابل رسائی یا غیر اہم سمجھا جاتا تھا۔

ابھی تک بہت سے مؤرخین زبانی تاریخ کو شک پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ یہ اس کو خارج کرتے ہیں کیونکہ زبانی اعداد و شمار ان کو ٹھوس ثبوت نہیں معلوم ہوتے اور تاریخ وار ترتیب کا جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ مبہم لگتا ہے۔ مؤرخین کی دلیل ہے کہ ذاتی تجربوں کی جو ندرت ہے اس کے ذریعہ تعمیم (چند مثالوں سے نتیجہ اخذ کرنا) کرنا مشکل امر ہے یعنی اسی طرح کی چھوٹی شہادتوں سے ایک بڑی تصویر نہیں بنائی جاسکتی۔ وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ زبانی روداد اوپری مسائل سے تعلق رکھتی ہے اور چھوٹے چھوٹے نجی تجربات جو یادوں میں باقی رہتے ہیں تاریخ کے وسیع عمل کی پرتیں کھولنے کے لیے بے معنی ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم اور جرمنی میں قتل عام جیسے واقعات کے تعلق سے پریشانی و بدحالی کی مختلف شکلوں کا جو لاتعداد لوگوں نے سامنا کیا ہے اس کے متعلق یہاں شہادتوں کی کمی نہیں ہے۔ لہٰذا ر حجانات کی شناخت کرنے اور استثنا نشان زد کرنے کے لیے شہادت وافر مقدار میں موجود ہی

ہے۔ زبانی یا تحریری بیانات کے موازنہ کے ذریعہ ان سے حاصل نتائج کو دیگر ماخذوں سے نکلے ہوئے نتائج کے ساتھ تصدیق کر کے اور اندرونی تضادات کے متعلق خبردار رہتے ہوئے مؤرخین پیش کردہ شہادت کے قابل اعتبار ہونے کو تول سکتے ہیں۔ مزید برآں اگر تاریخ کو عام اور کمزور لوگوں کی موجودگی کے لیے ہم آہنگ کرنا ہے تو پھر تقسیم ملک کی تاریخ اوپری معاملات کے ساتھ متعلق نہیں ہے۔ تقسیم ملک کے تجربات کہانی کے مرکزی حصے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ دیگر ماخذوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ مختلف قسم کے سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے الگ طرح کے ماخذوں کو تلاش کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر سرکاری رپورٹیں ہمیں ہندو و پاک حکومتوں کے ذریعہ بڑی تعداد میں ''بازیاب'' کی گئیں خواتین کی باہمی تبادلہ کے متعلق تو بتاتی ہیں لیکن اپنی تکالیف کے متعلق جو انھوں نے جھیلی تھیں، صرف وہ عورتیں ہی بتائیں گی۔

ہمیں پوری طرح آگاہ ہونا ہوگا کہ تقسیم ملک کے ضمن میں زبانی اعداد و شمار خود بخود یا آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ انھیں انٹرویو کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور حکمت عملی کے ساتھ کامل ذہنی ہم آہنگی کو باہم ملانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تناظر میں سب سے پہلی مشکل یہ ہے کہ اصل کردار نجی تجربات کی شدت کے متعلق بات کرنے کے لیے خواہش مند ہی نہ ہوں تو مثال کے طور پر کوئی عورت جس کے ساتھ زنا بالجبر ہوا تھا بالکل اجنبی شخص کے سامنے اس سانحہ کا انکشاف کرنا کیوں چاہے گی؟ انٹرویو لینے والے شخص کا عموماً نجی صدمات کے متعلق تفتیش کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ انھیں تفصیلی اور بامعنی اعداد و شمار یا معلومات حاصل کرنے سے قبل انٹرویو دینے والے کے ساتھ قابل لحاظ میل جول قائم کرنا ہوگا۔ اس کے بعد یادداشت کا مسئلہ آتا ہے۔ کسی واقعہ کے متعلق جب کچھ دہائی کے بعد انٹرویو لیا جاتا ہے تو لوگ کیا یاد رکھتے ہیں اور کیا بھول جاتے ہیں؟ یہی جزوی طور پر درمیانی سالوں میں ان کے تجربات پر منحصر کرے گا اور ان سالوں میں ان کے فرقے اور ملکوں کے ساتھ کیا واقع ہوا۔ زبانی مؤرخین کو تقسیم ملک کے ''حقیقی'' تجربات کو ''تعمیر شدہ'' یادداشتوں کے جال سے نکال کر جانچنے کے لیے چشم نمائی کرنے والے ایک مشکل کام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تقسیم ملک کا ایک جامع بیان تیار کرنے کے لیے بہت سے مختلف قسم کے ماخذی مواد کا استعمال کرنا ضروری ہے تا کہ ہم اسے نہ صرف ایک واقعہ اور طریقۂ عمل کے طور پر دیکھ سکیں بلکہ ان لوگوں کے تجربات کی بھی تفہیم کر سکیں جو اس دہشت ناک دور سے گزرتے ہوئے زندہ رہ گئے تھے۔

شکل 14.15

نہ تو ہر شخص گاڑی میں سفر کر سکتا تھا اور نہ ہی ہر ایک شخص پیدل چل سکتا تھا ......

ٹائم لائن

1930	اردو شاعر محمد اقبال نے متحدہ مبہم ہندوستانی وفاق کے اندر ایک خودمختار اکائی ''شمال مغربی ہندوستانی مسلم ریاست'' کی ضرورت کے لیے کہا
1933	کیمبرج یونیورسٹی کے ایک پنجابی مسلم طالب علم چودھری رحمت نے پاکستان یا پاک ہندوستان کا نام وضع کیا
1937-39	برطانوی ہندوستان کے 11 میں سے 7 صوبوں میں کانگریس کی وزارت اقتدار میں آئی
1940	لاہور اجلاس میں مسلم لیگ نے مسلم اکثریت والے علاقوں کے لیے ایک مقدار میں خودمختاری کا مطالبہ کرتے ہوئے قرارداد پیش کی
1946	صوبوں میں الیکشن منعقد ہوئے۔ عام انتخابی حلقوں میں کانگریس نے زبردست فتح حاصل کی اور مسلم سیٹوں پر مسلم لیگ کو شاندار کامیابی ملی
مارچ تا جون	برطانوی کابینہ نے تین ممبران پر مشتمل ایک کیبنٹ مشن دہلی بھیجا
اگست	مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے ''ڈائریکٹ ایکشن'' کے حق میں فیصلہ لیا
16 اگست	کلکتہ میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تشدد پھوٹ پڑا۔ کئی دن جاری اس تشدد میں ہزاروں لوگ مارے گئے
مارچ 1947	کانگریس اعلیٰ کمان نے پنجاب کو دو حصوں مسلم اکثریت ہندو۔ سکھ اکثریت والے حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے ووٹ دیا اور بنگال میں بھی اسی طرح کے اصول کو اپنانے کے لیے کہا، انگریزوں نے ہندوستان چھوڑنا شروع کر دیا
14-15 اگست 1947	پاکستان کی تشکیل ہوئی: ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی۔ گاندھی جی نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی بحال کرنے کے لیے مشرقی بنگال میں نواکھالی کا دورہ کیا۔

100 سے 150 لفظوں میں جواب دیجیے:

1۔ 1940 کی اپنی قرارداد کے ذریعہ مسلم لیگ نے کیا مطالبہ کیا تھا؟

2۔ کچھ لوگ ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ تقسیم ملک ایک اتفاقی واقعہ تھا؟

3۔ تقسیم ملک کو عام لوگ کس طرح سے دیکھتے تھے؟

4۔ تقسیم ملک کے خلاف گاندھی جی کے دلائل کیا تھے؟

5۔ تقسیم ملک کو جنوب ایشیائی تاریخ میں ایک انتہائی اہم یادگار علامت کے طور پر کیوں دیکھا جاتا ہے؟

مندرجہ ذیل پر ایک مختصر مضمون (250 سے 500 الفاظ پر مشتمل) لکھیے:

6۔ برطانوی ہندوستان کی تقسیم کیوں کی گئی؟

7۔ تقسیم ملک کے دوران عورتوں کے تجربات کیسے رہے؟

8۔ تقسیم ملک کے نظریات پر کانگریس کی سوچ میں کس طرح تبدیلی آئی؟

9۔ زبانی تاریخ کی خصوصیات اور محدودات کی جانچ کیجیے۔ زبانی تاریخ کی تکنیک تقسیم ملک کی تفہیم کس طرح کرتی ہیں؟

نقشہ کا کام

10۔ جنوبی ایشیا کے نقشے پر کیبنٹ مشن کی تجاویز کے حصہ 'a'، 'b' اور 'c' کو نشان زد کیجیے۔ یہ نقشہ جنوبی ایشیا کے موجود نقشے سے کس طرح مختلف ہے؟

پروجیکٹ (کوئی ایک)

11۔ وہ نسلی تشدد جو یوگوسلاویہ کی تقسیم کا سبب بنا، اس کے متعلق پتہ لگائیے۔ اپنے نتائج کا موازنہ اس باب میں تقسیم ملک سے متعلق جو آپ نے پڑھا ہے اس کے ساتھ کیجیے۔

12۔ معلوم کیجیے کہ کیا آپ کے شہر، قصبہ، گاؤں اور قرب وجوار کے کسی مقام پر کسی فرقہ نے ہجرت کی ہے۔ (ہوسکتا ہے کہ آپ کے علاقے میں وہ لوگ بھی رہتے ہوں جو تقسیم ملک کے دوران ہجرت کر کے آئے تھے)۔ اس طرح کے فرقوں کے ممبران کا انٹرویو لیجیے اور اپنے نتائج کا خلاصہ ایک رپورٹ میں درج کیجیے۔ لوگوں سے ان کے آنے والے مقام کے متعلق پوچھیے، ان کی ہجرت کے اسباب اور ان کے تجربات کے بارے میں معلوم کیجیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتہ لگائیے کہ ان کی اس ہجرت کے نتیجے میں اس علاقے میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

جودھرا باگچی اور سوبھورنجن داس گپتا (مرتبہ) 2003۔
دی ٹراوما اینڈ دی ٹریمف: جینڈر اینڈ پارٹیشن ان ایسٹرن انڈیا
اسٹری، کولکاتہ

آلوک بھلا (مرتبہ) 1994
اسٹوریز اباؤٹ دی پارٹیشن آف انڈیا،
جلد اول، دوم، سوم
انڈس (ہارپر کولنس)، نئی دہلی

اروشی باٹالیہ، 1998
دی اور سائڈ آف سائلینس وائسس فرام دی پارٹیشن آف انڈیا
وائکنگ (پینگوئن بکس)، نئی دہلی

مشیر الحسن (مرتبہ) 1996
انڈیاز پارٹیشن
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی

گیانیندر پانڈے، 2001
ریممبرنگ پارٹیشن: وائلینس نیشنلزم اینڈ ہسٹری ان انڈیا
کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج

انیتا اندر سنگھ، 2006
دی پارٹیشن آف انڈیا
نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی

5282CH15

موضوع
پندرہ

دستور کی تشکیل

ایک نئے عہد کا آغاز

ہندوستانی دستور یا آئین جسے 26 جنوری 1950 سے عمل میں لایا گیا دنیا میں سب سے طویل آئین ہونے کی خصوصیت کا حامل ہے۔ جب ہم ملک کے حجم اور تنوع کو ملحوظ رکھیں تب شاید اس کی طوالت اور پیچیدگی ہمارے لیے قابل فہم ہو سکے۔ آزادی کے وقت ہندوستان نہ صرف وسیع اور متنوع بلکہ گہرے طور پر منقسم بھی تھا۔ لہٰذا ایک دستور کا خاکہ، ملک کو متحد رکھنے کے لیے اور آگے لے جانے کے لیے ہوشیاری سے طے کردہ تفصیلات اور لگن کے ساتھ تحریر کردہ دستاویز کی شکل میں تفصیلی طور پر تیار کرنا ضروری تھا۔ ایک عمل کے لیے اس آئین نے ماضی اور حال کے زخموں کو بھرنے اور مختلف طبقوں، ذاتوں اور فرقوں کے ہندوستانیوں کو ایک مشترک سیاسی تجربے میں مربوط کرنے کی کوشش کی۔ مزید یہ کہ، اس آئین نے طویل عرصے سے مروّج نظام مراتب اور پاس ولحاظ کے تہذیب وثقافت میں جمہوری اداروں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔
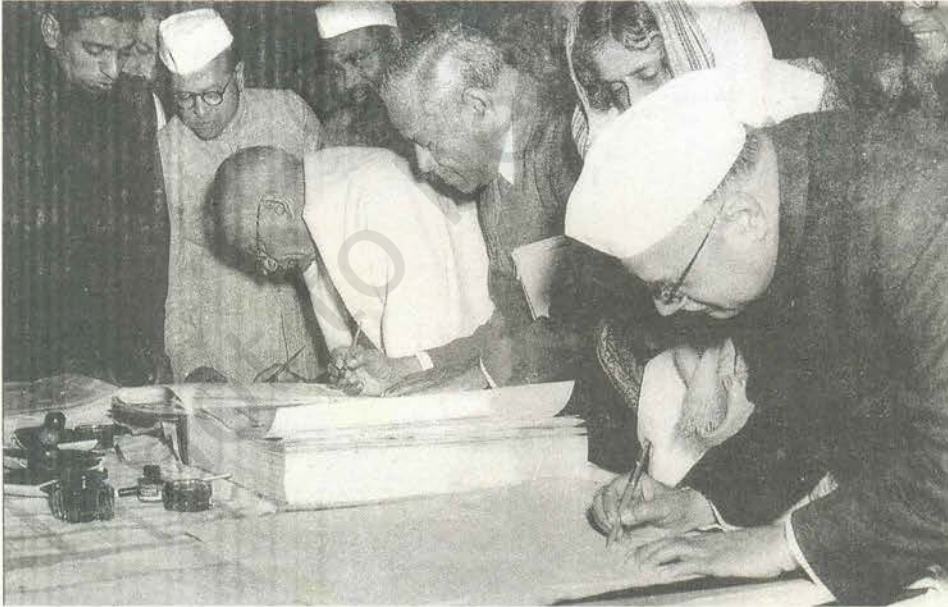
شکل 15.1

تین سال کے بحث و مباحثہ کے بعد دسمبر 1949 میں آئین پر دستخط کیے گئے

ہندوستانی آئین کی تشکیل دسمبر 1946 اور دسمبر 1949 کے درمیان ہوئی۔ اس دوران ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں اس کے مسودے کی یکے بعد دیگرے شق پر بحثیں ہوئیں۔ کل ملا کر اسمبلی کے گیارہ اجلاس منعقد ہوئے جو 165 دن کی نشستوں پر مشتمل تھے۔ ان اجلاس کے دوران مختلف کمیٹیوں اور ذیلی کمیٹیوں کے ذریعہ مسودے پر نظر ثانی کا کام ہوتا رہا۔

علم سیاسیات کی نصابی کتاب کے مطالعہ سے آپ واقف ہو چکے ہوں گے کہ ہندوستان کا آئین کیا ہے اور آزادی کے بعد کی دہائیوں میں اس آئین نے کس طرح بندوبست کیا ہے۔ یہ باب آپ کو آئین کی تشکیل کے سلسلے میں جو تاریخ پیچھے چھوڑی ہے اور وہ پرزور بحث و مباحثہ جو اس کی تشکیل کا حصہ رہے ہیں، ان سے متعارف کرائے گا۔ اگر ہم آئین ساز اسمبلی کے اندر اٹھنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کریں تو ہمیں اس طریقۂ عمل کا ایک خاکہ مل جائے گا جن کے ذریعہ آئین کی تشکیل ہوئی اور ایک نئے ملک کا تصور تشکیل پایا۔

1. ہنگامہ خیز دور (A TUMULTUOUS TIME)

آئین کی تشکیل سے پیشتر کے سال غیر معمولی طور پر ہنگامہ خیز تھے، یہ عظیم امیدوں کے ساتھ ہی نفرت انگیز مایوسی کا دور بھی تھا۔ 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد تو کر دیا گیا لیکن تقسیم بھی کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں 1942 کی ہندوستان چھوڑ وتحریک کی جدوجہد کی یادیں تازہ تھیں جو شاید برطانوی راج کے خلاف سب سے وسیع تحریک تھی۔ اس کے ساتھ ہی غیر ملکی مدد سے مسلح جدوجہد کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کے لیے سبھاش چندر بوس کے ذریعہ برطانوی حکومت کو دی گئی للکار بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ تھی۔ 1946 کے موسم بہار میں بمبئی اور دیگر شہروں میں رائل انڈین نیوی (Royal Indian Navy) کے غیر کمیشن یافتہ ملاحوں (سپاہیوں) کی بغاوت جو زیادہ قریبی بغاوت تھی، سپاہیوں کے تئیں عوامی ہمدردی کو ابھار رہی تھی۔ 1940 کی دہائی کے آخری سالوں میں ملک کے مختلف حصوں میں معینہ وقفوں سے منتشر مزدوروں اور کسانوں کے عمومی احتجاجات بھی ہو رہے تھے۔

شکل 15.2
غارتگری اور تباہی کی تصاویر آئین ساز اسمبلی کے ممبران کو مسلسل متاثر کرتی رہیں۔

ان عوامی شورشوں کی جاذب نظر خصوصیت ہندو مسلم اتحاد کا شدید مظاہرہ تھا۔ اس کے برخلاف دو نمایاں ہندوستانی سیاسی پارٹیاں مذہبی مفاہمت اور سماجی ہم آہنگی کے متعلق کسی تصفیہ پر پہنچنے میں بار بار ناکام ہو رہی تھیں۔ اگست 1946 میں کلکتہ میں شروع ہونے والی عظیم ہلاکتوں کے ساتھ شمالی اور مشرقی ہندوستان میں تقریباً سال بھر تک فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ (دیکھیے باب

13 اور 14)۔ تشدد کی انتہا قتل عام کی شکل میں ہوئی جب ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کیا گیا جو آبادی کی منتقلی کا اعلان بھی تھا۔

15 اگست 1947 کو یوم آزادی پر جو خوشی اور امید کا اظہار کیا گیا وہ ان لوگوں کے لیے ناقابل فراموش تھا جو اس دور میں زندہ تھے، لیکن ہندوستان میں ان گنت مسلمانوں اور پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو ایذا رساں انتخاب کا سامنا کرنا تھا۔ ایک طرف یکا یک موت یا مواقع کا استحصال اور دوسری طرف اپنی قدیم جڑوں سے اکھڑ جانے کا جبراً سلوک لاکھوں پناہ گزیں حرکت پذیر تھے۔ مسلمان مشرقی اور مغربی پاکستان کی طرف تو ہندو اور سکھ مغربی بنگال اور پنجاب کے نصف مشرق کی طرف حرکت کر رہے تھے۔ بہت سے افراد اپنی منزل مقصود تک پہنچنے سے قبل ہی ہلاک ہو چکے تھے۔

شکل 15.3

14 اگست 1947 کی نصف شب میں جواہر لعل نہرو دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اس دن جواہر لعل نہرو نے اپنی تقریر مندرجہ ذیل سطروں کے ساتھ شروع کی

'' کافی عرصہ پہلے ہم نے تقدیر کے ساتھ ملاقات کرنے کا عہد کیا تھا اور اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہم اپنے عہد کو پورا کریں گے، نہ صرف مکمل طور پر یا پوری مقدار میں بلکہ بڑی حد تک پورا کریں گے''

نصف شب کی ساعت کی ضرب پر جب دنیا سو رہی ہے ہندوستان زندگی اور آزادی کے لیے بیدار ہو رہا ہے۔

نئے ملک کو ایک دوسرے اور بمشکل کم سنجیدہ مسئلہ کا سامنا تھا جو شاہی ریاستوں کا تھا۔ برطانوی حکمرانی کے دوران برصغیر کا تقریباً ایک تہائی علاقہ نوابوں اور مہاراجاؤں کے ماتحت تھا جو برطانوی تاج کی اطاعت قبول کر چکے تھے لیکن بہ لحاظ دیگر زیادہ تر کو انگریزوں نے اپنی قلمرو کو حسب منشا حکمرانی کرنے یا من مانی حکومت چلانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا کرتے تھے۔ جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑا تو ان نوابوں اور راجاؤں کی آئینی حیثیت مبہم بنی رہی۔ ایک ہم عصر شاہد نے رائے زنی کی تھی کہ کچھ مہاراجاؤں نے تو اب بہت سے حصوں میں تقسیم ہند کے بعد آزاد اقتدار کے پراگندہ خوابوں میں عیش کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں دستور ساز اسمبلی اجلاس کر رہی تھی۔ باہر جو کچھ واقع ہو رہا تھا اس سے آئین ساز اسمبلی کے اندر ہونے والے بحث و مباحثے کس طرح الگ رہ سکتے تھے؟

1.1 دستور ساز اسمبلی کی تشکیل

(The making of the Constituent Assembly)

1946 کے صوبائی الیکشن کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کے ممبران کا انتخاب کیا گیا۔ برطانوی ہندوستان کے صوبوں کے ذریعہ بھیجے گئے ممبران کے علاوہ اسمبلی میں شاہی ریاستوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ انھیں اس لیے بھیجا گیا تھا کیونکہ یہ ریاستیں بھی یکے بعد دیگرے ہندوستانی اتحاد میں شامل ہو چکی تھیں۔ مسلم لیگ نے ابتدائی اجلاسوں (یعنی جو 15 اگست 1947 سے قبل منعقد ہوئے تھے) کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا یہ اجلاس ایک واحد پارٹی کی نمائش بن گئے اس لیے کہ کل ممبران میں 82 فی صد ممبران کانگریس پارٹی کے تھے۔

کانگریس بذات خود ایک وسیع محاذ رکھتی تھی اس کے ممبران بھی آرا کا ایک وسیع سلسلہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ ملحد اور سیکولر تھے اور دیگر (ایک اینگلو انڈین ممبر فرینک اینتھونی کے الفاظ میں) تکنیکی طور سے کانگریس کے لیکن روحانی سطح پر آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا کے ممبر تھے۔ بعض اپنے معاشی فلسفہ میں سوشلسٹ (اشتراکی) تھے تو دیگر چند زمین داروں کے حقوق کے محافظ تھے۔ اندرونی تنوع کے علاوہ کانگریس نے مختلف ذاتوں اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے آزاد ممبران اور خواتین کو بھی نامزد کیا تھا۔ اس نے خاص طور پر آئین ساز اسمبلی میں ماہرین قانون کو لانے کی کوشش کی۔ دستور (آئین) ساز اسمبلی کے اندر واقع ہونے والے شدید بحث ومباحثہ سے آرا کے تنوع کی عکاسی ہوتی ہے۔

ایسے وقت میں جب کہ دستور ساز اسمبلی میں غور وفکر جاری تھا تو فریقین کے دلائل اخبارات میں شائع ہوا کرتے اور تجاویز پر عوامی مباحثے بھی ہوتے تھے۔ پریس (اخبارات) میں ہونے والی تنقید اور جوابی تنقید سے واضح مسائل پر باری باری بننے والی عمومی اتفاق رائے کی نوعیت بالآخر ایک قالب تک پہنچ جاتی تھی۔ بہ لحاظ ترتیب اجتماعی شرکت داری کا شعور پیدا کرنے کے لیے عوام سے ان کی رائے بھی پیش کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ اس ضمن میں سینکڑوں جوابی ردعمل سامنے آئے۔ ان میں سے چند نمونوں سے یہ اشارے ملے کہ قانون سازوں کو کتنے باہم مخالف مفادات زیر غور لانے تھے۔ اسی طرح، آل انڈیا ورن آشرم سوراجیہ سنگھ (کلکتہ میں قائم) نے درخواست کی کہ ''آئین (دستور) قدیم ہندو کتابوں میں مذکورہ اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے۔'' گائے ذبح کرنے کی ممانعت اور مذبح خانوں کو بند کرنے کی خصوصی طور پر سفارش کی گئی۔ نچلی ذاتوں کے گروہ نے مطالبہ کیا کہ ''اعلی ذات کے لوگوں کے ذریعہ غلط رویے'' کا خاتمہ ہو اور ان کی آبادی کی بنیاد پر قانون

شکل 15.4
دستور ساز اسمبلی کا اجلاس
سردار ولبھ بھائی پٹیل دائیں سے دوسری سیٹ پر بیٹھے نظر آرہے ہیں۔

ساز اداروں، سرکاری محکموں اور مقامی اداروں وغیرہ میں علاحدہ نشستیں محفوظ ہوں'' لسانی اقلیتوں نے مادری زبان میں اظہار رائے کی آزادی اور لسانی بنیاد پر صوبوں کی از سر نو تقسیم'' کے لیے کہا۔ مذہبی اقلیتوں نے مخصوص حفظ ما تقدم کے لیے درخواست کی اور وزیانگرم کے ضلع ٹیچر کی گلڈ (انجمن) اور سینٹرل جیوش بورڈ آف بامبے نے درخواست کی کہ تمام عوامی اداروں بشمول قانون ساز اداروں وغیرہ میں ان کو مناسب نمائندگی'' ملنی چاہیے۔

1.2 ذی اثر آوازیں (The dominant voices)

دستور ساز اسمبلی میں کل ملا کر 300 ممبران تھے۔ ان میں سے چھ ممبران نے خاص طور پر اہم کردار ادا کیا، جن میں سے تین جواہر لعل نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرساد کانگریس کے نمائندے تھے۔ یہ نہرو ہی تھے جنھوں نے ''فیصلہ کن اہداف'' (مقاصد) قرارداد پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قرارداد میں تجویز کیا تھا کہ ہندوستان کا قومی پرچم ''زعفرانی، سفید اور گہرے ہرے رنگ کی مساوی تناسب کی وسیع متوازی پٹیوں کا ترنگا'' ہوگا جس کے درمیان میں نیلے رنگ کا دائرہ ہوگا۔ دوسری طرف پس پردہ زیادہ تر کام پٹیل کر رہے تھے۔ انھوں نے اہم کردار ادا کرتے ہوئے بہت سی رپورٹوں کے مسودے تحریر کیے اور باہم مخالف نقطۂ نظر میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کام کیے۔ راجندر پرساد کا کردار اسمبلی کے صدر کے طور پر تھا جہاں انھیں بحث و مباحثہ کے لیے تعمیری خطوط پر رہنمائی کرنی تھی اور اس دوران انھیں اس بات کو بھی یقینی بنانا تھا کہ تمام ممبران کو اپنی بات کہنے کے لیے موقع ملے۔

کانگریس کے اس مثلث کے علاوہ اسمبلی کے ایک انتہائی اہم ممبر، نامور وکیل اور ماہر معاشیات

بھیم راؤ امبیڈکر بھی تھے۔ برطانوی عہد حکمرانی کے دوران امبیڈکر کانگریس کے سیاسی مخالف رہے تھے، لیکن آزادی کے وقت گاندھی جی کے مشورے پر ان سے یونین کابینہ میں بطور وزیر قانون شامل کرنے کے لیے درخواست کی گئی۔ اس حیثیت سے انھوں نے دستور کی مسودہ ساز کمیٹی (Drafting Committee of the Constitution) کے چیئر مین (صدر نشین) کے طور پر کام کیا۔ ان کے ساتھ دو اور دیگر وکیل بھی کام کر رہے تھے جن میں ایک گجرات سے کے۔ ایم۔ منشی اور دوسرے الادی کرشنا سوامی ایّر مدراس سے تھے۔ دونوں نے ہی دستور کے مسودے میں فیصلہ کن اضافہ کیے۔

ان چھ ممبران کو دو انتظامی افسران بھی ناگزیر مدد دے رہے تھے جن میں ایک بی۔ این۔ راؤ تھے جو حکومت ہند کے آئینی مشیر تھے۔ انھوں نے دیگر ممالک میں رواج پذیر سیاسی نظاموں کے نزدیکی مطالعہ کی بنیاد پر توضیحی مقالوں کا ایک سلسلہ تیار کیا تھا۔ دوسرے افسر آئین کے خاص خاکہ ساز (قانون کا مسودہ مرتب کرنے والے) ایس۔ این۔ مکھر جی تھے جن کے متعلق امبیڈکر نے کہا تھا کہ ''ان کی نہایت پیچیدہ تجاویز کو انتہائی آسان اور نہایت واضح قانونی شکل میں رکھنے کی صلاحیت کا شاذ و نادر ہی کوئی برابری کر سکتا ہے۔''

امبیڈکر کے پاس اسمبلی کے ذریعہ آئین کے مسودہ کے انصرام کی ذمہ داری بھی تھی۔ اس کام میں کل ملا کر تین سال کا عرصہ لگا جس میں ہوئے بحث ومباحثہ کے طبع شدہ ریکارڈ گیارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔ حالانکہ یہ ایک لمبا طریقۂ عمل تھا تاہم انتہائی دلچسپ بھی تھا۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے گاہے بہ گاہے بڑی حد تک اپنے منتشر نقطۂ نظر واضح انداز میں پیش کیے۔ ان کی پیش کش کے اظہار میں ہم ہندوستان کے بہت سے باہم مخالف تصورات —— ہندوستانیوں کو کیسی زبان بولنی چاہیے، ملک کو کیسے سیاسی و معاشی نظاموں پر عمل کرنا چاہیے، اس کے شہریوں کو کس نوعیت کی اخلاقی اقدار کی توثیق کرنی چاہیے یا بری الذمہ ہونا چاہیے —— کا ادراک کر سکتے ہیں۔

بحث کیجیے.........

باب 13 اور 14 کو ایک بار پھر پڑھیے۔ بحث کیجیے کہ اس زمانے کے سیاسی حالات نے دستور ساز اسمبلی کے اندر بحث ومباحثہ کی نوعیت کو کس طرح قالب دیا ہوگا۔

شکل 15.5
بھیم راؤ امبیڈ کر ہندو کوڈ بل (Hindu Code Bill) پر بحث و مباحثہ کرتے ہوئے

2. آئین کی بصارت
(The Vision of the Constitution)

13 دسمبر 1946 کو جواہر لعل نہرو نے دستور اسمبلی میں ''اہداف قرارداد'' (Objectives Resolution) پیش کی۔ یہ عظیم اہمیت کی حامل قرارداد تھی جس میں آزاد ہندوستان کے آئین کے نصب العین کی توضیح کرتے ہوئے ایک خاکہ اور ایک بنیادی ڈھانچہ مہیا کرایا گیا تھا جس کے اندر رہ کر دستور سازی کا کام آگے بڑھانا تھا۔ اس میں ہندوستان کو ''آزاد خود مختار جمہوریہ'' اعلان کیا گیا تھا، اپنے شہریوں کو انصاف، مساوات اور آزادی کی ضمانت دی گئی تھی اور یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ''اقلیتوں، پسماندہ اور قبائلی علاقوں اور پست و خستہ حال اور دیگر پسماندہ طبقات کے لیے اطمینان بخش تحفظ مہیا کرایا جائے گا....'' ان مقاصد کی نشاندہی کرنے کے بعد نہرو نے ہندوستانی تجربے کو وسیع تاریخی تناظر میں پیش کیا جیسا کہ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایسے حقوق کی دستاویزات تیار کرنے کے لیے ان کا ذہن ماضی میں اس طرح کے کارناموں کی طرف جا رہا تھا۔

ماخذ 1

''ہم صرف نقل کرنے نہیں جا رہے ہیں''
("We are not going just to copy")

13 دسمبر 1946 کو جواہر لعل نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

میرا ذہن ماضی میں منعقد مختلف دستور ساز اسمبلیوں کی طرف جا رہا ہے جو بہت پہلے عظیم امریکی ملک کے دستور کی تشکیل کا کام انجام دے چکی ہیں جب امریکہ کے اکابرین قوم نے اس کو منظور کر کے رائج کر دیا تھا، جو اتنے سالوں، ڈیڑھ صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے کسوٹی پر پورا اترا ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک عظیم ملک بنا جو اسی آئین کی بنیاد پر تعمیر ہوا تھا۔ میرا ذہن ماضی میں اس انقلاب کی طرف جاتا ہے جو 150 سال پہلے واقع ہوا تھا اور اس دستور ساز اسمبلی کی طرف خیال جاتا ہے جو آزادی کے لیے اتنی ساری لڑائیاں لڑنے والے پیرس کے دلفریب اور خوبصورت شہر میں منعقد ہوئی تھی۔ اس دستور ساز اسمبلی نے کتنی مشکلات کا سامنا کیا اور کس طرح بادشاہ اور دیگر مختار کار حکومت اس کے راستے میں آئے اور یہ سب باتیں اب تک مسلسل میرے ذہن میں آرہی ہیں۔ ایوان یہ بات یاد رکھے گا کہ جب ایسی مشکلات آئیں اور حتیٰ کہ دستور ساز اسمبلی کو اجلاس منعقد کرنے کے لیے ایک کمرہ دینے سے انکار کر دیا گیا تو پھر انھوں نے خود ایک کھلے ٹینس میدان میں نشست کر کے اجلاس کیا تھا اور حلف لیا تھا جسے ٹینس کورٹ کا حلف کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بادشاہ اور دیگر لوگوں کی رکاوٹوں کے باجود اپنی میٹنگیں جاری رکھیں اور تب تک وہ وہاں سے منتشر نہیں ہوئے جب تک انھوں نے اپنا کام مکمل نہیں کر لیا۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ ہم بھی اسی باوقار حوصلے سے یہاں اجلاس (میٹنگ) کر رہے ہیں اور خواہ ہمارا اجلاس اس ہال میں ہو یا کسی دیگر ہال میں یا میدان میں ہو یا بازار میں ہو ہماری میٹنگیں تب تک جاری رہیں گی جب تک ہم اپنا کام مکمل نہیں کر لیں گے۔

اس موقع پر میرا دھیان حال ہی میں واقع ہونے والے ایک انقلاب کی طرف جاتا ہے جس سے ایک نئی قسم کی ریاست کا عروج ہوا۔ یہ انقلاب روس میں آیا تھا اور جس سے یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلک (Union of Soviet Socialist Republic) وجود میں آیا۔ ایک دیگر طاقتور ملک جو دنیا میں ایک غیر معمولی کردار ادا کر رہا ہے، نہ صرف ایک طاقتور ملک ہے بلکہ ہندوستان میں ہمارے لیے، ایک پڑوسی ملک بھی ہے۔

لہٰذا ہمارا دھیان ماضی کی عظیم مثالوں کی طرف جاتا ہے اور ان کی کامیابی سے ہمیں سیکھنے اور ناکامیوں سے گریز کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ممکن ہے ہم ان ناکامیوں سے گریز کرنے کے اہل نہ ہوں کیونکہ کسی بھی انسانی کوشش میں فطری طور پر جزوی ناکامی کی گنجائش موجود ہے، تاہم تمام رکاوٹوں اور پریشانیوں کے باوجود، مجھے یقین ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے اور اس خواب کو حاصل کر کے حقیقت آفریں بنائیں گے جو ہم ایک طویل عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔

ہمارا کہنا ہے کہ ایک آزاد خود مختار جمہوریہ بننے کے لیے ہمارا یہ پختہ اور باوقار فیصلہ ہے۔ ہندوستان کا ایک خود مختار ملک ہونا طے شدہ ہے، اس کا آزاد ہونا اور جمہوریہ بننا یقینی ہے......اب کچھ دوستوں نے سوال اٹھایا ہے کہ آپ نے یہاں ''جمہوریت'' لفظ کیوں نہیں رکھا؟ ٹھیک ہے، میں نے ان سے کہا کہ بے شک یہ قابل فہم کہ کوئی جمہوریہ جمہوریت نہ ہو لیکن ہمارا پورا ماضی اس بات کا گواہ ہے کہ ہم جمہوری اداروں کے ہی طرفدار ہیں۔ واضح طور پر ہمارا مقصد جمہوریت ہے، جمہوریت نے دنیا کی ترقی میں عظیم کردار ادا کیا ہے ان میں سے بہت سی یوروپ میں اور دیگر جگہوں میں ہیں۔ تاہم یہ مشتبہ ہو سکتا ہے کہ اگر انھیں طویل عرصہ تک مکمل طور پر جمہوریت بنے رہنا ہے تو نہ جانے کب ان کو اپنی شکل کسی قدر تبدیل کرنی پڑے۔ مجھے یقینی ہے کہ یقین جمہوری طریقۂ عمل یا نام نہاد جمہوری ملک کے ایک ادارے کی ہم صرف نقل کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان پر اضافہ کر سکیں۔ بہر حال، ہم یہاں کیسا ہی نظام

حکومت قائم کریں وہ ہمارے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگ اوران کے لیے قابل قبول ضرور ہونا چاہیے۔ ہم جمہوریت کی حمایت کررہے ہیں۔ یہ بات اس ایوان کو طے کرنی ہوگی کہ جمہوریت یعنی پوری طرح مکمل جمہوریت کی شکل کیا ہوگی۔ مجھے امید ہے ایوان نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ اس قرارداد میں اگرچہ ہم نے لفظ ''جمہوریت'' کا استعمال نہیں کیا ہے کیونکہ ہم سوچتے ہیں کہ یہ فطری ہے کہ لفظ ''جمہوریت'' میں وہ لفظ اندر سمایا ہوا ہے اور ہم غیر ضروری اور بے کار الفاظ کا استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ ہم لفظ استعمال کرنے کے بجائے اس سے کہیں زیادہ کر چکے ہیں۔ ہم نے اس قرارداد میں جمہوریت کا متن پیش کیا ہے اور نہ صرف یہ کہ جمہوریت کا متن بلکہ اگر میں کہوں تو اس قرارداد میں معاشی جمہوریت کا متن بھی پیش کیا ہے۔ دیگر لوگوں کو شاید اس بات پر اعتراض ہو کہ تم نے اس قرارداد میں ہندوستان کو ایک سوشلسٹ (اشتراکی) ملک بنانے کا ذکر نہیں کیا۔ ٹھیک، میں اشتراکیت (Socialism) کا حمایتی ہوں اور مجھے امید ہے ایک دن ہندوستان بھی اشتراکیت کا حمایتی ہوگا اور وہ ہندوستان ایک اشتراکی ریاست کے آئین کی طرح چلے گا اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن پوری دنیا اسی راستے پر چلے گی۔

دستور ساز اسمبلی مباحثہ (سی اے ڈی) جلد اول

ٹینس کورٹ کا حلف

ماخذ 1 میں اہداف (مقاصد) قرارداد میں اصطلاح جمہوریت کا استعمال نہ کرنے کے لیے جواہر لعل نہرو نے کیا توضیح پیش کی؟

نہرو کی تقریر (ماخذ 1) کی خوبیوں کی محتاط انداز میں تفتیش کرنی ہوگی۔ یہاں صحیح طور پر کیا بیان کیا گیا ہے؟ نہرو کی بظاہر ماضی کی حسرت ناک یادوں کی طرف واپسی کی ترجمانی سے کیا پتہ چلتا ہے؟ آئین کی بصارت میں شامل تصورات کی اصل سے متعلق وہ کیا کہتے ہیں؟ ماضی کی طرف جاتے ہوئے اور امریکی وفرانسیسی انقلابات کا حوالہ دیتے ہوئے نہرو ہندوستان میں آئین کی تشکیل کی تاریخ کو حریت اور آزادی کے لیے جدوجہد کی طویل تاریخ سے منسوب کررہے ہیں۔ ہندوستانی تدبیر کی عظیم سرشت کو ماضی میں انقلابی لمحات سے مربوط کرنے کا اصرار کررہے ہیں۔ لیکن نہرو یہ مشورہ نہیں دیتے کہ وہ واقعات حال کے لیے کوئی منصوبہ کا خاکہ (Blueprint) مہیا کررہے ہیں یا کسی ان انقلابات کے تصورات کو بے شعوری ارادے کے مستعار لیا جاسکتا ہے اور ہندوستان میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔ وہ جمہوریت کی کسی مخصوص شکل کی توضیح اور تجویز نہیں کر رہے تھے کہ یہ بحث ومباحثہ اور غور وفکر کے ذریعہ طے ہوگی۔ انھوں نے تاکید کی کہ ہندوستان میں متعارف آئین کے نصب العین اور پیش بندیاں کیں اور یہ اخذ کی ہوئی نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا تھا ہم صرف نقل کرنے نہیں جارہے ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں حکومت کا جو بھی

نظام قائم ہو وہ ہمارے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگ اوران کے لیے قابل قبول ہونا چاہیے''۔مغرب کے لوگوں سے ان کے کارناموں اور ناکامیوں سے سیکھنا ضروری ہے لیکن مغربی ممالک کو بھی کہیں اور ہونے والے تجربات سے سیکھنا پڑا تھا اور انھیں جمہوریت کا اپنے خود کا تصور بھی تبدیل کرنا پڑا تھا۔ ہندوستانی آئین کا مقصد جمہوریت کے حریت پسند تصورات کی معاشی انصاف کے اشتراکی تصور کے ساتھ آمیزش کرنی ہوگی اور ہندوستانی تناظر کے اندر اُن تمام تصورات کو نئی وضع سے بنانا ہوگا اور نئے سرے سے مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔کیا نہرو کی دلیل حجت ہندوستان کے لیے موزوں ہے، اس کے متعلق تخلیقی انداز میں غور وفکر کرنے کے لیے تھی۔

2.1 عوامی خواہش (The will of the people)

دستور ساز اسمبلی کے ایک کمیونسٹ ممبر سومناتھ لاہری کو دستور ساز اسمبلی کے بحث ومباحثہ کے اوپر برطانوی سامراجیت کا سیاہ ہاتھ لٹکا ہوا نظر آتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر ممبران اور عام طور پر ہندوستانیوں سے سامراجی حکومت کے اثرات سے خود کو پوری طرح آزاد ہونے کے لیے اصرار کیا۔ 47-1946 کی سردیوں میں جب اسمبلی میں بحث ومباحثہ جاری تھا انگریز ہندوستان میں تھے۔ جواہر لعل نہرو کی سربراہی میں عارضی حکومت کا نظم ونسق قائم تھا لیکن یہ حکومت صرف وائسرائے اور لندن میں موجود برطانوی حکومت کی نگرانی کے تحت امور انجام دے سکتی تھی۔ لاہری نے پوری طرح آگاہ کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں سے فہمائش کی کہ دستور ساز اسمبلی انگریزوں کی بنائی ہوئی ہے اور وہ انگریزوں کے منصوبوں پر مصروف کار رہے جیسا کہ انگریز ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

شکل 15.6
عارضی حکومت کے ممبران
راجندر پرساد مرکز میں، ساتھ ان کی دائیں جانب جواہر لعل نہرو اور بائیں جانب سردار پٹیل بیٹھے ہوئے ہیں اور بائیں جانب انتہائی آخر میں بھیم راؤ امبیڈکر اور دائیں جانب انتہائی آخر میں شیاما پرساد مکھرجی بیٹھے نظر آرہے ہیں۔

ماخذ2

''بہت خوب، جناب ــــ جرأت مند الفاظ، باوقار الفاظ''

("That is very good, Sir – bold words, noble words")

سومناتھ لاہری نے کہا تھا:

ٹھیک، جناب، میں پنڈت نہرو کو اس بات کے لیے مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ہندوستانیوں کے طرز فکر و احساس کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا، جب انھوں نے کہا کہ ہندوستانی لوگ، انگریزوں کے ذریعہ عائد کی گئی کوئی بھی بات قبول نہیں کریں گے۔ عائد کرنے کے اس طرح کے عمل پر اعتراض اور ناراضگی کا اظہار کیا جائے گا۔ انھوں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ضرورت ہوئی تو ہم جدوجہد کی وادی میں سیر کریں گے۔ بہت خوب، جناب ــــ جرأت مند الفاظ، باوقار الفاظ۔

لیکن غور کرنے کا نکتہ یہ ہے کہ اس چیلنج کو آپ کب اور کس طرح بروئے کار لانے جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے، جناب، معاملہ یہ ہے کہ عائد کرنے کا عمل یہاں کیا جا رہا ہے، نہ صرف برطانوی منصوبے نے مستقبل کا کوئی دستور بنا دیا ہے...... جو انگریزوں کے لیے اطمینان بخش معاہدے پر منحصر ہوگا بلکہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے اختلاف کے لیے آپ کو وفاقی عدالت (Federal court) تک دوڑنا ہوگا یا وہاں انگلینڈ میں حاضر ہو کر ناچنا ہوگا یا برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی (Clement Attlee) یا کسی اور کو پکارنا ہوگا۔ صرف یہی حقیقت نہیں ہے۔ ہم منصوبوں کی جو بھی تدبیر سوچیں، اس دستور ساز اسمبلی کے تحت برطانوی بندوقوں، برطانوی فوج اور ان کی معاش و مالیاتی جان لیوا عفریت کے سائے میں ہیں جس کا مطلب ہے کہ فیصلہ کن اقتدار ابھی انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا اور اقتدار کا سوال ابھی تک حتمی طور پر طے نہیں ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ مستقبل ابھی تک پوری طرح ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے، نہ صرف یہ بلکہ حال ہی میں ایٹلی اور دیگر افراد کے ذریعہ دیے گیے بیانات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ، حتیٰ کہ آپ کو پورے طور سے تقسیم کرنے کی دھمکی دیں گے۔ اس کے معنی ہیں جناب کہ اس ملک میں کوئی آزادی نہیں ہے۔ جیسا کہ کچھ دنوں قبل سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کہا تھا، ہمارے پاس صرف آپس میں لڑنے کی آزادی ہے۔ ہم صرف اتنی ہی آزادی حاصل کر پائے ہیں...... اس لیے ہماری عاجزانہ تجویز ہے کہ سوال اس منصوبے کی تفصیلات کی توضیح کے ذریعہ کچھ حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ یہاں اور ابھی آزادی کا اعلان، عبوری حکومت اور ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کرنے، برادر کشی کی جنگ وجدل کو روکنے اور اپنے دشمن کے خلاف تیار رہنے جس کے ہاتھ میں ابھی تک چابک ہے یعنی برطانوی سامراجیت کو دیکھنے کا ہے اور باہم مل کر اس سے لڑنے کے لیے آگے بڑھیں اور اس کے بعد جب ہم آزاد ہو جائیں گے تو بعد ازاں ہم اپنے دعوؤں کو طے کر لیں گے۔

سی اے ڈی، جلد اول

> ماخذ 2 میں مقرر کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ دستور ساز اسمبلی برطانوی بندوقوں کے سائے میں کام کر رہی ہے؟

نہرو نے اعتراف کیا کہ زیادہ تر قوم پرست لیڈران ایک مختلف قسم کی دستور ساز اسمبلی چاہتے ہیں۔ ایک معنی میں یہ صحیح بھی تھا کہ برطانوی حکومت ''کا اس کے ظہور میں ہاتھ تھا'' اور اس نے اسمبلی کے اندر کارگزاری کے لیے یقینی شرائط عائد کر دی تھیں۔ ''لیکن'' نہرو نے اصرار کے ساتھ کہا ''آپ کو اس ماخذ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جس سے یہ اسمبلی اپنی طاقت اخذ کر رہی ہے۔'' نہرو نے مزید اضافہ کیا:

حکومتیں، ریاستی کاغذات سے وجود میں نہیں آئیں۔ فی الحقیقت حکومتیں لوگوں کی خواہش کا اظہار ہوتی ہیں۔ آج ہم یہاں آپس میں مل رہے ہیں کیونکہ ہمارے پیچھے لوگوں کی طاقت ہے اور ہم اتنی ہی دور جا پائیں گے جتنی دور لوگ ہمیں لے جانا چاہیں گے۔ کسی پارٹی یا گروپ کے نہیں بلکہ مجموعی لحاظ سے لوگ.... ہماری خواہش ساتھ چلنے کی ہوگی۔ اس لیے ہمیں ہندوستانی عوام کے دلی جذبات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا ہوگا اور انھیں پورا کرنے کوشش کرنی ہوگی۔

دستور ساز اسمبلی سے ان لوگوں کی خواہشات کے اظہار کی لیے توقع کی جاتی تھی جنھوں نے آزادی کے لیے تحریک میں حصہ لیا تھا۔ انیسویں صدی کے بعد سے ہندوستان میں جمہوریت، مساوات اور انصاف جیسے نصب العین سماجی جدوجہد کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہو گئے تھے۔ جب انیسویں صدی میں سماجی مصلحین نے بچپن کی شادی کی مخالفت کی اور بیوہ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا تو وہ سماجی انصاف کے لیے ہی پیروی کر رہے تھے۔ جب سوامی وویکانند نے ہندو مذہب کی اصلاح کے لیے مہم چلائی تو وہ مذاہب کو زیادہ انصاف پر مبنی بنانا چاہتے تھے۔ جب مہاراشٹر میں جیوتی با پھولے نے پسماندہ ذاتوں کی تکالیف کی طرف توجہ دلائی یا جب کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے مزدوروں اور کسانوں کو منظم کیا تو وہ بھی معاشی اور سماجی انصاف کا مطالبہ کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت کے خلاف جسے ایک ظالمانہ اور ناجائز حکومت کے طور پر دیکھا جاتا تھا قومی تحریک ناگزیر طور پر جمہوریت اور انصاف، شہریوں کے حقوق اور مساوات کے لیے بھی ایک جدوجہد تھی۔

شکل 15.7
ایڈون مونٹیگو 1919 کے چیمس۔فورٹ اصلاحات کے بانی تھے۔ جس میں صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں کسی حد تک نمائندگی کی اجازت دی گئی تھا۔

فی الحقیقت، جوں جوں نمائندگی کے لیے مطالبہ بڑھا، انگریزوں کو مجبوراً دستوری اصلاحات کا ایک سلسلہ متعارف کرانا پڑا۔ صوبائی حکومتوں میں ہندوستانیوں کی شرکت بڑھانے کے لیے بتدریج کئی قوانین (ایکٹ) (1909، 1919 اور 1935) پاس کیے گئے۔ 1919 میں انتظامیہ کو جزوی طور پر صوبائی قانون ساز اداروں کے تئیں جوابدہ بنایا گیا اور 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت اسے تقریباً پوری طرح قانون ساز اداروں کے تئیں جوابدہ بنایا گیا۔ جب 1937 میں گورنمنٹ آف انڈیا کے تحت الیکشن منعقد ہوئے تو گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں کانگریس اقتدار میں آ گئی۔

تاہم، پہلے کے آئینی ارتقا اور 1946 سے آگے کے تین سالوں کے دوران وقوع پذیر واقعات کے درمیان اٹوٹ تسلسل کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ حالانکہ پہلے کے آئینی تجربات ایک نمائندہ حکومت کے لیے بڑھتے مطالبے کے جواب میں تھے۔ مختلف ایکٹ (1909، 1919 اور 1935) ہندوستانیوں کے ذریعہ راست طور پر تشکیل یافتہ بحث و مباحثہ کے بعد

بحث کیجیے
جواہر لعل نہرو نے قرارداد کے مقاصد کے بارے میں کیا منصوبے پیش کیے

پاس نہیں ہوئے تھے۔ انھیں نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ ہی نافذ کیا گیا تھا۔ صوبائی اداروں کا انتخاب کرنے والے انتخابی حلقے کا دائرہ وقت کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا، لیکن 1935 میں یہ حق بالغ آبادی کے 15-10 فی صد حصے تک ہی محدود رہا۔ اس وقت تک عمومی بالغ رائے دہندگی نہ تھی۔ 1935 کے ایکٹ کے تحت منتخب شدہ قانون ساز ادارے نوآبادیاتی حکومت کے ڈھانچہ کے اندر ہی کام کر رہے تھے اور انگریزوں کے ذریعہ مامور کردہ گورنر کو جوابدہ تھے۔ 13 دسمبر 1946 کو نہرو جس بشارت کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے وہ ایک آزاد، خودمختار جمہوری ہندوستان کے دستور کی بشارت تھی۔

3. حقوق کی خاکہ بندی (DEFINING RIGHTS)

شہریوں کے خصوصی حقوق کی خاکہ بندی کس طرح کی جائے؟ کیا مظلوم گروہوں کو کوئی مخصوص حقوق ملنے چاہئیں؟ اقلیتوں کے کیا حقوق ہوں؟ فی الحقیقت کن کی خاکہ بندی بطور اقلیت کی جاسکتی ہے؟ جوں جوں دستور ساز اسمبلی کے ایوان میں بحث ومباحثہ آگے بڑھا ویسے ہی یہ صاف ہو گیا کہ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں جس پر اجتماعی طور پر اسمبلی متفق ہو۔ ان سولات کے جوابات خیالات کے ٹکراؤ اور ذاتی تصادم کے ڈرامہ کے ذریعہ ہی تشکیل پا سکے۔ اپنی افتتاحی تقریر میں نہرو نے ''لوگوں کی خواہش'' کی دہائی دی اور واضح کیا کہ دستور بنانے والوں کو ''عوام کے دلوں میں پوشیدہ جذبات وشوق'' کو پورا کرنا ہے۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ آزادی کی امید کے ساتھ مختلف گروہ اپنی خواہشات مختلف انداز میں ظاہر کر رہے تھے اور اپنے مطالبے پیش کر رہے تھے۔ ان سب پر بحث ومباحثہ ضروری تھا اور عمومی اتفاق رائے پر بتدریج آگے بڑھنے سے قبل باہم مخالف تصورات کے لیے مفاہمت لازمی تھی۔

3.1 جداگانہ انتخابی حلقوں کا مسئلہ

(The problem with separate electorates)

27 اگست 1947 کو مدراس کے بی۔ پوکر بہادر نے جداگانہ انتخابی حلقے مسلسل بنائے رکھنے کے لیے ایک مؤثر عذرخواہی پیش کی۔ بہادر نے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقلیتیں ہر ملک میں پائی جاتی ہیں۔ ہم انھیں چاہتے ہوئے بھی دور نہیں کر سکتے، ہم ان کی ہستی کو مٹا نہیں سکتے۔ ضرورت ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ بنانے کی ہے جس میں اقلیتیں دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی سے رہ سکیں اور فرقوں کے درمیان اختلافات کو کم سے کم کیا جاسکے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب سیاسی نظام کے اندر اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دی جائے، ان کی آواز سنی جائے اور ان کے خیالات کا لحاظ رکھا جائے۔ صرف جداگانہ انتخابی حلقوں سے ہی یہ یقینی ہوگا کہ مسلمان ملک کی

حکومت میں بامعنی رائے رکھتے ہیں۔ بہادر محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کی ضرورتوں کو غیر مسلم مناسب انداز میں نہیں سمجھ سکتے، نہ ہی ان لوگوں کے ذریعہ مسلمانوں کی سچی نمائندگی ہوسکتی ہے جو اس فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے۔

جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے اس مطالبہ نے زیادہ تر قوم پرست لیڈروں کے درمیان غصہ اور اضطراب پیدا کر دیا۔ بعد ازاں جذبات پر مبنی بحث ومباحثہ میں اس مطالبہ کے خلاف دلائل کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا۔ زیادہ تر قوم پرست جداگانہ انتخابی حلقوں کو انگریزوں کے ذریعہ لوگوں کو تقسیم کرنے کے لیے دانستہ متعارف اقدام کے طور پر دیکھتے تھے۔ آر۔ وی۔ دھولیکر نے بہادر سے کہا تھا ''انگریزوں نے تحفظ کرنے کے نام کے تحت اپنا کھیل کھیلا۔ اس کی مدد سے انھوں نے ایک طویل جھوٹی تسلی دینے کے لیے تم (اقلیتوں) کو لبھایا تھا۔ اس کو اب چھوڑ دو......اب یہاں کوئی تم کو گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔

شکل 15.8
1946 کی سردیوں میں ہندوستانی لیڈران انگلینڈ کے وزیراعظم اٹیلی کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے لندن گئے تھے لیکن دور کی یہ گفتگو بے نتیجہ ثابت ہوئی (بائیں سے دائیں: لیاقت علی، محمد علی جناح، بلدیو سنگھ اور پیتھک لارنس)

جداگانہ انتخابی حلقوں کا تصور تقسیم کی وجہ سے قوم پرستوں کے لیے شدت سے مخالفت کا سبب بنا۔ مسلسل خانہ جنگی، فسادات اور تشدد کا خوف ان کے ذہن میں عود کر آیا۔ سردار پٹیل نے واضح کیا کہ ''جداگانہ انتخابی حلقے ایک زہر تھا جو ہمارے ملک کے سیاسی جسم میں داخل ہو چکا ہے۔'' ایک ایسا مطالبہ تھا جس نے ایک فرقہ کو دوسرے فرقے کے خلاف کر دیا۔ ملک تقسیم ہو گیا، خون افشانی کا سبب بنا اور ملک کی المناک تقسیم کے لیے وجہ بنا۔ پٹیل نے تاکید کی ''کیا آپ اس ملک میں امن چاہتے ہیں؟ اگر چاہتے ہیں تو اسے (جداگانہ انتخابی حلقوں کو) دور ہٹاؤ۔''

ماخذ 3

''انگریز (عنصر) تو چلے گئے، لیکن اپنے پیچھے شرارت چھوڑ گئے''

("The British element is gone, but they have left the mischief behind")

سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کہا تھا:

یہ دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہم جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے مانگ اس لیے کر رہے تھے کیونکہ یہ ہمارے لیے اچھا ہے۔ یہ بات ہم بہت عرصے سے سن رہے ہیں۔ ہم سالوں سے یہ سن رہے ہیں کہ اس احتجاج کے نتیجے میں اب ہم علاحدہ ملک ہیں...... کیا آپ مجھے ایک بھی آزاد ملک دکھا سکتے ہیں جہاں جداگانہ انتخابی حلقے ہوں؟ اگر آپ مجھے دکھا دیں تو میں آپ کی بات ماننے کے لیے تیار ہوں، لیکن اس بدقسمت ملک میں حتیٰ کہ ملک کی تقسیم کے بعد بھی اس جداگانہ انتخابی حلقہ کو قائم اور جاری رکھا گیا تو ملک کی شامت آ جائے گی، یہاں رہنے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ صرف میرے لیے ہی اچھا نہیں ہے بلکہ یہ آپ کے لیے بھی اچھا ہے، میں کہتا ہوں ماضی کو بھول جاؤ۔ ایک دن ہم متحد ہو سکتے ہیں.... انگریز (عنصر) تو چلے گئے، لیکن اپنے پیچھے شرارت چھوڑ گئے۔ ہم اس شرارت کو دوام دینا نہیں چاہتے۔ (سنیے سنیے) جب انگریزوں نے یہ عنصر متعارف کرایا تھا تو انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی جانا پڑے گا۔ وہ اپنے نظم ونسق کی آسانی کے لیے یہ چاہتے تھے۔ ٹھیک ہے، لیکن اب وہ اپنی وراثت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اب ہم اس سے باہر نکلیں گے یا نہیں؟

سی اے ڈی جلد V

جدا گانہ انتخابی حلقوں کے لیے مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے گووند ولبھ پنت نے واضح کیا کہ یہ نہ صرف ملک کے لیے بلکہ اقلیتوں کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ انھوں نے بہادر کے ساتھ اس بات پر اتفاق کیا کہ جمہوریت کے تئیں مختلف طبقات کے لوگوں کے درمیان پیدا ہوئے یقین کے ذریعہ ہی جمہوریت کی کامیابی کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی متفق تھے کہ ایک آزاد ریاست میں ہر شہری کے ساتھ ایسے انداز میں پیش آنا چاہیے جس سے نہ صرف اس کی مادی ضروریات بلکہ عزت نفس کے روحانی شعور سے بھی وہ مطمئن ہو جائے اور اکثریتی طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اقلیتوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ان کی خواہشات کے ساتھ ذہنی ہمدردی سے کام لے۔ تاہم پنت جدا گانہ انتخابی حلقوں کے تصور کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان کی دلیل تھی کہ یہ ایک خودکشی پر مائل مطالبہ تھا، جو اقلیتوں کو مستقل بنیادوں پر جُدا کر دے گا، انھیں عاجز بنادے گا اور حکومت کے اندر انھیں کسی طرح کی مؤثر شرکت نہیں مل پائے گی۔

ماخذ 4

''میرا یقین ہے کہ جدا گانہ انتخابی حلقے اقلیتوں کے لیے خودکشی پر مائل ثابت ہوں گے''
("I believe separate electorates will be suicidal to the minorities")

27 اگست 1947 کو بحث و مباحثہ کے دوران گووند ولبھ پنت نے کہا تھا:

میرا یقین ہے کہ جدا گانہ انتخابی حلقے اقلیتوں کے لیے خودکشی پر مائل ثابت ہوں گے اور انھیں زبردست نقصان ہوگا۔ اگر انھیں ہمیشہ کے لیے جُدا کر دیا گیا تو وہ کبھی خود کو اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکیں گے، اور یہاں کہ انھیں بالکل شروع سے ہی محرومی و مایوسی کا احساس اپاہج بنادے گا۔ کیا یہ آپ کی خواہش ہے اور ہمارا حتمی مقصد کیا ہے؟ کیا اقلیتیں ہمیشہ اقلیتیں ہی بنی رہنا چاہتی ہیں یا وہ ایک عظیم ملک کا جزو لازم بننا اور اس کی قسمت کو راہ دکھانے اور کنٹرول کرنے کی توقع رکھنا چاہتی ہیں؟ اگر وہ بقیہ فرقے سے الگ رہتی ہیں، اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو وہ ہمیشہ اس خواہش اور نصب العین کو حاصل کر سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر انھیں بقیہ فرقے سے علاحدہ کیا جاتا ہے اور ایک ہوابند گوشے میں الگ رکھا جاتا ہے جہاں انھیں زندہ رہنے کے لیے ہوا پر بھی حتیٰ کہ دوسروں پر بھروسہ کرنا پڑے گا تو یہ ان کے لیے انتہائی خطرناک ہوگا...... اگر اقلیتیں جدا گانہ انتخابی حلقوں سے منتخب ہوتی رہیں تو کبھی بھی کوئی مؤثر رائے نہیں بن سکتیں۔

سی اے ڈی، جلد دوم

ماخذ 3 اور 4 کو پڑھیے۔ جدا گانہ انتخابی حلقوں کے خلاف کون کون سے مختلف دلائل پیش کیے گئے۔

ان تمام دلائل کے پیچھے ایک متحدہ ریاست کی تشکیل کی تشویش وابستہ تھی بغرض سیاسی اتحاد تعمیر کرنے اور ملک بنانے کے لیے ہر فرد کو ریاست کے شہری کے طور پر ڈھالنا ضروری تھا۔ ہر گروہ کو ملک کے اندر ضم کرنا لازمی تھا۔ آئین شہریوں کو حقوق عطا کرے گا لیکن شہریوں کو بھی ریاست کے تئیں اپنی وفاداری پیش کرنی ہوگی۔ فرقوں کو بحیثیت ثقافتی انفرادیت کے تسلیم کیا جا سکتا ہے اور ثقافتی حقوق کی یقین دہانی دی جا سکتی ہے تاہم سیاسی طور پر تمام فرقوں کے ممبران کو ریاست کے مساوی ممبران کے طور پر کام کرنا ہوگا ورنہ ان کی وفاداریاں تقسیم ہو جائیں گی۔ پنت نے کہا کہ اس لحاظ سے یہ مخرب اخلاق اور کسی حد تک ذلیل وخوار کرنے والی عادت ہے کہ ہم کبھی بھی ایک شہری کے طور پر نہیں سوچتے اور ہمیشہ ایک فرقے کے طور پر ہی سوچتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا ''ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ'' یہ شہریت ہی ہے جو ہمیشہ شمار ہوتی ہے یہ شہریت ہی ہے جو سماجی اہرام کی بنیاد بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ چوٹی بھی ہے'' حتی کہ جب جماعتی حقوق (Community Rights) کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا تھا اس وقت بہت سے قوم پرستوں میں موہوم سا خوف موجود تھا کہ یہ وفاداریوں کی تقسیم کی بنیاد بن سکتا ہے اور یہ ایک مضبوط ملک اور طاقتور ریاست کو تعمیر کرنا مشکل کر سکتا ہے۔

سارے مسلمان جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے مطالبہ کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر بیگم اعجاز رسول محسوس کرتی تھیں کہ جداگانہ انتخابی حلقے مائل بہ خودکشی ثابت ہوں گے چونکہ وہ اقلیتوں کو اکثریت سے الگ کر دیں گے۔ 1949 تک دستور ساز اسمبلی کے زیادہ تر مسلم ممبران اس بات پر متفق ہو گئے کہ جداگانہ انتخابی حلقے اقلیتوں کے مفادات کے خلاف ہیں۔ اس کے بجائے مسلمانوں کو سیاسی عمل میں سرگرم حصہ لینے کی ضرورت ہے جو سیاسی نظام میں ان کی فیصلہ کن رائے کو یقینی بنائے۔

ماخذ 5

''منقسم وفاداری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی''
("There cannot be any divided loyalty")

گووند ولبھ پنت نے دلیل دی کہ وفادار شہری بننے کے تعلق سے لوگوں کو صرف فرقہ اور خود پر مرکوز سوچنے کا عمل بند کرنا ہوگا:

جمہوریت کی کامیابی کے لیے فرد کو خود ضبط نفس میں تربیت لینی ہوگی۔ جمہوریت میں فرد کو خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے زیادہ فکر کرنی ہوگی، منقسم وفاداری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ تمام طرح کی وفاداریاں ریاست کے اردگرد مرکوز ہونی چاہئیں۔ اگر جمہوریت میں آپ حریف وفاداریاں پیدا کریں یا آپ ایک ایسا نظام بنا دیں جس میں کوئی فرد یا گروہ اپنے اسراف پر روک لگانے کے بجائے وسیع یا دیگر مفادات کے لیے کچھ پرواہ نہیں کرے تو پھر جمہوریت کا انجام دہشت ناک ہے۔

سی اے ڈی، جلد دوم

جی۔ بی۔ پنت ایک وفادار شہری کی خصوصیت کی کس طرح توضیح کرتے ہیں؟

3.2 ''اس قرارداد کی بجائے ہمیں زیادہ کی ضرورت ہے'' ("We will need much more than this Resolution")

اگرچہ ''اہداف قرارداد'' کا استقبال کرتے ہوئے ایک سوشلسٹ این۔ جی۔ رنگا نے جو کسان تحریک کے لیڈر تھے اصرار کیا کہ اصطلاح اقلیت کی ترجمانی معاشی اصطلاح میں ہونی چاہیے۔ رنگا کے لحاظ سے اصلی اقلیتیں غریب اور ظلم واستبداد کے شکار لوگ تھے۔ انھوں نے اس بات کا استقبال کیا کہ دستور میں ہر فرد کے لیے قانونی حقوق دیے جا رہے ہیں لیکن انھوں نے اس کی محدودات کو بھی نشان زد کیا تھا۔ اس رائے میں گاؤں میں غریب لوگوں کے لیے یہ جاننا بے معنی تھا

کہ ان کے پاس زندہ رہنے کے لیے، مکمل روزگار کے لیے بنیادی حق ہے۔ وہ اپنے جلسے، کانفرنسیں کر سکتے ہیں، اپنی تنظیم بنا سکتے ہیں اوران کے پاس دیگر شہری آزادیاں بھی ہیں۔ یہ ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جہاں عوام دیے گئے ان دستوری حقوق سے مؤثر ڈھنگ سے استفادہ کرسکیں۔اس کے لیے انھیں تحفظ کی ضرورت تھی۔ رنگا نے کہا ''انھیں سہاروں کی ضرورت ہے، انھیں زینہ کی ضرورت ہے''

ماخذ6

''اصلی اقلیتیں اس ملک کے عوام ہیں'' ("The real minorities are the masses of this country")

جواہرلعل نہرو کے ذریعہ پیش کی گئی اہداف قرارداد کا استقبال کرتے ہوئے این۔جی۔رنگا نے کہا تھا:
جناب، یہاں اقلیتوں کے متعلق بہت باتیں ہوئی ہیں۔اصلی اقلیتیں کون ہیں؟ نام نہاد پاکستان کے صوبوں میں رہنے والے ہندو، سکھ اور حتی کہ مسلمان بھی اقلیت نہیں ہیں۔نہیں جناب اصلی اقلیتیں اس ملک کے عوام ہیں۔ یہ لوگ اب تک اتنے پریشان ،مظلوم ومحکوم اور دبے کچلے ہیں کہ وہ عام شہری حقوق کا فائدہ اٹھانے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ حالت کیا ہے؟ آپ قبائلی علاقوں میں جائیے۔قانون کے مطابق ،ان کے اپنے روایتی قانون ،ان کے قبائلی قانون ان کی زمینوں سے خارج نہیں کر سکتے۔تاہم ہمارے تاجر وہاں جاتے ہیں اور نام نہاد آزاد بازار کے نام پر ان کی زمین چھین لینے کے اہل ہیں۔اس طرح گو کہ قانون ان کی زمینوں کے ایسے چھیننے کے خلاف جاتا ہے۔ابھی تک تاجر اس بات کے اہل ہیں کہ وہ قبائلی لوگوں کو مختلف قسم کے معاہدوں کے ذریعہ صحیح معنی میں غلام بنالیتے ہیں۔آیئے اب عام گاؤں والوں کی طرف چلتے ہیں۔ یہاں تاجر اپنی دولت کے ساتھ جاتا ہے اور وہ گاؤں والوں کو اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ یہاں بذات خود زمین مالکان، زمین دار اور مال گزار موجود ہیں اور مختلف قسم کے دیگر لوگ ہیں جوان غریب گاؤں والوں کا استحصال کرنے کے اہل ہیں۔ یہاں ان لوگوں میں بنیادی تعلیم بھی نہیں ہے۔یہی اصلی اقلیت ہیں جنھیں تحفظ اور اس کی یقین دہانی کی ضرورت ہے۔ان لوگوں کو لازمی تحفظ دینے کے نام پر ہمیں اس قرارداد سے کہیں زیادہ کرنے کی ضرورت ہوگی....

سی اے ڈی۔جلد دوم

رنگا کے ذریعہ اقلیت کے تصور کی توضیح کس طرح کی گئی ہے؟

رنگا نے ہندوستانی عوام اور دستور ساز اسمبلی میں ان کے نمائندہ کے طور پر بولنے کا دعوی کرنے والے افراد کے بیچ موجود خلیج جو وسیع طور پر علاحدہ کرتی ہے، کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرائی:

> ہم کن لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ ہمارے ملک کے عام عوام اور اس کے باوجود ہم میں سے زیادہ تر لوگ بذات خود اس عوام سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم ان کے ہیں، ہم ان کے لیے نمائندگی کرنا چاہتے ہیں لیکن عوام بذات خود دستور اسمبلی میں آنے کے اہل نہیں ہے، اس میں ابھی وقت لگ سکتا ہے، ان کی پرزور حمایت کرنے والوں کے طور پر ہم ان کے لیے آواز اٹھانے کی اپنی بہترین کوششیں کر رہے ہیں۔

رنگا کے ذریعہ مذکورہ گروہوں میں قبائل بھی ایک تھے، اسمبلی کے لیے ان نمائندوں میں غیر معمولی طور پر ذہین مقرر جے پال سنگھ تھے۔ اہداف قرارداد کا استقبال کرتے ہوئے جے پال سنگھ نے کہا تھا۔

> ایک آدی واسی کے بطور، میں اس قرارداد کی قانونی پیچیدگیوں کی فہم کی امید نہیں رکھتا، لیکن میری عام سمجھ بوجھ کہتی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص کو آزادی کے اس راستے پر چلنا چاہیے اور مل کر لڑنا چاہیے۔ جناب اگر یہاں ہندوستانی لوگوں کا کوئی گروہ ہے جس کے ساتھ سوقیانہ سلوک کیا گیا ہے تو وہ میرے لوگ ہیں۔ ان سے گذشتہ 60,000 سالوں سے ذلت آمیز سلوک کیا گیا ہے اور انھیں نظر انداز کیا گیا ہے..... میرے لوگوں کی پوری تاریخ ہندوستان کے غیر حقیقی باشندوں کے ذریعہ مسلسل استحصال اور بے دخلی کی تاریخ ہے، بغاوتوں اور انتشار کے ذریعہ یہ سلسلہ ٹوٹا ہے۔ تاہم میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے الفاظ سمجھ گیا۔ میں آپ سب کی بات سمجھ گیا کہ اب ہم نیا باب شروع کرنے جا رہے ہیں۔ آزاد ہندوستان کا ایک باب جہاں مواقع کے مساوی امکان ہوں گے جہاں کوئی بھی فرد نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

سنگھ نے واضح انداز میں قبائل کے تحفظ اور ان حالات کو یقینی بنانے کے لیے جو عام آبادی کی سطح تک لانے میں معاون ہو سکتے ہیں، کی ضرورت پر تقریر کی۔ انھوں نے دلیل دی کہ قبائل اعدادی بنیاد پر اقلیت نہیں تھے لیکن انھیں تحفظ کی ضرورت ہے۔ انھیں زمین سے بے دخل کر دیا گیا جہاں وہ مقیم تھے۔ انھیں ان کے جنگلات اور چراگاہوں سے محروم کر دیا گیا اور نئے گھروں کی تلاش میں حرکت کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ انھیں قدیم دور کا (غیر ترقی یافتہ) اور پسماندہ کی طرح دیکھتے ہوئے بقیہ سماج نے ان سے رخ موڑ لیا اور ٹھکرا دیا۔ انھوں نے جذباتی اور مادی فاصلہ جو قبائلی کو بقیہ سماج سے علاحدہ کرتا ہے کو توڑنے کے لیے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا "ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آپ کو ہمارے ساتھ ربط ضبط رکھنا چاہیے۔ ہم آپ کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کے خواہش مند ہیں..... سنگھ جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے نہیں کہہ رہے تھے لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ قانون ساز اداروں میں قبائلیوں کو بذات خود نمائندگی کے لیے سیٹوں کو محفوظ کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ قبائلیوں کی آواز سننے کے لیے دوسروں کو ان کے قریب آنے کے لیے مجبور کرنے کے لیے یہ ایک راستہ ہوگا۔

3.3 ''ہم ہزاروں سال سے دبے کچلے تھے'' ("We were suppressed for thousands of years")

دستور کے ذریعہ پسماندہ ذاتوں کے حقوق کی توضیح کس طرح کی جائے؟ قومی تحریک کے دوران امبیڈکر نے پسماندہ ذاتوں کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کیا تھا اور گاندھی جی نے یہ دلیل دیتے ہوئے اس مطالبہ کی مخالفت کی تھی کہ یہ مطالبہ ہمیشہ کے لیے بقیہ سماج سے پسماندہ ذاتوں کو علاحدہ کردے گا۔ دستور ساز اسمبلی اس مخالفت کو کس طرح حل کرسکتی تھی؟ پسماندہ ذاتوں کو کس قسم کا تحفظ مہیا کرایا جاسکتا تھا؟

پسماندہ ذاتوں کے چند ممبران نے اصرار کیا کہ اچھوتوں کا مسئلہ صرف تحفظ اور حفظ ماتقدم کے ذریعہ ہی حل نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی مجبوری ولاچاری، سماجی معیارات اور ذات پات پر مبنی سماج اخلاقی اقدار کے سبب تھی۔ سماج نے ان کی خدمات اور محنت کا استعمال تو کیا ہے لیکن اس سے ایک سماجی فاصلہ برقرار رکھا ہے، ان کے ساتھ ربط ضبط یا ان کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں یا ان کو مندروں میں داخل ہونے نہیں دیا جاتا۔ مدراس سے تعلق رکھنے والے ممبر جے ناگپا نے کہا تھا: ہم ہمیشہ تکلیف اٹھاتے رہے لیکن اب مزید تکلیف اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھ لی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم کو کس طرح اصرار کرنا ہے۔''

ناگپا نے نشاندہی کی کہ اعدادی بنیاد پر پسماندہ ذاتیں اقلیت نہیں ہیں: وہ کل آبادی کو 20 اور 25 فی صد کے درمیان تشکیل کرتے ہیں۔ ان کی تکلیف کا سبب منظم طریقے پر حاشیہ پر رکھنا تھا نہ کہ ان کی اعدادی بے اہمیت تھی۔ ان کے پاس نہ تو تعلیم تک رسائی تھی نہ ہی انتظامیہ میں حصہ داری۔ مرکزی صوبہ جات کے ممبر کے۔ جے۔ کھانڈیکر نے اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ہم ہزاروں سال سے دبے کچلے تھے......دبایا گیا.........اس حد تک دبایا گیا کہ نہ ہی ہمارا دماغ اور نہ ہی ہمارے جسم اور اب حتیٰ کہ ہمارے دل بھی کام نہیں کرتے، نہ ہی ہم آگے بڑھنے کے قابل رہ گئے ہیں۔ یہ ہے حالت ہماری۔

تقسیم ملک کے تشدد کے بعد، امبیڈکر نے بھی جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے دلیل دینا بند کردی۔ دستور ساز اسمبلی نے بالآخر یہ سفارش کی کہ چھوت چھات کو ختم کیا جائے۔ ہندو مندروں کو تمام ذاتوں کے لوگوں کے لیے کھول دیا جائے اور نچلی ذاتوں کے افراد کے لیے قانون ساز اداروں اور سرکاری دفاتر میں نوکریوں میں نشستیں محفوظ کی جائیں۔ بہت سے لوگوں کا ماننا تھا کہ

ماخذ 7

''ہم اپنی سماجی مجبوری ولاچاری کو ہٹانا چاہتے ہیں'' ("We want removal of our social disabilities")

مدراس کی دکشیانی ویلایودھن نے دلیل دی:
ہم کو ہر قسم کے حفظ ماتقدم نہیں چاہئیں۔ یہ اخلاقی حفظ ماتقدم ہے جو اس ملک کے ستم رسیدہ لوگوں کو تحفظ دے گا.......میں یہ ماننے سے انکار کرتی ہوں کہ سات کروڑ ہریجنوں کو ایک اقلیت تسلیم کیا جائے .....ہم چاہتے ہیں کہ ہماری سماجی مجبوری ولاچاری کو فوراً ختم کیا جائے۔

اس سے بھی تمام مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ سماجی تفریق کو صرف آئینی قوانین کے ذریعہ نہیں مٹایا جاسکتا، اس کے لیے سماج کے اندر رویوں میں تبدیلی لانی ہوگی، لیکن جمہوری عوام کے ذریعہ ان اقدامات کا خیر مقدم کیا گیا۔

ماخذ 8

''ہم نے کبھی بھی خصوصی مراعات نہیں مانگیں''
(We have never asked for privileges)

بمبئی کی ہنسا نے مہتہ خواتین کے لیے انصاف کا مطالبہ کیا اور محفوظ سیٹوں یا جداگانہ انتخابی حلقہ کا مطالبہ نہیں کیا:

ہم نے کبھی بھی خصوصی مراعات نہیں مانگیں ہم نے سماجی انصاف، معاشی انصاف اور سیاسی انصاف کے لیے مطالبہ کیا ہے ہم نے اس برابری کا مطالبہ کیا ہے جس سے صرف باہمی عزت اور فہم کی بنیاد بن سکتی ہے جس کی بنا پر مرد اور عورت کے درمیان حقیقی باہمی تعاون ممکن نہیں ہے۔

بحث کیجیے

وہ مختلف دلائل کیا تھے جو جے پال سنگھ نے قبائلوں کے لیے تحفظ جاتی اقدامات کا مطالبہ کرتے ہوئے پیش کیے تھے؟

4. ریاست کے اختیارات
(THE POWERS OF THE STATE)

دستور ساز اسمبلی میں نہایت قوی اور فعال بحث و مباحثہ کے موضوعات میں ایک موضوع مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے حقوق کے متعلق تھا۔ جو لوگ مضبوط مرکزی حکومت کے قائل تھے ان میں جواہر لعل نہرو بھی تھے جیسا کہ انھوں نے دستور ساز اسمبلی کے صدر کے نام لکھے خط میں واضح کیا تھا ''اب جب تقسیم ملک ایک طے شدہ حقیقت ہے......ایک کمزور مرکزی اقتدار ملک کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہوگا جو امن و امان کو یقینی بنانے، مشترکہ عام اندیشوں کے ناگزیر معاملات کو ہم آہنگ کرنے اور بین الاقوامی دائرۂ عمل میں پورے ملک کے لیے موثر طور پر آواز اٹھانے میں نااہل ہوگا۔''

دستور کے مسودہ میں موضوعات کی تین فہرست تیار کی گئی تھی۔ مرکزی (Union)، ریاستی اور باہم مربوط (Concurrent)۔ پہلی فہرست کے موضوع مرکزی حکومت کے لیے محفوظ کیے گئے تھے جب کہ دوسری فہرست میں موضوع ریاستوں کے اختیار سے متعلق تھے۔ تیسری فہرست مرکز اور ریاست کی مشترکہ ذمہ داری کی بابت تھی۔ تاہم دیگر وفاقوں (Federations) کے مقابلے میں بہت زیادہ شقیں بلاشرکت غیرے مرکزی کنٹرول کے تحت رکھی گئی تھیں۔ صوبوں کی خواہشات کے مقابلے باہم مربوط فہرست میں بھی بہت زیادہ شقیں رکھی گئی تھیں۔ معدنیات اور کلیدی صنعتوں کا کنٹرول بھی مرکز کے پاس تھا۔ مزید برآں دفعہ 356 کے تحت گورنر کی سفارش پر مرکز کو ریاست کے نظم و نسق کو ہاتھ میں لینے کا اختیار دیا گیا تھا۔

مالیاتی وفاق پسندی کے پیچیدہ نظام کے لیے بھی دستور اختیار دیتا ہے۔ بعض معاملے میں (مثال کے طور پر کسٹم ڈیوٹی اور کمپنی ٹیکسوں) ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی ساری رقم مرکز اپنے پاس رکھے گا۔ دوسرے معاملوں میں (جیسے آمدنی ٹیکس اور آبکاری ٹیکس) یہ آمدنی ریاستوں کے ساتھ تقسیم کر دی گئی۔ مزید دیگر معاملوں میں (مثلاً متروکہ املاک پر لگایا جانے والا ٹیکس) پوری آمدنی ریاستوں کو تفویض کر دی گئی تھی۔ اس دوران ریاستیں اپنے طور پر معین ٹیکس عائد کر سکتی تھیں اور وصول کر سکتی تھیں۔ ان میں زمین اور ملکیت ٹیکس، فروخت ٹیکس اور بوتل بند شراب پر غیر معمولی منافع شامل ہیں۔

4.1 ''مرکز منتشر ہو سکتا ہے''

("The centre is likely to break")

ریاستوں کے حقوق کا سب سے زیادہ واضح دفاع مدراس کے ممبر کے۔ سانتھانم نے کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ نہ صرف ریاستوں بلکہ مرکز کو بھی مضبوط بنانے کے لیے اختیارات کو از سر نو تقسیم کرنا ضروری تھا ''یہاں تقریباً ایک خیال ذہن پر طاری ہو گیا ہے کہ تمام قسم کے اختیارات کا اضافہ کرنے کے ذریعہ ہم مرکز مضبوط بنا سکتے ہیں''۔ سانتھانم نے کہا کہ یہ غلط تصور تھا اگر مرکز ذمہ داریوں کے ساتھ زیادہ زیر بار تھا تو یہ مؤثر ڈھنگ سے کام نہیں کر سکتا۔ اس کے کچھ امور میں ذمہ داری کا بوجھ کم کرنے سے اور ریاستوں کو منتقل کر دینے سے فی الحقیقت مرکز کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک ریاستوں کا تعلق ہے سانتھانم نے محسوس کیا کہ اختیارات کا مجوزہ طور پر مختص کرنا ان کو اپاہج بنا دے گا۔ مالیاتی شقیں (انتظام) صوبوں کو مفلس بنا دیں گی۔ چونکہ زمین مال گزاری کے علاوہ زیادہ تر ٹیکس مرکز کے لیے محفوظ کر دیے گئے تھے۔ بغیر مالیات کے ریاستیں ترقی کے منصوبوں کا بیڑا کس طرح اٹھا سکتی ہیں؟ ''میں ایسا کوئی دستور نہیں چاہتا جس میں اکائی کو آ کر مرکز سے یہ کہنا پڑے کہ میں اپنے لوگوں کو تعلیم یافتہ نہیں بنا سکتا، میں انھیں کچرے اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام نہیں دے سکتا، مجھے سڑکوں کی اصلاح کے لیے، صنعتوں کے قیام کے لیے وظیفہ دے دیجیے۔ بہتر ہوگا کہ ہم وفاقی نظام کو نیست و نابود کریں اور اکائی والا نظام اختیار کریں'' سانتھانم نے پیشن گوئی کی کہ اگر اختیارات کی مجوزہ تعلیم بغیر مزید تنقیدی نظر کے اختیار کی گئی تو مستقبل تاریک ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ چند سالوں میں سارے صوبے ''مرکز کے خلاف بغاوت'' میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ماخذ 9

بہتر محبِ وطن کون ہے؟
(Who is a better patriot?)

میسور کے سرائے۔ داما سوامی مدالیار نے 21 اگست 1947 کے بحث و مباحثہ کے دوران کہا تھا:

اگر ہم ایک مضبوط مرکز کی تجویز اس لیے کرتے ہیں کہ ہم بہتر محبِ وطن ہیں اور یہ بات ہم اپنی روح کی خوشامدانہ تسکین کے لیے پیش نہیں کرتے اور وہ جو ان وسائل کی نہایت قوی اور فعال جانچ کی وکالت کرتے ہیں ان لوگوں میں قومی جذبے یا حب الوطنی کا فقدان ہے۔

صوبوں کے بہت سے دیگر ممبران بھی اس طرح کے خوف کی بازگشت سے پریشان تھے۔ انھوں نے جان توڑ کوشش کی کہ باہم مربوط اور یونین فہرستوں میں قلیل تعداد میں شقیں رکھی جائیں۔ اڑیسہ کے ایک ممبر نے خبردار کیا کہ ''مرکز منتشر ہو جائے گا'' چونکہ دستور کے تحت اختیارات بافراط مرتکز کر دیے گئے تھے۔

4.2 ''آج ہمیں ایک طاقتور حکومت کی ضرورت ہے'' ("What we want today is a strong Government")

صوبوں کے لیے زیادہ اختیارات کی بابت دلائل نے اسمبلی کے اندر سخت ردعمل اُس کے لیے اکسایا۔ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی شروعات سے لے کر اب تک متعدد مواقع پر ایک مضبوط مرکز کی ضرورت کے لیے توجہ مبذول کرائی گئی۔ امبیڈکر نے اعلان کیا کہ وہ ''ایک مضبوط اور متحدہ مرکز (سنیے سنیے) ہم 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت بنائے گئے مرکز کے مقابلے زیادہ مضبوط مرکز'' چاہتے ہیں۔ فسادات اور تشدد جس نے ملک کے ٹکڑے کر دیے تھے کی یاد دہانی کراتے ہوئے بہت سے ممبران نے بار بار یہ کہا تھا کہ مرکز کے اختیارات کو بڑی حد تک مضبوط کرنا چاہیے تاکہ وہ فرقہ وارانہ غیظ وغضب کو روکنے کا اہل ہو۔ صوبوں کے لیے اختیارات کے مطالبات پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے گوپال سوامی اینگر نے اعلان کیا تھا کہ ''مرکز کو جتنا مضبوط بنانا ممکن ہو سکتا ہے اتنا مضبوط بنانا ہوگا''۔ متحدہ صوبہ جات کے ایک ممبر بال کرشن شرما نے استدلالی پیرایہ میں تفصیلات پیش کرتے ہوئے کہا کہ صرف ایک مضبوط مرکز ہی ملک کی آسودگی کے لیے منصوبہ بنا سکتا ہے، دستیاب معاش وسائل کو منظّم کر سکتا ہے، درست نظم ونسق قائم کر سکتا ہے اور غیر ملکی حملے کے خلاف ملک کا دفاع کر سکتا ہے۔

تقسیم ملک سے قبل کانگریس نے صوبوں کو معقول خودمختاری دینے پر اتفاق کیا تھا۔ یہ کسی قدر مسلم لیگ کو اطمینان دلانے کی کوشش تھی کہ جہاں مسلم لیگ اقتدار میں آئے گی ان صوبوں کے اندر دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔ تقسیم ملک کے بعد زیادہ تر قوم پرستوں نے اپنا موقف تبدیل کر دیا تھا کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ لامرکزیہ ساخت (Decentralised Structure) کے لیے پہلے جیسے سیاسی دباؤ یہاں نہیں رہ گئے تھے۔

نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ نافذ اکائی والا نظام یہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ اس زمانے کے تشدد کے واقعات نے مرکزیت کو مزید آگے بڑھایا، اسے اب انتشار و بدنظمی پر پیشگی روک تھام کرنے اور ملک کی معاشی ترقی کا منصوبہ بنانے کے لیے ضروری طور پر دیکھا جانے لگا۔

بحث کیجیے

ایک مضبوط مرکز کی وکالت کرنے والے لوگوں کے ذریعہ کون سے مختلف دلائل پیش کیے گئے تھے؟

اس طرح دستور، ہندوستانی یونین (مرکز) کا اپنی رکن ریاستوں پر حقوق کی بابت یقینی تعصب کو ظاہر کرتا ہے۔

5. ملک کی زبان

جب ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ مختلف زبانیں بولتے ہوں، اور ہر زبان کے ساتھ اس کی اپنی ثقافتی وراثت وابستہ ہو تو پھر ایک ملک کس طرح تعمیر کیا جاسکتا ہے؟ کس طرح لوگ ایک دوسرے کو سن سکتے ہیں یا ایک دوسرے سے جڑ سکتے ہیں اگر وہ ایک دوسرے کی زبان سے بھی واقف نہ ہوں؟ دستور ساز اسمبلی کے اندر کئی مہینوں تک زبان کے مسئلے پر بحث ہوئی تھی اور اکثر شدید قسم کے دلائل وجود میں آئے۔

1930 کی دہائی تک کانگریس نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ ہندوستانی کو قومی زبان بنانا چاہیے۔ گاندھی جی نے محسوس کیا کہ ہر ایک شخص کو ایسی زبان میں بات چیت کرنی چاہیے جس کو عام آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکے۔ ہندوستانی۔ ہندی اور اردو کا ایک آمیزہ۔ ہندوستان کے لوگوں کے ایک بڑے حصے کی مقبول زبان تھی اور یہ مختلف ثقافتوں کے باہمی تعامل کے ذریعہ مالا مال مخلوط زبان تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ مختلف طرح کے ماخذوں سے الفاظ اور اصطلاحات شامل ہوتی گئیں اور اس لیے مختلف علاقے کے لوگ سمجھنے لگے تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ مختلف النوع فرقوں اور طبقات کے درمیان ترسیل کی مثالی زبان بن جائے گی، یہ ہندو اور مسلمان کو اور شمال و جنوب کے لوگوں کو متحد کرسکتی ہے۔

تاہم انیسویں صدی کے آخر سے زبان ـــ بطور ہندوستانی بتدریج تبدیل ہو رہی تھی۔ جوں جوں فرقہ وارانہ تنازعات شدید ہو رہے تھے ہندی اردو ایک دوسرے سے دور ہونا شروع ہوگئیں تھیں۔ ایک طرف فارسی اور عربی اصل کے تمام الفاظ کو خارج کر کے ہندی کو سنسکرت زدہ بنانے کی کوشش کی جارہی تھی دوسری طرف اردو متواتر فارسی زدہ بنائی جارہی تھی۔ اس کے نتیجہ میں زبان مذہبی شناخت کی سیاست کے ساتھ وابستہ ہوتی گئی۔ تاہم گاندھی جی کا ہندوستانی کے مخلوط کردار میں یقین بنا رہا۔

ماخذ 10

قومی زبان کی کیا خصوصیات ہونی چاہیں؟
(What should the qualities of a national language be ?)

اپنی موت سے کچھ ماہ قبل مہاتما گاندھی نے زبان کے سوال پر اپنے نظریات دوہراتے ہوئے کہا تھا:

یہ ہندوستانی نہ تو سنسکرت زدہ ہندی ہونی چاہیے اور نہ ہی فارسی زدہ اردو لیکن دونوں کا ایک خوشگوار آمیزہ ہونا چاہیے۔ اسے جہاں کہیں بھی ضروری لگے مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی بے تکلفانہ داخل کرلینے چاہیے۔ اور غیر ملکی زبانوں سے بھی الفاظ جذب کرلینے چاہیں جو آسانی اور بہتر انداز میں ہماری قومی زبان کے ساتھ گھل مل سکیں اس طرح ہماری قومی زبان ایک غنی اور طاقتور آلے کی طرح یقیناً ترقی پذیر بن جائے گی جو انسانی خیالات اور جذبات کے مکمل دائرہ کا اظہار کرنے کی اہل ہوگی۔ خود کو ہندی یا اردو کے ساتھ محدود کرلینا فہم وفراست اور حب الوطنی کے جذبہ کے خلاف ایک جرم ہوگا۔

ہریجن سیوک، 12 اکتوبر 1947

5.1 ہندی کے لیے دلیل (A plea for Hindi)

دستور ساز اسمبلی کے ایک ابتدائی اجلاس میں متحدہ صوبہ جات کے ایک کانگریس ممبر آر۔ وی۔ دھولیکر نے ایک جارحانہ دلیل دی کہ ہندی کو بحیثیت دستوری تشکیل کی زبان کے طور پر استعمال کیا جائے۔ جب کسی نے کہا کہ اسمبلی میں ہر ایک یہ زبان نہیں جانتا تو دھولیکر نے برجستہ جوابی فقرہ کہا

''اس ایوان میں جولوگ ہندوستان کے لیے ایک دستور وضع کرنے کے لیے موجود ہیں اور ہندوستانی نہیں جانتے وہ اس اسمبلی کے ممبران بننے کے لائق نہیں ہیں ان کے لیے یہاں سے چلے جانا اچھا ہوگا''۔ جب اس تبصرہ سے افراتفری پھوٹ پڑی تو دھولیکر نے ہندی میں اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس موقع پر جواہر لعل نہرو کی دخل اندازی کے ذریعہ ایوان میں امن بحال ہو پایا، لیکن زبان کا مسئلہ مسلسل آنے والے تین سال تک اسمبلی کی کاروائی میں خلل ڈالتا رہا اور ممبران کو مشتعل کرتا رہا۔

تقریباً تین سال بعد 12 ستمبر 1947 کو ملک کی زبان پر دھولیکر کی تقریر نے ایک بار پھر ایک بڑا طوفان پیدا کر دیا۔ اب تک دستور ساز اسمبلی کی زبان سے متعلق کمیٹی (Language Committee) اپنی رپورٹ پیش کر چکی تھی اور جو لوگ قومی زبان کے طور پر ہندی کی وکالت کر رہے تھے اور جو اس کی مخالفت کرتے تھے ان کے درمیان تعطل ختم کرنے کے لیے تصفیہ کا ایک فارمولہ سوچ لیا تھا۔ اس نے طے کیا تھا لیکن ابھی تک رسمی طور پر اعلان نہیں کیا تھا کہ دیوناگری رسم الخط میں تحریر ہندی ہندوستان کی سرکاری زبان ہوگی لیکن ہندی کی طرف منتقلی بتدریج ہوگی۔ شروع کے پندرہ سالوں کے لیے، تمام سرکاری مقاصد (کام کاج) کے لیے انگریزی کا استعمال جاری رہے گا۔ ہر ایک صوبے کو صوبے کے اندر کے سرکاری کاموں کے لیے ایک علاقائی زبان کو منتخب کرنے کی اجازت ہوگی۔ دستور ساز اسمبلی کی زبان سے متعلق کمیٹی نے ہندی کو قومی زبان کے بجائے سرکاری زبان کے طور پر منسوب کرتے ہوئے امید کی کہ اس سے لوگوں کے جذبات کو مطمئن کیا جا سکے گا اور ایک حل تک پہنچنے میں مدد ملے گی جو تمام لوگوں کے لیے بہتر ہوگا۔

دھولیکر اکیلے نہیں تھے جن کو اس طرح کا قابل مفاہمت رویہ پسند نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندی کو ایک سرکاری زبان نہیں بلکہ قومی زبان کا اعلان کیا جائے۔ انھوں نے ان لوگوں پر حملہ کیا جو اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ ہندی زبان کو ملک پر زبردستی لادا جا رہا ہے اور دھولیکر نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا جو گاندھی جی کا نام لے کر ہندی کے بجائے ہندوستانی کو قومی زبان بنانا چاہتے تھے:

> جناب، کوئی بھی شخص مجھ سے زیادہ اس بات سے خوش نہیں ہو سکتا کہ ہندی ملک کی سرکاری زبان بن گئی ہے.... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہندی زبان کو ایک رعایت دی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں ''نہیں'' یہ ایک تاریخی عمل کی تکمیل ہے۔

دھولیکر جس لہجہ میں اپنے معاملے میں دلائل پیش کر رہے تھے اس سے بہت سے ممبران کو خاص طور پر پریشانی ہو رہی تھی۔ ان کی تقریر کے دوران کئی مرتبہ اسمبلی کے صدر نے دھولیکر کو ٹوکتے ہوئے ان سے کہا تھا ''میں نہیں سوچتا کہ آپ اس طرح بولتے ہوئے اپنے معاملے کو آگے بڑھا پائیں گے''، لیکن پھر بھی دھولیکر نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

5.2 مغلوب ہونے کا خوف

دھولیکر کی تقریر کے ایک دن بعد مدراس کی ممبر شریمتی جی۔ درگا بائی نے اس انداز میں ارتقا پذیر بحث ومباحثہ کے متعلق اپنی پریشانی کی وضاحت کی:

> جناب صدر، ہندوستان کے لیے قومی زبان کا سوال جو ابھی حال تک تقریباً اتفاق رائے تک پہنچ گیا تھا، اچانک انتہائی متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا ہے۔ خواہ یہ صحیح ہے یا غلط غیر ہندی زبان بولنے والے علاقوں کے لوگوں کو یہ احساس کرایا جارہا ہے کہ یہ جھگڑا یا یہ رویہ ہندی بولنے والے علاقوں کے نمائندے کے طور پر اس ملک کی مخلوط ثقافت پر ہندوستان کی دیگر طاقتور زبانوں کے قدرتی اثر کو موثر طور پر روکنے کے لیے لڑائی ہے۔

درگا بائی نے ایوان کو مطلع کیا کہ جنوب میں ہندی کے خلاف مخالفت کافی قوی ہے۔ مخالفوں کا یہ محسوس کرنا شاید صحیح ہے کہ ہندی کے لیے یہ پروپیگنڈہ علاقائی زبانوں کی جڑیں کاٹنے کے مترادف ہے...... تاہم دوسرے ممبران کے ساتھ انھوں نے بھی گاندھی جی کے اعلان کی تعمیل کی اور جنوبی ہندوستان میں ہندی کے لیے پروپیگنڈہ جاری رکھا، بہادرانہ مزاحمت کی، اسکول کھولے اور ہندی زبان میں کلاسوں کا انتظام کیا۔ ''اب ان سب کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا''۔ درگا بائی نے پوچھا ''صدی کے ابتدائی سالوں میں ہم نے جس اشتیاق و جوش کے ساتھ ہندی کو قبول کیا تھا، اس کے خلاف میں یہ احتجاج دیکھ کر سکتہ میں ہوں''۔ انھوں نے ہندوستانی کو لوگوں کی زبان کے طور پر قبول کرلیا تھا لیکن اب اس زبان کو بدلا جارہا تھا، اردو اور دیگر علاقائی زبان کے الفاظ کو اس سے باہر کیا جارہا تھا۔ انھیں احساس تھا بشمول ہندوستانی مخلوط کردار اور رفتہ رفتہ اسے مٹانے والے کسی بھی قدم سے مختلف زبان کے گروہ کے درمیان انتہائی بے چینی اور خوف کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

جوں جوں بحث ومباحث تند وتیز ہوتا گیا بہت سے ممبران نے ہم آہنگی کے جذبے کے لیے اپیل کی۔ بمبئی کے ایک ممبر شری شنکر راؤ دیو نے کہا کہ ایک کانگریس اور گاندھی جی کا پیرو ہونے کے ناطے وہ ہندوستانی کو قومی زبان کے طور پر قبول کر چکے ہیں لیکن انھوں نے خبردار کیا کہ ''اگر آپ (ہندی کے لیے) میرے دل سے حمایت چاہتے ہیں تو آپ کو اب کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے میرے اندر بدگمانی پیدا ہو اور جس سے میرے خوف کو تقویت ملے۔'' مدراس کے ٹی۔ اے۔ راما لنگم چیٹیار نے اس بات پر اصرار کیا کہ خواہ کچھ بھی کیا جائے احتیاط کے ساتھ کیا جائے، اگر جارحانہ انداز میں ہندی کے حق میں پیروی کی جائے گی تو اس سے ہندی کی مدد نہیں ہوگی۔ حتی

کہ اگر لوگوں کا خوف بلاجواز تھا لیکن اس کو رفع کرنا چاہیے ورنہ اس مرحلے پر یہ بات تلخ احساسات پیچھے چھوڑ جائے گی۔'' انھوں نے کہا'' جب ہم ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور ایک متحدہ ملک کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں تو ہم آہنگی ہونی ہی چاہیے اور لوگوں پر چیزیں زبردستی مسلط کرنے کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے....

ہندوستان کا دستور گہرے غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے عمل کے ذریعہ ظہور میں آیا تھا۔ اس کی بہت سی شقوں تک لین دین کے ایک عمل کے ذریعہ، دو مخالف حالتوں کے درمیان ایک درمیانی زمین تیار کر کے پہنچا گیا تھا۔

تاہم دستور کی ایک مرکزی خصوصیت پر اہمیت کی حامل باہمی رضامندی ہوگئی تھی۔ یہ رضامندی ہر ایک بالغ ہندوستانی کو حق رائے دہی دینے کے متعلق تھی۔ یہ یقین واعتماد کا ایک بے نظیر عمل تھا، دیگر جمہوریت میں حق رائے دہی آہستہ آہستہ اور مرحلہ وار عطا کیا گیا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یونائیٹڈ کنگڈم (انگلینڈ) جیسے ملکوں میں سب سے پہلے حق رائے دہی صرف صاحب ملکیت مردوں کو عطا کیا گیا تھا اس کے بعد تعلیم یافتہ مردوں کو بھی اس پر کشش دائرے میں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی۔ ایک طویل اور تلخ جدوجہد کے بعد مزدور طبقہ اور زراعتی پس منظر کے افراد کو بھی رائے دہی کا حق دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ایسا حق حاصل کرنے کے لیے خواتین کو ایک طویل جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

دستور ہند کی دوسری اہم خصوصیت سیکولرزم پر زور تھا۔ دستور کے دیباچہ میں سیکولرزم کا اظہار اس طرح درج نہیں کیا گیا تھا لیکن دستور کی عمل آوری کے لیے ہندوستانی تناظر میں اس کی کلیدی خصوصیات کی توضیح مثالی انداز میں کی گئی تھی۔ بنیادی حقوق کے مربوط سلسلے خاص طور پر، مذہبی آزادی (آرٹیکل 28-25) ثقافتی اور تعلیمی حقوق (آرٹیکل 30-29) اور مساوات کے حقوق'' (آرٹیکل 17، 16، 14) کا مسودہ ہوشیاری کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ ریاست کے ذریعہ تمام مذاہب کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کی ضمانت دی اور خیراتی اور فلاحی ادارے قائم رکھنے کا حق بھی دیا۔ ریاست نے خود بھی مذہبی فرقوں سے دوری بنائے رکھنے کی کوشش کی، ریاست کے ذریعہ چلائے جانے والے اسکول اور کالجوں میں لازمی مذہبی ہدایات (تعلیم) پر روک لگا دی اور نوکریوں میں مذہبی بھید بھاؤ کو غیر قانونی اعلان کیا۔ تاہم مذہبی فرقوں کے اندر سماجی اصلاح کے لیے ایک معین قانونی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ اس گنجائش کے استعمال سے ہی چھوت چھات پر پابندی لگی۔ ذاتی اور کنبہ کے قوانین میں تبدیلیاں متعارف کی گئیں۔ اگرچہ ہندوستانی سیاسی

سیکولرزم میں پھر مذہب سے ریاست کی مطلق علاحدگی نہیں رہ پائی لیکن ان دونوں کے درمیان ایک قسم کا منصفانہ فاصلہ بنا ہوا ہے۔

دستور ساز اسمبلی کے بحث ومباحثے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ دستور کی تشکیل سازی میں بہت سی متضاد آوازیں تصفیہ کی خاطر گفت وشنید کا حصہ بنی تھیں اور بہت سے مطالبات وضاحت سے کیے گئے تھے۔ یہ بحث ومباحثہ ہمیں ان نصب العین کے متعلق بتاتے ہیں جو طلب کیے گئے تھے اور ان بنیادی اصولوں کے متعلق بتاتے ہیں جس کو دستور کے بنانے والے بروئے کار لائے۔ لیکن ان بحث ومباحثوں کو پڑھتے وقت ہمیں باخبر رہنے کی ضرورت ہوگی کہ نصب العین کو ایک خاص تناظر کے اندر طلب کرنے پر موزوں نظر آنے کی مناسبت کے لحاظ سے اکثر دوبارہ وضع کیا گیا تھا۔ گاہے گاہے اسمبلی کے ممبران نے تین سالوں تک جاری بحث ومباحثہ کے دوران اپنے خیالات کو تبدیل کر دیا تھا۔ کچھ ممبران نے دوسروں کے دلائل سننے کے بعد اپنی حالت پر از سر نو غور کیا اپنے ذہنوں کو متضاد نظریات کے لیے کھول دیا، جب کہ دیگر کچھ ممبران نے اپنے اطراف کے واقعات کے ردعمل میں اپنے نظریات تبدیل کر دیے تھے۔

شکل 15.9

دستور کا مسودہ پیش کرتے وقت بھیم راؤ امبیڈکر اور راجندر پرساد ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے۔

ٹائم لائن

1945	
26جولائی	برطانیہ میں لیبر پارٹی اقتدار میں آئی
دسمبر جنوری	ہندوستان میں عام انتخابات
1946	
16 مئی	کابینہ کے مشن دستوری منصوبے کا اعلان
6جون	مسلم لیگ نے کابینہ مشن کے دستوری منصوبے کو تسلیم کیا
16اگست	مسلم لیگ کا ''ڈائرکٹ ایکشن ڈے'' کا اعلان
2 ستمبر	نہرو کو نائب صدر کے ساتھ کانگریس کی عبوری حکومت نے تشکیل کی
13اکتوبر	مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا
6-3دسمبر	برطانوی وزیر اعظم ایٹلی کی چند ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات: بات چیت ناکام
9دسمبر	دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی شروعات
1947	
29جنوری	مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کا مطالبہ
16جولائی	عبوری حکومت کی آخری میٹنگ
11اگست	جناح پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب
14اگست	پاکستان کی آزادی؛ کراچی میں جشن منایا گیا
15-14اگست	نصف شب میں ہندوستان کی آزادی کا جشن
دسمبر	دستور ہند پر دستخط کیے گئے

100 سے 150 لفظوں میں جواب دیجیے

1۔ اہداف قرارداد میں کیا نصب العین بیان کیے گئے تھے؟

2۔ مختلف گروہوں نے اصطلاح ''اقلیت'' کی توضیح کس طرح کی تھی؟

3۔ صوبوں کے لیے وسیع اختیارات کے حق میں کیا دلائل پیش کیے گئے تھے؟

4۔ گاندھی جی ایسا کیوں سوچتے تھے کہ ''ہندوستانی'' قومی زبان ہونی چاہیے؟

مندرجہ ذیل پر ایک مختصر مضمون (250 سے 300 الفاظ پر مشتمل) لکھیے

5۔ وہ کون سی تاریخی قوتیں تھیں جنھوں نے دستور کی بصارت تشکیل دی تھی؟

6۔ مظلوم محکوم گروہوں کے تحفظ کے حق میں دیے گئے مختلف دلائل پر بحث کیجیے۔

7۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے اس زمانے کے سیاسی حالات اور ایک مضبوط مرکزی ضرورت کے درمیان کس طرح کے رابطے بنانے کی بات کی؟

8۔ دستور ساز اسمبلی نے زبان کے تنازع کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی؟

نقشہ کا کام

9۔ موجودہ دنوں ہندوستان کا سیاسی نقشہ ہر صوبہ میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایک دفتری زبان کو نمایاں کرتا ہے۔ آپ موجودہ نقشہ کا 1950 کی دہائی کے ابتدائی سالوں کے نقشہ سے موازنہ کیجیے۔ آپ اس میں کیا دیکھتے ہیں؟ کیا یہ اختلاف صوبہ کی تنظیم اور زبان کے رشتہ کی طرف کچھ اشارہ کرتے ہیں؟

پروجیکٹ (کوئی ایک)

10۔ کوئی ایک بہت اہم دستوری تبدیلی کا انتخاب کیجیے جو حال کے سالوں میں واقع ہوئی ہے اور پتہ لگائیے کہ یہ تبدیلی کیوں کی گئی، تبدیلی کے لیے کیا دلائل پیش کیے گئے تھے اور تبدیلی کا تاریخی پس منظر کیا تھا۔ اگر ممکن ہو تو دستور ساز اسمبلی کا بحث و مباحثہ دیکھنے کی کوشش کیجیے (http://parliamentofindia.nic.in/is/debates/debates.htm) اور دیکھیے کہ اس وقت مسائل پر کس طرح بحث کی گئی تھی۔ اپنی تحقیقات کے متعلق لکھیے۔

11۔ امریکہ، فرانس یا ساؤتھ افریقہ کے دستور سے ہندوستانی دستور کا موازنہ کیجیے۔ ذیل کے کن ہی دو پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔ سیکولرزم، اقلیتی حقوق، مرکز اور صوبوں کے درمیان رشتے۔ مقامی تاریخ سے یہ مماثلت یا اختلاف کیسے جڑے ہیں۔ وضاحت کیجیے۔

مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

گرین ول آسٹین۔ 1972
دی انڈین کانسٹی ٹیوشن:
دی کارنر اسٹو ن آف اے نیشن
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی

راجیو بھارگو۔ 2000
ڈیمو کریٹک ویژن آف اے نیو ریپلک "
ٹرانسفور منگ انڈیا : سو شل اینڈ پولیٹکل ڈائنا مکس آف ڈیمو کریسی
مرتبہ، ایف۔ آر۔ فرنیکل وغیرہم
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی

سمت سرکار۔ 1983
انڈین ڈیمور کریسی: وی ہسٹو ریکل ان ہیر یٹنس،
دی سکسیز آف انڈیا ز ڈیمو کریسی
مرتبہ، اتل کوہلی
کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج

سمت سرکار، 1983
ماڈرن انڈیا 1947-1885
میک ملن، نئی دہلی

مزید معلومات کے لیے آپ مندرجہ ذیل ویب سائٹ پر رابطہ کر سکتے ہیں:

http://parliamentofindia.nic.in/is/debates/ debates.htm
(یہاں آپ دستور ساز اسمبلی کے بحث و مباحثہ کی ڈیجیٹل اشاعت دیکھ سکتے ہیں۔

تصاویر کے لیے اظہار تشکر

ادارے

القاضی فاؤنڈیشن فار دی آرٹس، نئی دہلی
(تصاویر 11.6، 11.8، 12.12، 12.13)

کلیکشن جوتیندر اینڈ جوتا جین، CIVIC آرکائیوز، نئی دہلی
(تصویر 13.15)

فوٹو ڈویژن، حکومت ہند، نئی دہلی
(تصاویر 14.3، 14.10، 15.3، 15.4، 15.5، 15.6، 15.9)

دی اوشنز آرکائیو اینڈ لائبریری کلیکشن، ممبئی
(تصاویر 11.9، 11.18، 13.17)

وکٹوریہ میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، کولکاتہ
(تصاویر 10.6، 10.7)

رسائل

بلڈر (تصویر 12.26)
پنچ (تصاویر 11.13، 11.14، 11.17)
دی السٹریٹڈ لندن نیوز (تصاویر 10.1، 10.10، 10.11، 10.12، 10.13، 10.14، 10.16، 10.17، 10.18، 10.19، 11.15، 11.16)

کتب

بیلی، سی اے، دی راج : انڈیا اینڈ دی برٹش 1600-1947
(تصاویر 10.4، 11.10، 11.11، 12.27)

ڈیلی رمپل، ولیم، دی لاسٹ مغل (تصویر 11.1)

ڈینیل تھومس اینڈ ولیم، ویو وز آف کولکاتہ
(تصاویر 12.7، 12.8، 12.9، 12.19)

ایونسن نورما، دی انڈین میٹرو پولس : اے ویو و ٹوورڈ دی ویسٹ
(تصاویر 12.14، 12.16، 12.20، 12.22، 12.23، 12.25، 12.29، 12.30)

میٹکاف، ٹی آر، این امپریل ویژن : انڈین آرکیٹکچر اینڈ برٹش راج (تصویر 12.28)

پبلی کیشنز ڈویژن، مہاتما گاندھی (باب 14 میں بہت سی تصاویر)

روہے، پیٹر، گاندھی (تصاویر 13.7، 13.11، 13.12)

سنگھ، خشونت، ٹرین ٹو پاکستان (تصاویر 15.1، 15.4، 15.12، 15.13، 15.15)